مجلۂ مکتبہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ام اے ال ال بی

مجلّہ مکتبہ

۱ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے جو ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

۲ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے۔ حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴ قیمت سالانہ للعہ مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کیلئے عہ فی پرچہ ۶

۵ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے صہ نصف کیلئے سے اور چوتھائی کے لئے عہ ہے۔ اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔

۶ ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط منتظم مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہئے۔

منتظم مجلہ

جلد (۱) — بابت ماہ تیر سنہ ۱۳۳۷ف م مے سنہ ۱۹۲۸ عیسوی — شمارہ (۲)

فہرست

شذرات

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہندوستان کی اُن چند درسگاہوں میں سے ایک ہے جو حقیقت میں قومی کہلا سکتی ہیں۔ مرحوم حکیم اجمل خاں کی خاموش مگر پرجوش علمی دلچسپی سے اب یہ ہمیشہ کیلئے محروم ہو چکی ہے ہماری اس قومی درسگاہ کی فراخی کا اندازہ ہم خود اپنی فراخدلی سے لگا سکتے ہیں لیکن اسکے باوجود جامعہ کے اساتذہ اور منتظمین کا ایثار ستایش کا مستحق ہے۔ حال ہی میں جامعہ کے ایک سرگرم کارکن ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی نے جامعہ کی سرپرستی میں اردو اکاڈمی کے نام سے ایک علمی مجلس کی بنیاد ڈالی ہے جسکی مساعی کی ترجمانی آئندہ سے "جامعہ" کرے گا یو پی کی ہندوستانی اکاڈمی کی طرح یہ محدود مقام نہیں ہر علم دوست اس کا رکن ہو سکتا ہے۔

کشمکش حیات میں عموماً وہی لوگ کارہائے نمایاں کر جاتے ہیں جنکے ذرایع قلیل ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ندوہ کی مجلس کی طرح یہ اکاڈمی بھی اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دے سکے گی۔

گذشتہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چالیسویں اجلاس کے موقع پر حیدرآباد دکن کے ایک خادم اردو حکیم سید شمس اللہ قادری (مصنف اردوے قدیم) کو بھی شرکت کا موقع ملا تھا دوسرے جلسہ میں ڈاکٹر سید شاہ سلیمان (جسٹس ہائیکورٹ الہ آباد) کے خطبۂ صدارت کے بعد انکی اردو زبان پر تقریر ہونے والی تھی جو علالت کی وجہ سے رک گئی۔ کانفرنس نے حکیم صاحب سے جنوبی ہند کی تاریخ مرتب کرنے کی خواہش کی ہے غالباً علمی دنیا میں یہ خبر نہایت دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی کہ حکیم صاحب نے قیام مدراس ہی کے دوران میں ملیبار کی اسلامی تاریخ "تحفۃ المجاہدین" کا کمیاب نسخہ فراہم کیا جسکی مدد سے وہ اس کتاب کا صحیح نسخہ مبسوط دیباچہ کے ساتھ مرتب کر رہے ہیں۔

وہاں اردو سوسائٹی نے حکیم صاحب سے ادبیات اردو کی ابتدائی تاریخ پر لکچر گورنمنٹ محمڈن کالج میں سنا۔ مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام بھی ملیبار کی اسلامی تاریخ و تاریخ دکن کے فارسی ماخذ پر دو لکچر ہوئے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ہمارا پڑوسی بھی ہماری تحریکات سے متاثر ہو رہا ہے۔

اس اشاعت میں PUNCTUATIONS. یعنی رموز املا یا اوقاف تحریر پر ایک مضمون "اشارات اعجام" کے عنوان سے درج ہے جو غالباً اردو میں اس موضوع پر پہلا مستقل مضمون ہے رموز املا کے مدون قواعد کی ضرورت ایک ترقی پذیر علمی زبان کیلئے ظاہر ہے کہ کس قدر ہے۔ عربی زبان میں اوقاف مقرر ہیں فارسی والوں نے اپنی تحریروں میں — خصوصاً ٹائپ کی تحریروں میں — انگریزی کے اصول بجنسہ مقرر کر لئے ہیں آقا حسین کاظم زادہ مدیر مجلہ "ایران شہر" نے اس پر ایک مبسوط مضمون بھی مجلہ ایران شہر "برلن" میں شائع کیا تھا جو زیر نظر مضمون کا محرک ہے۔ اس مضمون کی بعض غریب اصطلاحوں سے ہمیں اتفاق نہیں جسکی تفصیل ہم آئندہ پیش کرینگے اس موضوع کی اہمیت اور اسکے قواعد کی شدید ضرورت پر نظر کرتے ہوئے ہم توقع کرتے ہیں کہ تمام ارباب حل و عقد اردو زبان خصوصاً سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر محمد عبدالستار صدیقی، مولانا سید وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، پروفیسر ہارون خاں شروانی اور پروفیسر نعیم الرحمن اس طرف توجہ کرینگے تاکہ تبادلۂ خیالات کے بعد ہمارے آپس میں کوئی تصفیہ کن قرارداد ہو جائے اور آئندہ سے ہم انھیں معینہ اصول بہ اطمینان کے ساتھ کاربند ہو سکیں۔

شرح غالب

(از علامہ محمد جمال الدین نوری مرحوم پروفیسر عربی نظام کالج)

"غالب کے اردو کلام کی اب اتنی شرحیں لکھی گئیں کہ ان کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ علامہ نوری مرحوم کے علم و فضل کا پایہ محتاج تعارف نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ زبان سے بڑی دلچسپی تھی اپنے معلومات کے مقابلہ میں اہل زبان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اہل زبان ممدوح کی تحقیق پر سر دھنتے"

علامہ نوری نے کالج کے سلسلہ درس و تدریس میں دیوان غالب کی شرح لکھنی شروع کی۔ اس وقت مولانا نظم طباطبائی، شوکت میرٹھی، حسرت موہانی کی شرحیں متداول تھیں۔ علامہ نوری نے اپنی زندگی میں اس کو چھپوانے کی اجازت نہ دی بڑی سفارشوں پہ دو چار شعر بعض رسائل میں چھپے، ہمارے رفیق طریق اور ملک کے علم دوست مولوی عمر یافعی صاحب نے جیسا کہ رسالہ ترقی حیدر آباد جلد (۱) نمبر (۹) ۱۳۴۲ھ میں وعدہ کیا تھا اب اس کو چھپوانا شروع کر دیا ہے۔ جناب سید شمس الدین محمد صاحب علم خلف حضرت کیفی حیدر آبادی مرحوم کے اہتمام سے تقریباً شرح کا نصف حصہ چھپ چکا ہے۔ اگر حقیقی معنوں میں غالب کو غالبیت کے رنگ میں دیکھنا چاہیں تو لوگ اس شرح کو پڑھیں اور سمجھیں! (مکتبہ)

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

"زخم پر نمک چھڑکنا" جب کسی کے زخم پر نمک چھڑکتے ہیں تو زخم پھٹ جاتا ہے اور ٹیس دونی ہو جاتی ہے اس لئے زخم پر نمک چھڑکنا ایسے محل پر بولتے ہیں جب کوئی شخص دکھ میں دکھ اور ایذا میں ایذا دیتا ہو اور صدمے پر صدمہ پہنچاتا ہو مومن سے

غیر چھڑکے ہے زخم دل پہ نمک شور الفت میں بھی مزا نہ رہا

اس سے معلوم ہوا کہ زخم دل پر نمک چھڑکنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ عشق بڑھ گیا اور محبت زیادہ ہو گئی مقصود یہ ہے کہ درد دونا ہو گیا۔ صدمے پر صدمہ پہنچ گیا اور ٹیس پر ٹیس زیادہ ہو گئی (آپ) ناصح کی طرف اشارہ کیا ہے عام روزمرے میں اس لفظ کا استعمال تعظیم کے لئے ہوتا ہے مگر یہاں تعظیم کیلئے نہیں ہوا مصنف نے استعارہ تملیحی سے کام لیا ہے تعظیم کا لفظ تحقیر کے لئے استعمال کیا ہے اور تشنیع ناصح

کے لئے ایک عمدہ صورت نکالی اور اب دوسری دلیل اس امر پر قائم ہوتی ہے کہ شعر میں درد کی فراوانی تباہی پھر نہ عشق و محبت کی طغیانی اس لئے کہ تشنیع اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب مقصود یہ ہو کہ نصیحت سے تکلیف اور بڑھ گئی اور اگر یہ مقصود ہو کہ نصیحت سے عشق اور زیادہ ہو گیا تو کسی صورت سے تشنیع صحیح نہیں ہو سکتی کہ ترقی عشق کے لئے جو شخص وسیلہ ہو گیا ہو عاشقان صادق کے پاس لائق تحسین ہے نہ قابل نفرین۔ المعنی خنجر عشق کا وار جب کسی پر چلتا ہے تو گھر اگھاؤ دل میں پڑتا ہے اور عقل کا تسمہ نہیں لگا رہتا کان بہرے ہو جاتے ہیں اور دوست کی کوئی برائی نہیں سنتے آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور یار میں کوئی خرابی نہیں دیکھتیں، کہ حبک الشیء یعمی و یصم، اس لئے ناصحوں کی نصیحت زہر لگ کر جان کے لئے روگ ہو جاتی ہے اور دل کے لئے بجوگ، خود زخم کی ٹیس وہ جاں گزا مصیبت ہے کہ الاماں جب ایسے زخم پر نمک پاشی ہوتی ہے تو درد دونا ہو جاتا ہے اور نئی آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ناصح نے نصیحت کا شور مچایا تو شور نصیحت نے وہی تاثیر دکھائی جو زخم پر نمک چھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے نصیحت کیا تھی گویا ایک طرح کا نمک تھا جو ناصح نے زخم پر چھڑکا اس لئے زخم دل اور پھٹ گیا، بھرنے کے بدلے ہرا ہو گیا، ٹیسیں اور بڑھ گئیں نئی آفت کا سامنا ہو گیا اور مصیبت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی، پند ناصح نے ہم کو تو یہ نقصان پہنچایا اب اگر خود ناصح کو اس نقصان سے کچھ فائدہ پہنچتا تو بھی ایک بات تھی مگر اسے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا اس لئے آپ سے یعنے حضرت ناصح سے کوئی پوچھے کہ تم نے اپنی نصیحت سے ہم کو ایذا دیکر کیا مزہ پایا اور کونسا فائدہ اٹھایا، جب دردمند عشق کو نصیحت سے نقصان پہنچتا ہے اور ناصح کے لئے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو پھر ترک عشق کی امید بے حاصل ہے اور حضرت ناصح کی تمام بکواس لاطائل۔ یہ ہیں معنی اس شعر کے اور وثوق صراحت کے ضمیمہ میں لکھا ہے " اس شعر کا حاصل یہ ہے کہ ناصحوں کی نصیحت سے ہمارا عشق کم ہونے کے عوض زیادہ ہو جاتا ہے۔ مرزا نے اس مضمون کو تمثیل میں بیان کیا ہے عاشقوں کی عادت ہے کہ نصیحت سننے سے نفرت ظاہر کرتے ہیں"

فاضل طباطبائی لکھتے ہیں " مصنف نے مزہ کو قافیہ کیا اور ہائے مختفی کو الف سے بدلا اردو کہنے والے اس طرح کے قافیے کو جائز سمجھتے ہیں وجہ یہ ہے کہ قافیے میں حروف ملفوظہ کا اعتبار ہے جب یہ (ہ) ملفوظ نہیں بلکہ (ز) کے اشباع سے الف پیدا ہوتا ہے تو پھر کون مانع ہے اسے حرف روی قرار دینے سے۔ اسی طرح سے توڑا اور دشمن قافیہ ہو جاتا ہے گو رسم خط اس کے خلاف ہے لیکن فارسی والے مزہ اور دوا کا قافیہ نہیں کرتے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ ہائے مختفی کو کبھی حرف روی ہونے کے قابل نہیں جانتے۔"

فاضل طباطبائی نے یہ تو ٹھکانے کی بات کہی ہے کہ فارسی والے مزہ اور روا کا قافیہ نہیں کرتے مگر جو وجہ اسکی
بتائی ہے وہ سائل کے لئے شافی اور جواب کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، قافیہ نکرنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ اصل
وضع کے لحاظ سے ہائے مختفی کوئی مستقل حرف نہیں ہے اظہار حرکت کے لئے لائی گئی ہے اور واو عمرو کی طرح
برائے نام بڑھائی گئی ہے واو عمرو سے عمرو اور عُمر میں صرف امتیاز پیدا ہوتا ہے اور اصل لفظ میں کوئی
کمی بیشی نہیں ہوتی اس لئے نہ اس کا اثر قافیے پر کچھ پڑتا نہ یہ واو حرفِ ردی ہو سکتا۔ عربی میں اس واو
کا جو حال نظر آتا ہے فارسی میں ہائے مختفی کا بھی وہی نقشہ ہو گیا ہے اس اعتبار سے مَزَہ اصل میں مَزَ
بے ہای مختفی تھا کتابت میں زای معجمہ کے بعد ہای مختفی بڑھائی گئی اور صرف اس خیال کا نقشہ جمانے کے لئے
بڑھائی گئی کہ زای معجمہ یہاں متحرک ہے ساکن نہیں اسی طرح نامہ و خامہ کہ اصل میں نامَ و خامَ بے ہای مختفی تھے
اظہار حرکت کے لئے میم کے بعد ہای مختفی کتابت میں بڑھائی گئی نامَ نامہ ہو گیا اور خامَ خامہ اور یہی وجہ ہے کہ
نامہ اور خامہ کی جمع ہوتی ہے تو ہای مختفی کتابت سے نکال دی جاتی ہے نامہ کی جمع لکھتے ہیں تو نامہا لکھتے ہیں ایسے
اور خامہ کی جمع لکھتے ہیں تو خامہا کہ ہای جمع نے ہای مختفی سے بے نیاز کر دیا ہے اور علامت تحرک کی احتیاج
نہیں رہی ورنہ جن لفظوں میں ہائے اصلی ہوتی ہے مجال نہیں کہ ہائے جمع اس پر کوئی اثر ڈالے
اور کتابت سے نکالے جیسے کوہہا اور راہہا اس بیان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جن ماضیوں میں ہای مختفی
بڑھائی جاتی ہے وہ اسی ضرورت کے لئے بڑھائی جاتی ہے کہ اُس حرف کے متحرک ہونے پر دال ہو جیسے
ہائے مذکور سے پہلے جگہ مل گئی ہے اور جب کوئی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ بے ہائے مختفی تحرک ماقبل
کا حال کھل جاتا ہے تو پھر ہائے مذکور کا نشان بھی نہیں رہتا اور یہی وجہ ہے کہ بنیاد ست و برباد ست کے
قافیے میں دادہ ست و کشادہ ست بھی چلے آتے ہیں اور ردی میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔ حافظ ؎

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد ست ٭ بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد ست ٭ رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بگشا ٭ کہ بر من و تو در اختیار نگشادہ ست

دلا منال ز بیداد و جور یار کہ یار ٭ ترا نصیب ہمیں کردہ است و این دادہ ست

اب رہے عربی لفظ جیسے قصہ و غصہ وغیرہ جنمیں تای فوقانی موقوف ہو کر ہای مختفی ہو گئی ہے اور اظہار
حرکت کے لئے نہیں بڑھائی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ تای فوقانی کو قصہ کے بعد اسی ہائے مختفی سے صورت میں بہت مشابہت
پیدا ہو گئی ہے جو فارسی میں اظہار حرکت کے لئے زیادہ کی گئی ہے اس لئے اس تای موقوف کے ساتھ بھی وہی
سلوک کیا گیا جو فارسی کی ہای مختفی کے ساتھ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قلعگی اور بے حوصلگی اور ایسے اور بیسیوں
لفظ فارسی زبان میں بے تکان چلے آتے ہیں اور کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی اس سے معلوم ہو گیا کہ ہائے
مختفی تحرک ماقبل کی علامت ہے اور در اصل کوئی حرف نہیں اور جو شئی حرف ہی نہ ہو وہ حرف ردی کس طرح

ہوسکتی ہے اس لئے فارسی والوں کے پاس ہای مختفی میں حرف روی ہونے کی قابلیت ہی نہیں ہے نہ دوا کا
قافیہ مزہ ہوسکتا نہ مزہ کا قافیہ دوا۔ اب یہاں کئی شکوک لائق حل ہیں اور مناسب حل۔

(شبہ اول) فارسی زبان کے متقن صاف صاف لکھتے ہیں کہ جب جمع کے الف نون آتے ہیں یا کاف
تصغیر یا یای معروف لگاتے ہیں تو جس اسم کے آخر میں ہای مختفی ہوتی ہے کاف فارسی سے بدل جاتی ہے
جیسے بندگان وخواجگان رنجگک و بچگک اور فرزانگی و دیوانگی اگر واو عمرو کی طرح ہای مختفی بھی برائے
نام ہوتی تو یہ تبدیلیاں ناممکن ہوگئی ہوتیں کیسی طرح کی تبدیلی انہی حروف میں ہوسکتی ہے جن کے لئے کچھ
نہ کچھ لفظی وجود ہو اور جن حروف کے لئے لفظی وجود میں کوئی حصہ نہیں ملتا جیسے واو عمرو اور الف فعلوا وغیرہ
ان میں نہ کوئی تغیر ہوتا ہے نہ کسی قسم کی تبدیلی ہوتی ہے اور یہاں کئی صورتوں میں کئی تبدیلیاں ہوگئی ہیں
اس لئے ہائے مختفی کے لئے لفظی وجود یقینی ہے اور اس کا قیاس واو عمرو پر صحیح نہیں یہ شبہ اس طرح سے
مٹ سکتا ہے کہ بندگان وخواجگان کے ظاہر حال پر نظر پڑتی ہے تو یہ شبہ اسی کا خیال بندھتا ہے کہ ہائے
مختفی کاف فارسی سے بدل گئی مگر حقیقت حال ایسی نہیں ہے گاف الف اور نون کا مجموعہ بھی فارسی
میں جمع کے لئے مستعمل ہوتا ہے جیسے نیاگان و دخترگان کہ نیا اور دختر کی جمع ہے اور ان لفظوں میں یہ
شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہائے مختفی کاف فارسی سے بدل گئی۔ برہان قاطع کی عبارت مختصراً یہ ہے۔

"گان بروزن جان افادۂ معنی جمع میکند وقتی کہ در آخر کلمہ درآید کہ آخر آں کلمہ ہا باشد ہمچو
ایستادگان و کشتگان و خوابیدگان"

اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوگئیں۔ ایک یہ کہ جس طرح الف نون جمع کے لئے آتے ہیں جیسے دختران
و مردمان اسی طرح گاف الف اور نون بھی جمع کے لئے مستعمل ہوتے ہیں مگر دونوں کے استعمال میں فرق
یہ ہے کہ گاف الف نون کا استعمال اکثر ان لفظوں کی جمع کے لئے ہوتا ہے جن کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی
ہے اور الف نون کا استعمال ان لفظوں کے لئے ہوتا ہے جن میں ہای مختفی نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ گاف الف نون سے بھی ہای مختفی پر وہی اثر پڑتا ہے جو ہای جمع سے پڑ سکتا
ہے جس طرح ہائے جمع آتی ہے تو ہائے مختفی اڑ جاتی ہے جیسے نامہا اور رجاہا اسی طرح گاف الف نون
آتے ہیں تو بھی ہای مختفی کا ٹھکانا نہیں رہتا جیسے بندگان وخوابگان۔ اگرچہ ظاہر حال یہی بتاتا ہے کہ
الف نون سے ان الفاظ کی جمع کی گئی ہے اور ہای مختفی کاف فارسی سے بدل گئی مگر بیان سابق سے یہ بات
خوب دل نشین ہوگئی ہے کہ ظاہر حال کچھ اور ہے اور حقیقت حال کچھ اور اس لئے صرفیوں کا یہ قول کہ
ہای مختفی یہاں کاف فارسی سے بدل گئی حقیقت حال سے ناآشنائی ہے یا تسامح کی لپیٹ میں آگئے تھا۔

گک اور گی کا بھی یہی حال ہے فارسی والے تصغیر کے لئے گک اور یای معروف کے بدلے گی بھی استعمال کرتے ہیں۔ خراسان والوں کی زبان ہے برادر گک شما کجاست ای برادر کوچک شما صاحب برہان لکھتا ہے۔

"گی بکسر اول لفظی است کہ معنی حاصل مصدر دہد و معنی بودن باشد وقتی کہ در آخر کلمہ در آید ہمچو خوانندگی و تجنندگی" اس سے معلوم ہو گیا کہ گک اور گی بھی یای معروف اور کاف تازی کی طرح مستقل حروف معنوی ہیں لیکن گک اور گی کا استعمال اکثر ایسی اسما کے ساتھ ہوتا ہے جنکے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے اسلئے عموماً یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اسماء مذکور میں ہای مختفی کاف فارسی سے بدل گئی ہے مگر یہ خیال نہایت بے سرو پا ہے ہائے مختفی صرف اتنا پتا بتاتی ہے کہ ماقبل ہا متحرک ہے ساکن نہیں (چہ) اور (کہ) اور (سہ) اور (نہ) کا بھی یہی حال ہے (چہ) کی اصل چ متحرک ہے (کہ) کی اصل کاف متحرک ہے (سہ) کی اصل سین متحرک ہے (نہ) کی اصل نون متحرک ہے اور ہای مختفی صرف اظہار حرکت کے لئے بڑھا دی گئی اس سے معلوم ہو گیا کہ فارسی لفظوں کی وضع ایک حرف پر بھی کی گئی ہے جیسے کہ اور بہ وغیرہ اس لئے بعضے قانون دانوں کا یہ قول کہ فارسی کا کوئی لفظ اصل وضع کے لحاظ سے دو حرفوں سے کم نہیں ہوتا ایک ہوائی بات ہے اور ظاہر کتابت کو دیکھ کر دھوکہ کھانے کی کرامات غرض ہائے مختفی تحرک ماقبل کے سوا کسی اور شئے کا نشان نہیں بتا سکتی اور اظہار حرکت کے لئے کوئی اور صورت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر ہائے مذکور غیبتی کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے کہیں نظر نہیں آتی جیسے چیست اور کیست وغیرہ اور یہی وجہ ہے کہ مزہ سے مشابہت رکھنے والے لفظوں میں جب ماقبل ہا کی حرکت فتحہ میں اشباع ہو کر الف پیدا ہو جاتا ہے تو پتا بھی نہیں ملتا کہ ہائے مختفی کہاں گئی اور کدھر گئی اس سے معلوم ہو گیا کہ مصنف نے ہای مختفی کو الف سے نہیں بدلا اشباع سے الف پیدا ہو گیا ہے اور الف کے چکر میں ہائے مختفی رفو چکر ہو گئی اس لئے فاضل طباطبائی کا یہ قول کہ "ہای مختفی کو الف سے بدلا تسامح سے خالی نہیں ہو سکتا"

(شبہہ دوم) ہای مختفی سے پہلے جو حرف متحرک ہوتا ہے اسکی حرکت کا اشباع اردو میں بھی جائز ہے اور فارسی میں بھی ناجائز نہیں خاقانی ع عیدست و پیش از صبحدم مژدہ بکار آمدہ۔ بدیہی بات ہے کہ جب فتحہ کا اشباع ہوتا ہے تو الف پیدا ہوتا ہے اور ہائے مختفی ساقط ہو جاتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اردو والے فتح کے اشباع سے فائدہ اٹھا کر مزا کا قافیہ مزہ کرتے ہیں اور فارسی والے ایسا قافیہ جائز نہیں سمجھتے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ اردو کے اشباع میں اور فارسی کے اشباع میں بہت بڑا بل ہے اردو والوں کا لہجہ یہ ہے کہ مزہ میں مثلاً زای معجمہ کا فتحہ اور مژدہ میں دال مہملہ کا فتحہ قائم

رکھتے ہیں اور فتح کے اشباع سے الف پیدا کرتے ہیں اس لئے مزہ کا قافیہ دوا اور دوا کا قافیہ مزہ اردو زبان میں جائز ہے مگر فارسی والوں کا لہجہ ایسا نہیں ہے وہ ہائے مختفی والے الفاظ زبان پر لاتے ہیں تو مزہ اور مژدہ میں مثلاً اگر کسرۂ اضافی یا توصیفی ہو تو زای معجمہ اور دال مہملہ کا فتحہ قائم نہیں رکھتے فتح کو کسرہ کی جانب جھکاتے ہیں اور اس طرح ان الفاظ کو ادا کرتے ہیں کہ یای مجہول پیدا ہو جاتی ہے مزہ کا لہجہ مثلاً فارسی والوں کے پاس مزے ہے اور مژدہ کا مژدے اب اگر اشباع ہو تو پوری یائے مجہول پیدا ہو جاتی ہے نہیں تو آدھی تو کہیں نہیں گئی آدھی یائے مجہول ہو یا پوری دونوں صورتوں میں امالے کی صورت ضرور نظر آتی ہے اور فتح کا لگاؤ ذرا بھی نہیں رہتا اسلئے فارسی زبان میں نہ اشباع سے الف کی صورت بن سکتی نہ دوا کا قافیہ مزہ جائز ہو سکتا۔

(شبہ سوم) صرفیان فارسی کا بیان ہے کہ ہای مختفی کسی لفظ کے آخر میں آتی ہے تو مختلف صورتوں میں مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں کہیں معنی نسبت پیدا ہوتے ہیں جیسے سبزہ اور سفیدہ اور کہیں معنے مشابہت جیسے آفتابہ و چرخہ کہیں معنے فاعلیت پیدا ہوتے ہیں جیسے نژادہ و نبرزہ اور کہیں معنے مفعولیت جیسے گفتہ و سفتہ غرض اسی طرح اور کئی معنے پیدا ہوتے ہیں جن کی تفصیلی اطلاع کتب صرف سے مل سکتی ہے اب اگر ہائے مختفی لفظ میں کوئی شئی نہیں ہے تو یہ معنی کسی طرح نہیں پیدا ہو سکتے اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ تمام معنی دراصل حرکت ماقبل سے پیدا ہوتے ہیں اور ہای مختفی کا وجود صرف اظہار حرکت کیلئے ہے مگر ہای مذکور کتابت کے لحاظ سے ہمسایہ ماقبل ہو کر پہلو میں بیٹھ جاتی ہے اس لئے صرفیوں نے اصل حرکت کا فائدہ علامت تحرک یعنے ہای مختفی کی طرف منسوب کیا اور یہ کہہ دیا کہ ہای مختفی فلاں فلاں فائدے کے لئے آتی ہے اگر حقیقت حال پر نظر ڈالی جائے تو یہ فائدے حرکت ماقبل نے پیدا کئے ہیں۔ ہای مختفی سے اظہار حرکت کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہوا لیکن حرکت ماقبل سے کبھی نئے معنی پیدا ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے متحرک ہونے سے پہلے جو معنی تھے متحرک ہونے کے بعد بھی وہی قائم رہتے ہیں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا جیسے میخوارہ و آشکارہ کہ رای مہملہ کے تحرک نے کوئی نئے معنی نہیں پیدا کئے اس لئے صرفیان فارسی تسامح سے کام لے کر یہ کہتے ہیں کہ ہای مختفی کہیں تحسین کلام یا اظہار حرکت کے لئے آتی ہے اور کہیں معنی نسبت وغیرہ کے لئے بڑھائی جاتی ہے یہ ہے اس مسئلہ کی تحقیق اور اس تحقیق میں اگرچہ جمہور کی مخالفت ہو گئی ہے لیکن حق حق ہے اسی کا راستہ طریق مستوی ہے اور اسی کا اثر قابل پیروی۔

نواب نظام علیخاں بہادر
کے
تعلقات انگریزوں کے ساتھ

(از جناب میر محمود علی صاحب۔ ام، اے لکچرار سٹی کالج)

حیدرآباد اور انگریزوں کے درمیان تعلقات کی ابتدا، نواب صلابت جنگ کے زمانے سے ہوتی ہے ۱۷۵۶ء میں انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے انگریزی فوجیں شمالی سرکار سے فرانسیسیوں کو بیدخل کر دیتی ہیں اس لئے موخر الذکر کی تائید میں صلابت جنگ اول تو مقابلہ کے لئے نکلتے ہیں لیکن مصلحت سمجھکر کرنل فورڈ کی عرضداشت مورخہ ۱۴ر مے ۱۷۵۶ء کو منظور کر لیتے ہیں جس کے مطابق بطور جاگیر مچھلی پٹم اور دیگر اضلاع انگریزوں کو دئے جاتے ہیں[1]

آصف جاہ ثانی کی تخت نشینی کے چار سال بعد تک انگریزوں اور سلطنت آصفیہ کے درمیان غالباً نہ تو کوئی دوستانہ تعلقات کا سلسلہ رہا اور نہ مخالفانہ البتہ ۱۷۶۵ء میں انگریزوں نے بنگال بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے لئے شہنشاہ دہلی سے فرمان حاصل کیا تو اسی فرمان میں انہوں نے بالاہی بالا شاہ عالم ثانی سے شمالی سرکاروں کے متعلق بھی اجازت حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا جب اس کی اطلاع حیدرآباد پہونچی تو آصف جاہ ثانی کو بہت غصہ آیا اور فوج کشی کی تیاریاں کی گئیں کہ انگریزوں کو جبراً اس علاقہ سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن پلاسی کے فاتح ابھی ہر میدان میں کودپڑنے کے لئے تیار نہیں تھے انہوں نے دیکر سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج اور بوقت ضرورت خراجگذاری کی حیثیت سے کچھ امدادی فوج دینے کا عہد کر لیا اور ان شرائط پر نواب نظام الملک نے وہ سرکاریں انہیں کے قبضہ میں رہنے دیں۔[2]

مندرجۂ بالا عہدنامہ ۱۲ر نومبر ۱۷۶۶ء کو نواب آصف جاہ ثانی اور کمپنی کے درمیان ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی دفعات میں باہمی امداد دوستی و اتحاد کے عہد و پیمان کے علاوہ الور۔ سکاکول۔ راجمندری

---

[1] Aitchison's Collection Of Treaties Etc صفحہ ۲۲۵

[2] تاریخ ہند مولفہ ہاشمی صاحب جلد چہارم۔ صفحہ ۱۷۔

مصطفے نگر اور مرتضیٰ نگر کی سرکارین اس شرط پر بطور جاگیر دینے کا ذکر ہے کہ "کمپنی امدادی فوج یا اس کے معاوضہ میں (۷) لاکھ روپیہ سالانہ ادا کریگی"۔

اس عہدنامہ کی دفعہ چار میں مرتضےٰ نگر (گنٹور) کے متعلق صاف طور پر الفاظ موجود ہیں کہ یہ سرکار نظام کے بھائی بسالت جنگ کی جاگیر ہے۔ کمپنی اس امر کا وعدہ کرتی ہے کہ بسالت جنگ کے حین حیات یا بغیر آصف جاہ ثانی کی خوشنودی کے وہ اس پر قبضہ نہیں کریگی" (عہدنامہ ۱۷۶۶ء دفعہ ۴)۔ بایں ہمہ انگریزوں نے یہ روپیہ کئی سال تک ادا نہیں کیا اور مختلف عذرات کی بناء پر لیت و لعل کرتے رہے نیز نواب نظام الملک کی ٹیپو سے جنگ چھڑی تو اس میں حسب معاہدہ امدادی فوج بھی نہ بھیجی"۔[1]

۱۷۶۸ء میں انگریزوں اور سرکار نظام کے مابین دوامی دوستی اور اتحاد کے نام سے دوسرا عہدنامہ ہوا جس میں نواب کرناٹک بھی شریک تھے۔ اس عہدنامے کی رو سے نواب آصف جاہ ثانی نے وہ تمام اسناد جو سابق صوبیداران دکن نے حیدر علی کو عطا کئے تھے منسوخ قرار دئیے اور سات لاکھ روپیہ خراج کے عوض کرناٹک بالاگھاٹ کی دیوانی کمپنی کو عطا کی اور شمالی سرکار کی مقررہ رقم میں تخفیف کی۔ فوج امداد باہمی کی ترمیم اس طرح پر ہوئی کہ وقت ضرورت کمپنی دو بطالین (Battalion) فوجوں اور توپوں سے مدد کریگی بشرطیکہ سرکار نظام اس فوج کے اخراجات ادا کرے اور کسی ایسے شخص کے خلاف اس فوج سے کام نہ لے جو انگریزوں کا حلیف ہو۔[2]

اس عہدنامہ فورٹ سنٹ جارج کی دفعہ (۷) کا خلاصہ یہ ہے کہ "شہنشاہ شاہ عالم ثانی نے کرناٹک پائیں گھاٹ پر نواب والاجاہ اور ان کی اولاد کی دواماً حکومت کے لئے فرمان نافذ کیا ہے۔ اور خود سرکار نظام نے بھی نواب والاجاہ اور ان کی اولاد کو دکن کی ماتحتی سے سبکدوش کیا ہے۔ لہذا نواب آصف جاہ کو آئندہ اس علاقہ میں مداخلت کا کوئی حق نہو گا"۔ (عہدنامہ سنٹ جارج دفعہ ۷)[3]

اس عہدنامہ کے بعد ۲۲ مارچ ۱۷۶۸ء کو آصف جاہ ثانی سے شہنشاہ دہلی کے فرمان کا حوالہ دیکر

---

[1] تاریخ ہند جلد چہارم مولفہ ہاشمی صاحب صفحہ (۱۷)

[2] Aitchison Vol II. صفحہ ۱۳۳

[3] عہدنامہ نمبر ۳۷ جلد پنجم۔

تمام دیسکھوں، مقدموں اور باشندوں کے نام اطلاعنامے بھیجے تھے کہ "پانچوں شمالی سرکاروں پر کمپنی کا دوامی قبضہ اور ملکیت اور ممالک کرناٹک اور بالاگھاٹ وپائیں گھاٹ کی دو انا دیوانی کا حق کمپنی کے تفویض کیا جاتا ہے۔ لہذا انھیں کمپنی کی اطاعت گزار رعایا بنکر رہنا چاہئے"[1]

اس طور پر معاملات چل رہے تھے کہ ۱۷۷۹ء میں آصف جاہ ثانی کے بھائی بسالت جنگ نے حیدر علی کے حملے سے خائف ہوکر گنٹور کو پٹہ پر انگریزوں کے حوالہ کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی اور انگریزوں نے حیدر علی کے حملہ سے ان کو بچانے کا وعدہ کیا تھا[2]

حکومت مدراس نے بغیر آصف جاہ ثانی کی منظوری کے بسالت جنگ سے اس قسم کا عہدنامہ کرکے مسٹر جان ہالینڈ کو سفیر بنا کر حیدرآباد روانہ کیا تھا تاکہ آصف جاہ ثانی کو سمجھائے کہ یہ عہدنامہ فرانسیسیوں کے خطرے کی احتیاط کے لئے کیا گیا ہے اس لئے سابقہ عہدنامہ کے خلاف نہ سمجھا جائے لیکن مسٹر ہالینڈ کی سفارت ناکامیاب ثابت ہوئی اور آصف جاہ ثانی کے قہر وغضب کا باعث ہوئی جس کی وجہ سے انگریزوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا[3]

فی نفسہ اس قسم کا عہدنامہ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی سراسر عہدشکنی تھی جس کو تسلیم کرنے سے آصف جاہ ثانی نے قطعاً انکار کیا۔ اس لئے مجبوراً کلکتہ کی حکومت اعلیٰ نے اوس معاہدہ کو منسوخ قرار دیا اور ضلع گنٹور جو اس دوران میں نواب کرناٹک کو دس سال کے لئے پٹہ پر دیا گیا تھا سرکار نظام کے عہدہ داروں کو واپس کردیا گیا[4]

اس واقعہ کے تین سال بعد ۱۷۸۲ء میں بسالت جنگ کا انتقال ہوگیا لیکن آصف جاہ ثانی نے مزید پانچ سال تک گنٹور کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے انکار کردیا۔ وجہ یہ تھی کہ سابقہ عہدناموں کے مطابق جو خراج کی رقم آتی تھی اس کی بقایا انگریزوں کے ذمہ بہت زیادہ رہ گئی تھی اس سے قبل ہی مدراس کے گورنر لارڈ میکارٹنی (Macartney) نے آصف جاہ ثانی کی خدمت میں ایک تفصیلی خط دوستی اور اتحاد اور آصف جاہ ثانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا مضمون کا بھیجا تھا کہ "آیندہ سے آپ کی پیشکشی کی رقم پابندئ وقت کے ساتھ بھیجی جائیگی"[5]

---

[1] جلد پنجم صفحہ ۱۵۹ Aitchison. Vol V

[2] فٹ نوٹ صفحہ ۸۸ Historical Sketch.

[3] جلد اول صفحہ ۸۹ Hollingbery

[4] جلد اول صفحہ ۸۹ Historical Sketch.

[5] جلد اول صفحہ ۸۹ ایضاً

مگر جب حسب حال شمالی سرکاروں کی پیشکش کے متعلق کمپنی اور سرکار نظام کے تعلقات کھنچے رہے تو لارڈ کارنوالس نے بالآخر ۱۷۸۸ء میں کپتان جان کنوے (Kennaway) کو رزیڈنٹ بناکر حیدرآباد بھیجا تاکہ کمپنی کے ذمہ جو خراج کی رقم بقایا ہے اس کا تصفیہ ہوجائے اور کمپنی کو ضلع گنٹور ملجائے ضلع گنٹور کے مطالبہ کی تکمیل تو ہوگئی کیونکہ اس مطالبہ کے ساتھ گورنر جنرل نے فوجی تیاریاں کی تھیں۔ لیکن خراج کی بقایا رقم کا تصفیہ حیدرآباد میں نہوسکا اس لئے فریقین کی رضامندی سے[1] اس معاملہ کا تصفیہ گورنر جنرل کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ اور آصفجاہ ثانی کی طرف سے بطور نمائندہ میر ابوالقاسم (میر عالم) کو کلکتہ بھیجا گیا۔

گنٹور کی واپسی اور پیشکش کی ادائی کے جھگڑے بسالت جنگ کی وفات ۱۷۸۲ء سے چلے آرہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرکار نظام اور کمپنی کے تعلقات میں ایک قسم کی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس معاملہ میں مسٹر گرانٹ رزیڈنٹ حیدرآباد کو ۱۷۸۴ء میں اس لئے مستعفی ہونا پڑا کہ انہوں نے دربار دکن پر بیجا دباؤ ڈالنے سے انکار کیا تھا اور اس کی جگہ مسٹر جانسن کو رزیڈنٹ بناکر حیدرآباد بھیجا گیا تاکہ وہ دربار دکن پر دباؤ ڈالکر جلد ان معاملات کا تصفیہ کرالیں۔ آصف جاہ ثانی نے دوران گفت وشنید میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ "مناسب معاوضہ اور بطور تحفہ ایک کروڑ روپیہ لیکر شمالی سرکار اور کرناٹک کے علاقے ان کو واپس کردئے جائیں"۔ مسٹر جانسن نے بھی اس تحریک کی پرزور تائید کی تھی مگر جب گورنر جنرل کی کونسل نے مجلس نظما سے اس کی نسبت استفسار کیا تو انہوں نے مسٹر جانسن کو نشانۂ ملامت بنایا اور ۱۷۸۵ء میں مسٹر جانسن کو بھی اس جرم کی پاداش میں خدمت سے علحدہ کردیا گیا۔

بالآخر بہ حیثیتِ سفیر جب میر عالم کلکتہ پہونچے تو تصفیہ یہ ہوا کہ سرکار نظام کی پیشکش کی رقم سرسٹھ لاکھ انچاس ہزار تین سو تینتیس روپے کمپنی کے ذمہ واجب الادا قرار پائی اور کمپنی نے سرکار نظام سے گنٹور کی سابقہ مالگزاری کا مطالبہ بسالت جنگ کی وفات ۲۵ ستمبر ۱۷۸۲ء سے اس کی واپسی کی تاریخ ستمبر ۱۷۸۸ء تک کیا جس کی مجموعی رقم اٹھاون لاکھ بتیس ہزار چھ سو سرسٹھ روپیہ پانچ آنہ قرار دیگئی۔

اول الذکر رقم سے سابق الذکر رقم کے منہا کرنے کے بعد کمپنی کے ذمہ جو رقم واجب الادا قرار پائی وہ نو لاکھ سولہ ہزار چھ سو پینسٹھ روپیہ گیارہ آنہ تھی اس طورپر میر عالم کی سفارت کامیاب

---

[1] Aitchison جلد پنجم صفحہ ۱۳۳   Our Faithful Ally صفحہ ۳۷

ثابت ہوئی اور تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہوگیا[۱]

۷ جولائی ۱۷۸۹ء کو لارڈ کارنوالس نے نواب نظام علیخاں بہادر کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ اور اپنی مجبوری کا اظہار کیا کہ قانون ۱۷۸۴ء کی وجہ سے وہ کسی ریاست کے ساتھ جدید معاہدہ کرنے سے مجبور ہے اور اطمینان دلایا کہ حکومت برطانیہ کے ذمہ اس خط کی تائید ایک باقاعدہ عہدنامہ کے مساوی سمجھی جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۱۵ مارچ ۱۷۹۲ء کو پارلیمنٹ میں ایک تحریک پیش ہوکر اس خط کو ایک معاہدہ کی حیثیت دیگئی۔

اس طویل خط میں لارڈ کارنوالس نے اپنی اور سرکار نظام کی دوستی اور اتحاد اور دیگر اہم معاملات کا ذکر کرتے ہوئے ۱۷۶۸ء کے عہدنامہ کی دفعہ ششم کی خاص طور پر توضیح اور تشریح بیان کی تھی کہ "جب کبھی سرکار نظام ضرورت ظاہر کریں تو فوج بھیجی جائیگی بشرطیکہ اس فوج سے کسی ایسی ریاست کے خلاف کام نہ لیا جائے۔ جو کمپنی کی حلیف ہو" حلیفوں کے نام حسب ذیل تھے۔

پنڈت پردھان پیشوا، راگھوجی بھونسلہ، مادھوجی سندھیا اور دوسرے مرہٹہ سردار، نواب ارکاٹ، نواب وزیر (اودھ)، راجہ ٹراونکور اور راجہ تنجور۔ اس تصریح کے بعد تعلقات کی نوعیت میں فرق ہوگیا اور اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں رہی۔ سرکار نظام اس فوج سے ہر وقت حسب دلخواہ کام لے سکتے تھے بشرطیکہ مذکورۂ بالا ریاستوں کے خلاف اس فوج سے کام نہ لیا جائے۔ اس خط میں لارڈ کارنوالس نے کمپنی کے حلیفوں کے جو نام لکھ کر آصف جاہ ثانی کے پاس بھیجے تھے اس میں ٹیپو سلطان کا نام درج نہ ہونا اور میسور کے خلاف باوجود ۱۷۸۴ء کے عہدنامہ صلح کے برقرار رہنے کے جارحانہ اتحاد قائم کرنا یہ ایسی باتیں تھیں جو ٹیپو سلطان کے لئے نہ صرف باعث اشتعال بلکہ باعث خطرہ بھی تھیں اور یہی وہ اسباب تھے جو دراصل میسور کی آئندہ جنگ کا باعث ہوئے[۲]

---

[۱] صفحہ ۳۰ Our Faithful Ally, The Nizam.

[۲] صفحہ Vol I p. ۱۰۵ Mallclm's Political History of India

چاندنی رات اور حسین ساگر

(از جناب محمد میرخاں صاحب غربت بی اے - ایچ، سی، ایس)
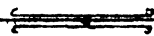
دس بجتے ہیں لو دور سے وہ گھنٹے کی آواز آنے لگی
اور شہر کی ساری وسعت پر خاموشی شب کی چھانے لگی
کلنے کی سڑک پر لوگوں کی آمد و شد باقی نہ رہی
تالاب کے صدقے ہو ہو کر لو کل بھی اب خاموش ہوئی
آواز فقط بجلی گھر کے انجن کی دور سے آتی ہے
یا رستے کی خاموشی کو کوئی موٹر چیرتے جاتی ہے

شب چاردہم، بے ابر سما، خاموش فضا اور نرم ہوا
تالاب کا منظر سحر آگیں، مہتاب کا عالم ہوش ربا
دو چاند ہیں جن کی طلعت سے یہ کیفیت مہتاب میں ہے
اک اوج فلک پر جلوہ نما اک روشن اس تالاب میں ہے
تالاب کے فرش بلوریں پر موجوں نے دھوم مچائی ہے
کوئی رقص میں تنہا جاتی ہے کوئی سب کو چھیڑتی آتی ہے
یہ تیر رہا ہے عکس مہ یا منت کی کوئی تھالی ہے
جس میں ہے چراغ ارمانوں کا اور پھولوں کی ڈالی ہے
یا کوئی فرنگن زہرہ جبیں، تنگ قبا و طفل نما
برفستاں پر ہے سیکھ رہی اندازِ خرام اسکیٹنگ کا

اے بحر زلال، اے آب حیات، ای نور کے تالاب آج ترے
آئینہ میں خوبانِ فلک ہیں جلوہ اپنا دیکھ رہے
میں تجھکو سرور و فرحت میں تسنیم کہوں، کوثر لکھوں
اصرار مگر اس بحر کا ہے کہ تجھکو حسین ساگر لکھوں
کیا حسن و جمال عالم کا تیری موجوں میں تلاطم ہے
ماہ و انجم سے بھی خوشتر یہ عکس ماہ و انجم ہے
کسی اہل دل سے اندازہ پوچھے تیرے اس منظر کا
وہ ناپ کا پتھر پانی میں کیا تیرے حسن کو ناپے گا

کچھ حاصل لطف و سرور کریں، یہ وقت بڑا غنیمت ہے
تہذیب پڑی سوتی ہے اور فطرت کا عہد حکومت ہے
چھپ جائیگا یہ حسن فضا خورشید نظر جب آئیگا
اور پھر بازارِ مکر و ریا دنیا میں گرم ہو جائیگا
چل ہمدم! اس کشتی گھر سے اک کشتی لیں اور سیر کریں
جا پہنچیں گھر سے پانی پر، ہو جائیں جذب اس منظر میں
تو پڑھ کوئی پرسوز غزل جس غزل میں فریاد آئے
اور اپنے شباب و الفت کے کسی افسانے کی یاد آئے
میں اپنی نے سے ساری فضا کو نغموں سے بھر دیتا ہوں
اور سادہ سُروں کے شیون سے رقت پیدا کر دیتا ہوں

اِشاراتِ اِعجام

(از: جناب اَبو المحاسن محمد محسن خاں صاحب متین)

تمہید — السنہ متمدنہ میں، شاید ہی کوئی ایسی زبان ہوگی، جس میں اشاراتِ اعجام اور ان کے منضبطہ اصول، موجود اور مُروّج نہوں۔ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے، جس میں بہت کم علامات تنقیط یا اوقاف کا باقاعدہ استعمال ہوتا رہا ہے، اس کی اصلی وجہ، جس کو ہم بدلائل واضح کرنا چاہتے ہیں، یہ ہے کہ ابتک زبان اردو میں قواعد تنقیط مُدوّن نہیں ہوئے اور نہ ملک کے کسی فاضل اہل قلم نے اس موضوع پر بحث کی۔ یہی وہ اہم فروگذاشت ہے، جس نے دیگر السنہ کی نسبت کرتے میدان ترقی میں، ہماری زبان کو بہت پیچھے رکھا۔ اس میں شک نہیں انجمن "ترقی اردو" کی خدمات، جن کے احسانات کے بار سے اردو سبکدوش نہیں ہوسکتی، اور اس کی وہ انتھک کوششیں، جو زبان اردو میں آئے دن تا بہ امکان اصلاح اور اضافہ کرتی رہی ہیں، آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، لیکن، ابھی اردو کو میدان ترقی میں کئی ہفت خوان طے کرنے ہیں؛ جب تک ملک کے لائق اخبار نویس، فاضل صحیفہ نگار، ذی رُتبہ شاعر، بلند پایہ انشاء پرداز اور اعلیٰ درجہ کے مصنف، جنہوں نے ابتک زبان کی جانب سے تغافل برتا ہے، اُس کی ترقی و خدمت کے لئے کمر ہمت نہ باندھینگے، اس وقت تک اردو کو وہ معراج نصیب نہوگی، جس پر آج مغربی السنہ کو ناز ہے۔

بادی النظر میں، اگرچہ "تنقیط و اعجام" کا مسئلہ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، تاہم عبارت میں اصلی و فرعی جملوں کا فرق معلوم کرنے، زبان اور مطالب کے سمجھنے میں سہولتیں بہم پہنچانے کی وجہ سے بہت کچھ دخل رکھتا ہے۔ مدت سے ہندوستان میں اس کی تقلید ہوتی رہی ہے لیکن، بجائے سہولت کے، فہم مطالب میں دشواریاں پیدا ہوگئیں۔ اس وجہ سے کہ ایک طرف سے اہل قلم تحریر میں، صحیح طریقہ پر بہت کم، تنقیطی علامات کا استعمال کرتے رہے تو دوسری جانب سے مطبع والے بھی جو قواعد سے نابلد ہوتے ہیں، من مانے ردّ و بدل کرکے کام بگاڑتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور سے بعض وقت، فرعی جملوں کے

فوراً سمجھنے میں — خصوصاً بتبدیوں کو، — بڑی دقت پیش آنے لگی۔

ضرورت و اہمیت

اوپر کے بیان سے (جو تنقیط اور اعجام کی اہمیت و ضرورت کو ظاہر کررہا ہے)، شاید ہی کوئی ذی علم انسان ہوگا، جس کو اختلاف ہو۔ رسالہ "اردو"، جو دنیائے صحافت میں "اصلاح زبان اردو" سے متعلق مضامین شائع کرنے میں، امتیاز خصوصی رکھتا ہے، اس میں ابتک "اصلاح رسم خط" سے متعلق جتنے بھی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اُن میں رسم الخط کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے سوا، جن کا لب لباب یہ ہے کہ "اردو رسم خط رومن کیریکٹر یا دیوناگری کے برابر آسان ہوجائے"، اصولِ "اعجامیات" کے موضوع پر مطلق اعتنا، نہیں کی گئی۔ البتہ، ان میں مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب ام، اے۔ (جو مدراس یونیورسٹی کے فیلو اور محمڈن کالج مدراس کے ادبیات شرقیہ کے پروفیسر ہیں) کے "اصلاح رسم الخط" سے متعلق مضمون[1] کا آخری حصہ جس میں "اوقاف و انجام" کی تجویز اور ان کے مجوزہ نام بھی مندرج ہیں، اس امر کو ثابت کرتا ہے، کہ پروفیسر صاحب ہی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اردو کی تحریر میں "اعجامیات" کی ضرورت کو محسوس کیا، چنانچہ وہ (خود) لکھتے ہیں:—

"زبان کی تحریر میں "اوقافِ قرأت" کا ہونا ایسا امر ہے، جس کی ضرورت سے کوئی صحیح الفکر انسان، انکار نہیں کرسکتا۔ پھر بالخصوص اردو کی تحریر میں اُن کا نہونا، جن مشکلات کا باعث ہوتا ہے وہ ہمیں معلوم ہی ہیں مگر، نہایت حیرت کی بات ہے کہ ابتک اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ رسالہ "کہکشاں" مرحوم (لاہور) میں مولوی سید ممتاز علی صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا تھا۔ مگر، جہاں تک مجھے یاد ہے، کسی اہل قلم نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کی تحریروں میں چند ایک اوقاف ضرور استعمال ہوتے ہیں، مثلاً: قامے (Commas) ہیں، جن کا وجود علامہ شبلی مرحوم اور دار المصنفین اعظم گڈھ کی کتب میں بالخصوص پایا جاتا ہے! قاماتِ معکوسہ، ندائیہ سوالیہ اور معترضہ (خطوط وحدانی) مگر۔ یہ استعمال یا تو بہت کم ہے یا —— (خصوصاً قامے کا حال تو یہی ہے کہ) غیر منضبطہ طور پر مستعمل ہے، اور زیادہ تر کاتب صاحب کے رحم پر

---

[1] ملاحظہ ہو: رسالہ "اردو" بابتہ اپریل ۱۹۲۳ء، جلد سوم، حصہ دہم، صفحہ (۲۹۵) - ۱۲

چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ تمام اوقافِ قرأت کا استعمال اردو کی تحریر میں جاری کیا جائے اور اُسی تفصیل اور تشدید سے جاری کیا جائے جیسا کہ انگریزی میں ہے"۔

تنقیطی اصول کا دائرۂ عمل اور ان کی ترویج۔

ناظرین پر "تنقیط و اعجام" کی ضرورت و اہمیت واضح ہو چکی، اب دقت طلب یہ امر ہے کہ تنقیطی دائرۂ عمل کیا ہوگا؟ اور اس کے اصول کی ترویج کے لئے کس گروہ سے اتحادِ عمل کی ضرورت ہے؟

(۱) اولاً تنقیطی اصول ہماری زبان کی قواعد و رسم تحریر میں شامل کرلئے جائیں، (۲) ثانیاً تمام درسی کتب کی تحریرات میں ان اصول کو، جس کو ہم نے آئندہ صفحوں میں مفصلاً قلمبند کیا ہے، نہایت شدّ و مد کے ساتھ جاری اور استعمال کیا جائے۔ لیکن، یہ اُسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ مصنّفین کا طبقہ ان اصول کا نہایت سختی کے ساتھ پابند ہو اور وہ کتابیں جو شریک نصاب کرلی جاتی ہیں اُن میں تمام اوقاف کا باقاعدہ استعمال ہو۔ چونکہ یہ اصلاحیں ایسی نہیں ہیں، جن میں مالی مصارف برداشت کرنا پڑے۔ اگر ہمارے اربابِ تعلیم جہاں انہوں نے "تالیف و ترجمہ" کا سررشتہ قائم کیا ہے اور تعلیمی طباعت کار = ایجوکیشنل پرنٹر (Educational Printer) مقرر کئے ہیں وہیں اس کے ساتھ ساتھ کتابت و طباعت میں "اصول تنقیط" کو مدنظر رکھنے کی جانب تہدیدی احکام جاری فرمائیں نیز ملک کے ادیبوں اور فاضلوں میں ان قواعد و اصول کو استعمال کرنے کی تحریک کارفرما رہے تو ممکن ہے کہ اُردو کی مشکلات رفع ہو جائیں۔

ماہ اپریل ۱۹۲۵ء کے مجلّۂ "ایرانشہر" شمارہ (۶)، سال (۳) میں، فاضل محترم آقا حسین کاظم زادہ (جو مجلّۂ مذکور کے مدیر و مؤسس ہیں) "اصلاحاتیکہ بوجہ لازم ندارد" کے زیرِ عنوان ــــ جس کے مطالعہ سے مجھے تنقیطی قواعد کے مُدوّن کرنے میں بڑی مدد ملی ــــ ایران کے اربابِ معارف کو قواعد تنقیط و اعجام کے اجراء کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

"تعلیمی اصلاحات کی ضمن میں، بعض اصلاحیں ایسی بھی ہیں، جو کسی رقم و موازنہ کی احتیاج نہیں رکھتیں، فقط ایک ان کا جاری کرنا، وزراء و عہدہ دارانِ تعلیم کی توجہ، بیدار مغزی اور وسیع الخیالی پر موقوف ہے۔ زمانۂ سابق میں، جب کبھی اُن کو کسی اصلاح کی جانب توجہ دلائی جاتی تھی تو وہ ہمیشہ سیاسی موانع کا حیلہ کر دیا کرتے تھے۔ اب، جب کہ وزارت تعلیم کو فرصت و موقع حاصل ہے، اصلاحات کے جاری کرنے میں یہ عذرات پیش کر رہی ہے، کہ تعلیمات کا

موازنہ اجازت نہیں دیتا۔ ایسی صورت میں ——— جب کہ اولاً وہ بہت ساری خرابیاں، جن کی اصلاح، محتاج رقم و موازنہ نہیں، ——— موجود ہیں۔ ثانیاً جیسا کہ ہم نے ایران کے بعض صوبوں میں دیکھا ہے، عہدہ داران تعلیم نے اپنے حلقۂ اثر میں، جس قابل ستایش طریقہ پر ——— بغیر اس کے، کہ کسی جدید موازنہ کی محتاجی ظاہر کریں، ——— تعلیم کو ترقی دی ہے وہ خود اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اگر ہوشیار و باخبر عہدہ دار، جن کے ہاتھوں میں تعلیم و معارف کی باگ ہے، اور وہ سررشتۂ تعلیم کی خدمت سے سچا عشق رکھتے ہونگے، احیائے تعلیم و معارف کے لئے بہتیری جدید اصلاحیں اور تنظیمیں بھی عمل میں لائینگے اور تو ان اصلاحات کے جاری کرنے کے وسائل بھی پیدا کر دینگے!"

اعجام کی حقیقت اور اس کے فائدے

ہم نے اوراق سابقہ میں "تنقیط و اعجام" کی ضرورت و اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ یہ اصول، زبان اور فہم مطالب کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے میں بہت کچھ دخل رکھتے ہیں، اور اب یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ "اوقاف و اعجامات" عبارت اور فقروں میں کلمات کا امتیازی فرق اور جملوں کی ابتداء و انتہاء اور ان کے مابعد کے جملوں سے ان کو کسی قسم کا لفظی و معنوی تعلق ہونا یا نہونا ظاہر کرتے ہیں، نیز اُن کا وجود قارئین کے حق میں اُس رہنما کی مانند ہے، جو عبارت خوانی کے موقت پر ان کو موقع موقع پر ٹوکتا اور الفاظ کی نسبت امتیاز اور جملوں کے درمیان فاصلہ کی تمیز کراتا ہے۔ اگر اصول تنقیط نہوں تو عبارت میں اصلی و فرعی جملوں کے درمیان فاصلۂ تمیزی نہونے سے مفہوم کے سمجھنے میں دشواریاں لاحق ہونگی اور کتب کا مطالعہ اِس قدر آسان کام نرہیگا۔ اسی خیال کے نظر کرتے تحریر میں "تنقیط و اعجام" کا وجود نہایت ضروری سمجھا گیا۔

السنۂ متمدنہ کا اصولِ تنقیط اور اُن کا اجراء۔

غیر زبانوں کے اصول تنقیط کے اجراء سے، شاید وہ بزرگوار کچھ اختلاف کریں، جن کو اپنی قدیم اشیاء کے ساتھ دلچسپی ہے، اس لئے کہ، یہ لوگ ہمیشہ سے ہرنئی تحریک کو اعتراض کی نظر سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں؛ لیکن، اگر ہم ہر موقع پر ایسی کوتاہ نظری سے کام لینگے تو ہمیشہ کے لئے ہماری زبان ایک تنگ دائرہ میں محدود رہیگی اور کسی حال میں بھی دیگر زندہ و ہمہ گیر زبانوں میں، اس کا شمار نہوگا۔ جس وقت ہم غیر زبانوں کی وسعت پر سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے، کہ ان زبانوں میں، اس قدر وسعت اور ہمہ گیری کہاں سے پیدا ہو گئی! لیکن،

جب ہمارا دائرۂ تحقیق غیر معمولی طور پر وسعت حاصل کرلیتا ہے تو ہم کو فوراً اس امر کا پتہ چل جاتا ہے، کہ اِن زبانوں نے دیگر السنہ کے ادبیات سے ضرور استفادہ کیا ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم (جو کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اردو ادبیات کے پروفیسر اور وضع اصطلاحات کے مؤلف ہیں) اسی گروہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اگر آپ جرمن، فرانسیسی، انگریزی زبان کی لغات کھول کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا، انھوں نے تمام دنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

اس قدر طولانی بحث کے بعد، اب ہم ناظرین کی توجہ پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن صاحب کے اُس آخری فقرہ: "میں تجویز کرتا ہوں کہ تمام "اوقاف قرأت" کا استعمال اردو کی تحریر میں جاری کیا جائے، اور اسی تفصیل اور تشدید سے جاری کیا جائے جیسا کہ انگریزی میں ہے"، کی جانب منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ آیا اُن کی یہ تجویز ہماری زبان کی ضروریات کے اعتبار سے مفید ہو سکتی ہے یا کیا؟

زبان اردو کی تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اُردو کا اصول نگارش اگرچہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے سرسید احمد خاں مرحوم کے عہد تک، بالکل سادہ اور قدیم رہا، اور ان کے بعد بھی ایک عرصہ تک اردو کا اسلوب تحریر قدیم اصول نگارش کا حامل رہا، لیکن، جب سے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ نے اس میدان میں قدم رکھا ہے، اردو کا اسلوب تحریر ہی بدل گیا، اُن کے قلم سے جتنے بھی جملے نکلتے ہیں وہ انگریزی طرز ادا میں ڈوبے ہوئے اور یہ سیلاب کہیں رُکتا نظر نہیں آتا، کیونکہ نہ معترضین میں کوئی ایسا گروہ باقی رہا ہے، جو اس تحریک سے اختلاف رکھتا ہو اور نہ کوئی قدیم طرز تحریر کا دلدادہ ہی رہا جو اس خیال کی تردید کر سکے۔ اس لئے اب وہ وقت آگیا ہے کہ السنہ متمدنہ (انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں) میں، جو تنقیطی اشارات کا رسم الخط اور ان کے منضبطہ اصول، مُروج اور مستعمل ہیں، انھیں کو اردو زبان میں جاری کیا جائے۔

اوقاف کے ناموں کے متعلق انجمن ترقی اردو کی تجویز: اردو کی تحریر میں غیر زبانوں کے "اصول اعجام" کے جاری کرنے کے متعلق ہم کافی بحث کر چکے ہیں، "اعجامیات"[1] کی حقیقت اور اُس کے فائدے بھی تحریر کر دئیے ہیں، لیکن اب یہ بحث طلب مسئلہ رہ گیا ہے، کہ "اعجام" کی

[1] ملاحظہ ہو: رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء جلد دوم، حصہ پنجم، صفحہ (۱۰۷) - ۱۲

علامات کے نام اور ان کا رسم الخط کیا ہونا چاہئیے؟ چونکہ انجمنِ ترقی اردو "اصلاح زبان" اور "وضع اصطلاحات" سے متعلق ادبی خدمات انجام دینے میں ہندوستان کی تمام ادبی انجمنوں سے پیش پیش رہی ہے، اس لئے ہم ذیل میں انجمن مذکور کی اس شائع شدہ فہرستؔ کو، جس میں اوقاف واعجام" کے مجوزہ نام اور ان کا رسم الخط درج ہے، ناظرین کی وسعت نظر کے لئے پیش کرتے ہیں:-

اردو نام	انگریزی نام	علامت
۱۔ وقفہ	Fullstop.	ـ
۲۔ نیم وقفہ	Colon	:
۳۔ رابطہ	Semi Colon.	؛
۴۔ سکتہ	Comma	،
۵۔ واوین	Inverted Commas	" "
۶۔ سوالیہ	Note of Introgation	؟
۷۔ ندائیہ	" " Interjection	!
۸۔ قوسین	Brackets	( )
۹۔ نقطے	Dash	....

اوقاف کے فارسی نام

قدیم الایام میں فارسی تحریر میں "تنقیط" کے لئے نہ کوئی خاص علامتیں مقرر تھیں اور نہ اُن کے لئے کوئی خاص نام۔ کیونکہ واو عاطفہ جملوں کے درمیان بجائے قامات وغیرہ کے استعمال کی جاتی تھی، البتہ ہر ایسے مستقل جملے کی ابتداء اور انتہا پر جو ایک پورے خیال کو ادا کرتا ہو۔ شناخت کے لئے صرف دو علامتیں لگا دی جاتی تھیں:-

(۱) ایک تعریفی علامت (۲) دوسری ختم جملہ کی علامت۔

(۱) تعریفی علامت، جملے کے شروع میں، جس کے لئے یہ شکل (ــــ) مقرر تھی، استعمال کی جاتی تھی، اور یہی تعریفی علامت اعلام واسماء پر بھی استعمال کی جاتی تھی۔

(۲) ختم جملہ کی علامت کے لئے صرف ایک خطِ فاصل، جس کی شکل اس طرح (ـ) ہوتی تھی، استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن، جب سے کہ ایران میں جدید دور کا آغاز ہوا ہے، فارسی والوں نے بھی ادبیات کے کل پرزے درست کرنے کی جانب توجہ کی اور فارسی تحریر میں السنہ متمدنہ کے اعجامی

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: رسالہ "اردو" بابتہ اکتوبر ۱۹۲۳ء، جلد سوم، حصہ دوازدہم، صفحہ (۵۸۲) ۔ ۱۲

قاعدے استعمال کئے جانے لگے، "اوقاف و اعجام" کے لئے نام بھی تجویز کئے گئے۔

ہم ذیل میں پروفیسر محمد نعیم الرحمن صاحب ایم، اے۔ کے پیش کردہ فارسی ناموں کی فہرست،[لھ] جس کو غالباً پروفیسر صاحب نے جدید فارسی رسائل سے اخذ کیا ہے ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کرتے ہیں:-

فارسی نام	انگریزی نام	علامت
۱۔ نقطہ یا قاطعہ	Fullstop	.
۲۔ مفرزہ یا نقطہ	Semi Colon	؛
۳۔ دو نقطہ یا شارحہ	Colon.	:
۴۔ سکتہ یا فاصلہ	Comma	،
۵۔ رابطہ	Hyphon	-
۶۔ فارقہ	Dash	——
۷۔ معترضہ	Parenthesis.	( )
۸۔ تفریقیہ	Brackets	[ ]
۹۔ استفہامیہ	Query	؟
۱۰۔ تعجبیہ	Interjection	!
۱۱۔ نقاط انصرافیہ یا تقدیریہ	Dots of Ommission	....
۱۲۔ ممیزہ	Inverted Commas	" "

عربی اوقاف کے نام عربی زبان، جو اُم الالسنہ کہلاتی ہے، اگرچہ ابتدا میں فارسی زبان کی طرح اس زبان کی تحریر میں اوقاف کے لئے نہ کوئی خاص نام مقرر تھے اور نہ کوئی خاص علامات۔ لیکن غالباً ائمۂ فن نے تسہیل قرأت کے لئے اس زمانہ کے کچھ عرصہ بعد، جس میں قرآن شریف میں اعراب لگائے جانے کی تجویز ہوئی تھی، قواعد اوقاف مُدوّن کئے۔[لے] عربی تحریر میں سوائے قرآن پاک کے کہیں بھی اوقاف کا باقاعدہ استعمال نہیں ہوا۔ اگر کہیں اوقاف کی علامتیں استعمال ہوئی بھی ہیں تو صرف دو چار اوقاف کی علامتوں کے سوا، پورے قرآنی اوقاف

لھ ملاحظہ ہو: رسالہ "اردو" بابتہ اپریل ۱۹۲۳ء حصہ دہم، جلد سوم، صفحہ (۲۹۶ و ۲۹۷)۔ ۱۲

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مولوی محمد عبدالرزاق صاحب مصنف "البرامکہ" کا مضمون "علم الکتابت یا تاریخ الاَبجد" رسالہ زمانہ" جوبلی نمبر" بابتہ فروری ۱۹۳۰ء جلد ۵۰ و نمبر ۲، صفحہ ۲۶ و نیز مولوی سید یوسف الدین صاحب صوبہ دار گلبرگہ شریف کی مولفہ کتاب "الخط الاسلامی" صفحہ (۹۰ و ۹۱)۔ ۱۲

استعمال نہیں ہوئے۔ کتب تجوید میں اوقاف قرآنیہ کے مُدَوّنہ اصول اور ان کی علامتوں کے متعلق ایک مستقل باب موجود ہے، اور وہ بھی اس شرح و بسط کے ساتھ قلمبند ہوئے ہیں، جو شاید ہی کسی اور زبان میں اس تشدید او تفصیل کے ساتھ ہونگے۔

ہم ذیل میں اُن اوقاف سجاوندی کو مع ان کی علامتوں کے، جو ہندوستان کے مطبوعہ قرآن میں مروج ہیں، ناظرین کی وسعت معلومات کے لئے پیش کرتے ہیں[1]:-

عربی نام	علامت	عربی نام	علامت
۱۔ وقف تام	○ ۸ ۵	۱۰۔ کذالک	ك
۲۔ وقف لازم	م	۱۱۔ سکتہ	س
۳۔ وقف مطلق	ط	۱۲۔ امر	قِف
۴۔ وقف جائز	ج	۱۳۔ سکتۂ طویلہ	وقفہ
۵۔ وقف مرخص	ص	۱۴۔ معانقہ	∴ مع
۶۔ وقف مجوز لوجہ	ز	۱۵۔ لائے خالص	لا
۷۔ قد یوصل	صل	۱۶۔ اعادۂ قرأت	ۃ ۃ ۃ
۸۔ الوصل الاولیٰ	صلے	۱۷۔ رکوع	ع یا ۶
۹۔ قیل علیہ الوقف	ق	۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	

مندرجۂ بالا اعجامی اعلام و علامات کو اگر ہم قرآن شریف کے اوقافِ خصوصی تصور کریں تو بالکل بجا ہے اس وجہ سے کہ عربی تحریرات میں اِن کا بہت کم، استعمال ہوتا رہا ہے۔ نیز عربی زبان کے جدید مطبوعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ عربی والوں نے بجائے اوقاف قرآنیہ کے غیر زبانوں کے اوقاف کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، عہد حاضر میں، جبکہ مغربی تہذیب و تمدن دنیا پر ابر محیط کی طرح چھا گیا ہے اور مغربی السنہ کی ہمہ گیر وسعت نے دنیائے ادبیات میں حیرتناک انقلاب پیدا کر دیا ہے ایسی صورت میں، اگر عربی والوں نے مغربی زبانوں کے اصولِ تنقیط کو اختیار کیا ہے تو کوئی محلِ تعجب نہیں!

تنقیطی اصطلاحوں پر ایک نظر | اوراق ماسبق میں، "اشارات اعجام" کے متعلق انجمن ترقی اردو کے مجوزہ اعلام اور فارسی و عربی مستعملہ اعجامات کی مکمل اسمواری فہرست ہم نے

[1] ملاحظہ ہو: خلاصۃ التجوید مولفہ مولوی قاری محمد منیر علی صاحب عثمانی، صفحہ (۳۹)-۱۲

پیش کردی ہے ۔ اور اُن مسائل پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے کہ فارسی اور عربی زبان میں اوقاف کا استعمال کس زمانہ سے شروع ہوا؟ اگرچہ ہم یہ دعوے نہیں کرسکتے کہ ان پیش کردہ امور میں کوئی بحث طلب مسئلہ باقی نہیں رہا، تاہم، ہم نے تا بہ امکان اس امر کی کوشش کی ہے، کہ وہ تمام اہم اجزاء، جو ہمارے موضوع کے روح اصلی ہیں، ایک جگہ جمع کردئیے جائیں۔ "لسانیاتی" نقطۂ نظر سے الفاظ اور اصطلاحات کی جانچ اور پرکھ کوئی آسان کام نہیں، لیکن، چونکہ اوقاف کے اصطلاحی ناموں کی بحث آپڑی ہے، اس کے اعتبار سے ہم اس موضوع پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم کو اصطلاحی ناموں پر تنقیدی نظر ڈالنے کے پہلے، اولاً اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اصطلاحوں کے وضع کرتے ہیں، کن اصول کو مدنظر رکھا جائے؟ ثانیاً ناموں کا لفظی ترجمہ کیا جائے یا معنوی ۔ اس کا جواب مختصراً یہ ہوگا کہ ترجمہ خواہ لفظی ہو یا معنوی ـــ تمام نام ایسے تجویز کئے جائیں، جن کے پڑھنے سے ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوجائے کہ واضع نے اِن کو اس کام کے لئے وضع کیا ہے۔ اسی خیال کے مدنظر، انجمن ترقی اردو اور فارسی والوں نے "اشارات اعجام" کے لئے، جو نام تجویز کئے ہیں، اُن سے ہم کو جزئی اختلاف ہے؛ اس وجہ سے کہ یہ مجوزہ نام، جو دراصل انگریزی ناموں کا ترجمہ ہیں، اُن میں کسی خاص نوعیت کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ یعنے: یہ ترجمہ نہ پورا لفظی (صُوَری) کہلا سکتا ہے نہ معنوی (اصطلاحی)۔ جہاں ناموں کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے وہ بلحاظ علمیت کسی طرح موزوں نہیں معلوم ہوتے، اور جہاں ناموں کو اصطلاحی شکل میں لانے کی کوشش کی گئی وہ بھی بلحاظ اپنے ذاتی فعل کے غیر مظاہر ہونے کے، جن کی نسبت ہم ذیل میں تفصیلی بحث کرنے والے ہیں کچھ ناموزوں سے نظر آتے ہیں: "کولن" (Colon) کا ترجمہ "ترقی اردو" نے نیم وقفہ کیا ہے، حالانکہ یہ علامت، شرح و تفسیر کے لئے، جہاں پڑھنے میں "سیمی کولن" (Semi-Colon) سے کچھ زیادہ ٹھہرتے ہیں، استعمال کی جاتی ہے، جس کا صحیح ترجمہ فارسی والوں نے بلحاظ اس کے عمل کے "شارحہ" کیا ہے۔ اسی طرح "سیمی کولن" (Semi Colon) کا ترجمہ انجمن مذکور نے "رابطہ" کیا ہے۔ حالانکہ "رابطہ" ہیفن (Hyphon) کا ٹھیک ترجمہ ہوسکتا ہے؛ چونکہ "سیمی کولن" (Semi Colon) کی علامت، جہاں استعمال کیجاتی ہے وہاں پڑھنے میں "سکتہ" (Comma) سے زیادہ اور وقفہ (Full stop) سے کم ٹھہرتے ہیں اسی اعتبار سے اس کا ٹھیک ترجمہ "نیم وقفہ" ہوسکتا ہے نہ کہ "رابطہ"۔

"اُن ورٹڈ کاماز" (Inverted Commas) کا ترجمہ انجمن مذکور نے واویں کیا ہے حالانکہ واویں "ان ورٹڈ کاماز" کی علامتیں ہوسکتی ہیں نہ کہ نام۔ ایک بزرگوار[1] نے اس کا ترجمہ "قامات معکوسہ" کیا ہے، لیکن جب ہم نے اس علامت کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُن "واوں" میں دو واویں سیدھی شکل کی بھی ہیں، اس لحاظ سے یہ ترجمہ نہ پورا لفظی کہلا سکتا ہے نہ معنوی۔ "ان ورٹڈ کاماز" نقل کردہ قول کی تمیز کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، معنوی اعتبار سے فارسی والوں نے اس کا ترجمہ مُمیّزہ کیا ہے اور ہماری نظر میں بھی اس علامت کا ٹھیک ترجمہ بلحاظ اس کے فعل ذاتی کے مظہر ہونے کے ممیزہ یا معترفہ یا ناقلہ ہوسکتا ہے۔

"کوئری" (Query) کا ترجمہ، جس کو اردو میں ایک عرصہ سے استفہامیہ بولتے رہے ہیں، "ترقی اردو" نے سوالیہ کیا ہے، جو بہ نسبت "سوالیہ" کے "استفہامیہ" اصطلاحی لفظ بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ نیز قواعد صرف و نحو میں بھی یہی اصطلاح مستعمل ہے، جو اُس کی تینوں قسموں (استخباری، اقراری، انکاری) پر حاوی ہے۔

"انٹر جکشن" (Interjection.) کا ترجمہ "ترقی اردو" نے "ندائیہ" اور فارسی والوں نے "تعجبیہ" کیا ہے، جو بلحاظ اسمیت صرف ندا اور تعجب کے موقع پر استعمال ہونا چاہئے حالانکہ جذبہ و جوش کے اظہار کے لئے جتنے کلمے استعمال کئے جاتے ہیں اُن کو قواعد میں "فجائیہ" کہتے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ بلحاظ ان تمام کلموں (خواہش، التماس، مسرت، تاسف، تعجب، تنفر اور تحسین) پر حاوی ہونے کے "فجائیہ" یا "انجذابیہ" ہوسکتا ہے نہ کہ ندائیہ یا تعجبیہ۔

"پارن تھیسس" (Parenthesis) اور "بریکیٹس" (Brackets) کا ترجمہ انجمن مذکور نے قوسین کیا ہے، جو بلحاظ اُن کے عمل کے اُن کا صحیح ترجمہ علی الترتیب "معترضہ" اور "تفریقیہ" (بیانیہ) ہونا چاہئے نہ کہ صرف قوسین۔

"ڈیش" (Dash) کا ترجمہ "ترقی اردو" نے نقطے کیا ہے حالانکہ نقطے ڈاٹس آف اومیشن (Dots of Ommission) کا ترجمہ ہوسکتا ہے نہ کہ "ڈیش" کا۔ کیونکہ "ڈیش" صرف ایک خط ہوتا ہے، جو جملہ معترضہ کے شروع اور آخر میں یا ایک جملہ کو دوسرے جملہ سے اچانک طور پر قطع کرنے کے لئے یا قائل و سامع کے الفاظ کا فرق ظاہر کرنے کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فارسی والوں نے اس کا صحیح ترجمہ "فارقہ" کیا ہے، جو نام ہی سے اس کے عمل کا پتہ

[1] رسالہ اردو بابتہ اپریل ۱۹۲۳ء، جلد سوم، حصہ دہم، صفحہ ۲۹۰ کی جدول میں آخری سطر ملاحظہ ہو۔ ۱۲

چل جاتا ہے۔ "نقطے" لفظی ترجمہ ہو سکتا ہے صرف لفظ ڈاٹس (Dots) کا جو بلحاظ علمیت یہ نام کسی طرح موزوں نہیں اس لئے کہ نقطوں کا اطلاق اسم علم پر ہوتا ہے نہ کہ اسم خاص پر۔ اسی لحاظ سے ڈاٹس آف اومیشن (Dots of Omission) کا لفظی ترجمہ "نقاط تقدیریہ" یا صرف "تقدیریہ" ہونا چاہئے۔

فارسی والوں نے پارن تھیسس (Parenthisis) کا ترجمہ "معترضہ" کیا ہے لیکن چونکہ اس علامت کی شکل اور بیانیہ (بریکٹس) کی شکل کے درمیان کوئی بین فرق نہیں ہے اس لئے بجائے پارن تھیسس کی علامت کے "فارقہ" کا استعمال مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ذیل میں ہم اپنے اُن مجوزہ اعجامی اشاروں کے اسماء کی فہرست، جس کی نسبت ارباب حل وعقد اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے اصطلاحوں کے وضع و استخراج کرنے میں کہاں تک مفہوم کیساتھ مطابقت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، پیش کرتے ہیں:۔

اردو نام	انگریزی نام	علامت
۱۔ قاطعہ یا وقفہ	Fullstop	.
۲۔ مفرزہ یا نیم وقفہ	Semi Colon.	؛
۳۔ شارحہ	Colon	:
۴۔ سکتہ	Comma	،
۵۔ ممیزہ یا ناقلہ	Inverted Commas	" "
۶۔ استفہامیہ	Query	؟
۷۔ فارقہ	Dash	—
۸۔ انجذابیہ یا فجائیہ	Interjection	!
۹۔ رابطہ	Hyphon	-
۱۰۔ متساویہ یا متوازیہ	Equation	=
۱۱۔ بیانیہ یا تفریقیہ	Brackets	( )
۱۲۔ تقدیریہ	Dots of Omission.	....

تنقیطی قواعد کے مآخذ۔ | مذکورہ تجویز کے نظر کرتے، ذیل میں ہم ان تنقیطی اصطلاحوں کی تعریفیں جن کو فاضل محترم حسین کاظم زادہ نے جرمن زبان کی تنقیطی علامات و اشارات اور ان کی قواعد کا (جو اس زبان میں مروج ہے) اختصار کر کے فارسی میں ترجمہ کیا ہے،

قلمبند کرتے ہیں۔ نیز چونکہ یہ قواعد فرانسیسی و انگریزی زبان کے قواعد سے ـــــ جن میں بعض علامتیں ہماری زبان کی علامتوں کے ساتھ تطابق نہیں رکھتیں، ـــــ تھوڑا سا تفاوت رکھتی ہے؛ اسلئے یہ مدون قواعد، جن کو فاضل موصوف نے اُن تینوں زبانوں کی قواعد تنقیط سے اخذ کرکے اُن (قواعد) کو، جن سے اُن کی اپنی زبان کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں، وضع و استخراج کیا ہے۔ لیکن، چونکہ سوائے علامات و اشارات اور ان کے طرق استعمال کے، اوقاف کے اصطلاحی نام نہیں وضع کئے اور نہ اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے کہ اوقاف و اعجامات سے کیا مُراد ہے؛ اس لئے پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔اے اور انجمن "ترقی اردو" کے مجوزہ و وضع کردہ اصطلاحی نام نیز اوقاف و اعجامات کی منطقی تعریف، قدرے ترمیم و اضافہ کے ساتھ درج کرتے ہیں:۔

علامات تنقیط اور اُن کے قواعد | اعجام یا تنقیط نام ہے اُس عمل کا، جو کلموں یا کلاموں کا فاصلۂ تمیزی بذریعہ چند مقررہ علامتوں کے استعمال کے ظاہر کیا جاتا ہے۔

اشارات اعجام وہ علامتیں ہیں، جو اعجام اور تنقیط کے قاعدوں کے اجراء کے لئے وضع کی گئی ہیں، مثلاً: (۰)، (ـُـ)، (:)، (؟)، وغیرہ.........

قاطعہ یا وقفہ (Fullstop) نام ہے اس علامت کا، جو ایک نقطہ یا خط کی شکل (۰ -) میں ہوتی ہے وہ ایسے جملے کے خاتمہ پر ـــ جہاں وقفہ لیکر پڑھتے ہیں، ـــ رکھی جاتی ہے:

۱۔ ایسے ہر ایک جملے کے بعد، جو بجائے خود مستقل، اور ایک پختہ تُلے مطلب کو ادا کرتا ہو۔

۲۔ عنوان (ذیلی سرخیوں) کے بعد اور نشان یا نمبر کے بعد۔

۳۔ اختصار کردہ جملوں (یا مخففات) کے آخر میں،

مثلاً: الخ، صل، م۔ بجائے محمدؐ کے وغیرہ.....

سکتہ (Comma) کی علامت اُلٹے پیش (،) سے ملتی جلتی ہے (سکتہ کے بعد چند ثانیوں تک ٹھیرنا چاہئے اور اسی لئے اس کا ٹھیک ترجمہ ـــ قرآنی اوقاف کے بموجب، ـــ "قِف" ہو سکتا ہے) اور یہ استعمال کی جاتی ہے:

۱۔ ایک ہی جملہ کے ایسے اجزاء کے درمیان، جو اس جملے سے متعلق ہونے کی وجہ تمام کے تمام خاص اہمیت رکھنے ولے ہوتے ہیں بجائے واو عاطفہ کے آتا ہے۔

مثلاً: آگ، ہوا، مٹی، پانی تمام قدرت کے بنائے ہوئے ہیں۔ یا قدرت نے پانی مٹی، ہوا، آگ پیدا کی ہے۔ لیکن، اگر یہی یکساں اہمیت رکھنے ولے کلمے، جو ایک جملہ میں واقع

ہوئے ہیں، بذریعہ کلمات (عاطفہ، تردیدیہ، نافیہ) و، یا، نہ، ایک دوسرے کے متصل ہوں وہاں سکتہ (قامہ) لازم نہیں۔

مثلاً: آب وہوا دونو ضروری ہیں۔ انسان یا حیوان، جس کو دیکھئے قدرت کے مظہر ہیں۔

۲۔ اس لئے کہ اس نے ہر اُس جملہ کو، جو بذریعہ حروف رابطہ کے دوسرے جملے کے متصل تھا (اس ایک کو) دوسرے سے جدا کر دیا۔

مثلاً: چاند چمک رہا ہے، نسیم چل رہی ہے، چشمے بہ بہ کر ٹھیرے ہوئے پانی کی سطح کو حرکت میں لا رہے ہیں، یہ ایسا سماں ہے، جس سے انسانی احساسات میں معنوی اہتزاز پیدا ہو رہا ہے۔

۳۔ اصلی جملوں کو فرعی جملوں سے جدا کرنے کے لئے۔

مثلاً: جس نے صحت کی قدر نہ کی، وہ زندگی کی قدر کیا جانے؟

۴۔ معترضہ جملوں کے شروع اور آخر میں۔

مثلاً: میں بھی، اگر آپ اجازت دیں، اس کام میں شریک ہوتا ہوں۔

۵۔ کلمات توصیفی کے شروع اور آخر میں۔

مثلاً: شکسپیر، انگریزی کا سب سے بڑا شاعر، ۱۵۶۴ء سے ۱۶۱۶ء تک زندہ رہا۔

۶۔ حروف فجائیہ کے شروع اور آخر میں۔

مثلاً: آہ، شاید، عین ہمارے انتظار میں، کوئی ناگوار واقعہ پیش آیا ہوگا!

مُفرزہ یا نیموقفہ (Semi Colon) مراد ہے اس نقطہ یا خط سے، جس پر لٹا پیش (؛ ؍) ہوتا ہے اور وہاں قاطعہ (Fullstop) سے کم اور سکتہ (Comma) سے زیادہ دم لیتے ہیں اور وہ رکھا جاتا ہے:

۱۔ اس لئے کہ بڑے بڑے جملے۔ جو بغیر حرف ربط کے آپس میں مربوط ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور بالخصوص ایسے موقع پر، جبکہ جملہ ثانی، جملۂ اوّل کے برعکس ہونا ثابت کرتا ہے (تضاد)۔

مثلاً: مُغنّی گا رہا ہے، اس طرح، جیسے کوئی بلبل درخت کی ٹہنی پر بیٹھے چہچہاتی ہو؛ وہ خوش آوازیں، جو اس کے دہن سے نکل نکل کر ہوا میں اہتزاز پیدا کر رہی ہیں، اس مجمع کے کانوں کے لئے ایک بہترین صلہ ہیں؛ اس کے لئے کوئی ایسا انعام نہیں جو اس کی اپنی آواز سے بڑھ کر محظوظ کر سکے۔

۲۔ ان طولانی اصلی اور فرعی جملوں کے درمیان، جو متعلقہ حروف رابطہ کے ذریعہ ایک دوسرے کے متصل واقع ہوئے ہوں۔

مثلاً: جب کہ بچوں کی تربیت ماؤں کے ذمہ کر دی گئی ہے، ماؤں کو تربیت دینا بھی ضروری ہوا؛ اس اعتبار سے، عورتوں کی تربیت کے بارہ میں غفلت کرنا بچوں کے حق میں بڑا ظلم ہے۔

شارحہ (Colon) ان دو نقطوں (:) کا نام ہے، جہاں نیم وقفہ (Semi Colon) سے کچھ زیادہ ٹھہرتے ہیں اور وہ لگائے جاتے ہیں:

۱۔ قول مستقیم کو نقل کرنے کے لئے۔

مثلاً: اس نے کہا "میں آج تمہارے گھر آؤنگا"۔

۲۔ اشخاص یا اشیاء کے گننے کے لئے (تعداد سے قبل رکھنے چاہئیں)۔

۳۔ کلمات ذیل کے آخر میں: مثلاً: وہ چیزیں مراد ہیں: وہ حسب ذیل ہیں: وغیرہ.....

مثلاً: سعدی کی مشہور تصنیفوں سے مراد: بوستاں، گلستاں، غزلیات اور طیبات ہیں۔ ہندوستان کے بڑے دریاؤں کے نام حسب ذیل ہیں: برہم تپر، گنگا، جمنا، سندھ، کرشنا، کاویری، گنگا، گوداوری.........

۴۔ شرح اور تفسیر کلام کے لئے۔

مثلاً: جوں ہی میں نیند سے خوفزدہ ہو کر چونک پڑا، میں نے کہا: خدایا مجھے اس خواب کے عذاب سے بچا۔

ممیزہ یا ناقلہ (Inverted Commas) وہ واویں (" ") ہیں، جو نقل کردہ قول کی تمیز کے لئے استعمال کی جاتی ہیں:

۱۔ دوسروں کے اقوال کے شروع اور آخر میں، جو بجنسہ نقل ہوئے ہوں۔ اگر وہ پورے کا پورا جملہ ناقل کے لئے قطع کیا گیا ہو، ـــ علامت کو دوبارہ لکھنا چاہئے۔

مثلاً: "بھائی جان" میری بہن نے کہا: "مجھے اپنے ہمراہ لے چلو!"

۲۔ ایک ضرب المثل یا دوسروں کی تحریر کے اول اور آخر میں۔

مثلاً: اس نے مجھ سے اس طرح کہا: "ع۔ جن کے رتبے ہوں سوا ان کو سوا مشکل ہے"۔

۳۔ ایک جملے یا کلمے اور غیر زبان کے لغات کی تاکید کے لئے۔

مثلاً: فلسفۂ "انڈویجوالزم" کے نقطۂ نظر سے ہر شخص کو پورے طور پر آزادی ملنی چاہئے۔

کبھی یہ علامت بھی بجائے اسی طرح اوپر کی سطر کے کلموں پر لکھے جانے کے، ان کلموں کی تکرار کی وجہ چھوڑ دیجاتی ہے۔

استفہامیہ (Note of Interrogation) وہ نو کے ہندسے والی سوالیہ علامت (؟)، جس کے نیچے ایک نقطہ ہوتا ہے استعمال کی جاتی ہے:

(۱) سوالیہ جملے کے آخر میں۔ مثلاً: کس سال امریکہ دریافت ہوا؟

(۲۔ ان سوالیہ حروف کے آخر میں، جو تنہا جملوں کے درمیان واقع ہوتے ہیں: مثلاً: کہاں؟ کتنا؟ کس طرح؟

انجذابیہ یا فجائیہ (Note of Interjection) وہ علامت تاثر (!) جو لگائی جاتی ہے:

۱۔ کلمات خواہش، التماس، مسرت، تاسف، تعجب، تنفر، تحسین کے آخر میں۔

۲۔ حرف ندا کے آخر سکتہ (قامہ) کے عوض میں۔

۳۔ خطاب کے بعد، مثلاً، میرے محب! مکرمی! عزیزم!

فارقہ (Dash) وہ خط فاصل ہے جو بطور تفریقی علامت کے رکھا جاتا ہے:

۱۔ جس وقت ہم ایک جملہ معترضہ کو جدا کرنا چاہتے ہیں تو جملہ معترضہ کے اول میں خط فاصل اور اس کے اختتام کے بعد سکتہ (قامہ) لاتے ہیں اور پھر علامت لکھتے ہیں۔

مثلاً: ایران کے معلم — اگرچہ ہم حقیقی معنوں میں ایران میں کوئی معلم نہیں رکھتے ہیں، — تمام ملازمین سے کم رتبہ ہیں۔

۲۔ جس وقت اچانک طور پر ایک جملہ کو قطع کرتے ہیں:

مثلاً: یا اطاعت قبول کرنی چاہیئے یا — موت،

۳۔ جس وقت ہم کہنے والے اور سننے والے کے الفاظ میں فرق ظاہر کرنا چاہیں۔

مثلاً: جس وقت معلم مدرسہ میں آیا، ایک شاگرد سے کہا: — جو شخص معلم ہونا چاہتا ہے اسکو پہلے شاگردی کرنی چاہئے — جناب...... کیا جس نے شاگردی کی ہوگی، وہ معلم ہو سکتا ہے؟

رابطہ (Hyphen) وہ خط رابط ہے، جو رکھا جاتا ہے: اس وجہ سے کہ حروف ہجا کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتا ہے اور یہ اکثر سطروں کے آخر میں واقع ہوتا ہے، کیونکہ کلمے کے ایک جزو کو پہلی سطر میں اور دوسرے جزو کو دوسری سطر میں لاتے ہیں۔

مثلاً: ز ا — موشی، خدا — ترسی......

فائدہ۔ اردو کی تحریر میں اگر یہ خط اسم ترکیبی یا مرکب امتزاجی کے اجزا کے درمیان استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

متساویہ یا متوازیہ (Equation) وہ خطوط متوازیہ (=) ہیں، جو کلمات یا تین کی تسویت یا تطابق کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں:

مثلاً: ۱۳۰۴ = ۱۹۲۵ء، مجلس ایران نے "جلالی" مہینوں کا استعمال مجبوراً اور رسماً اختیار کیا۔

بدھ مذہب والے اپنے معابد کو پیگوڈا = تبکدہ کہتے ہیں۔

بیانیہ یا تفریقیہ (Brackets) وہ قوسین یا خطوط وحدانی ہیں، جو توضیح معنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں:

جس وقت ہم کسی کلمہ یا معنے کی توضیح کرنا چاہتے ہیں، یا۔ یہ کہ ایسے کلمے یا جملہ کے درمیان لکھنا چاہتے ہیں، جو عبارت کے معنوں کے ساتھ ربط رکھتے ہوں اور ترکیب جملہ کے ساتھ مربوط نہوں۔ یعنے اگر ان قوسوں کو اس چیز کے ساتھ، جو اس میں لکھی ہوئی ہوں اٹھالیں جملہ بندی اور عبارت کے معنوں میں تغیر نہیں پیدا کرتیں۔

مثلاً: شکسپیر (۱۵۶۴ - ۱۶۱۶ء) انگریزی کا بہت ہی بڑا شاعر گزرا ہے۔ عورتوں کی تربیت (ان کے اپنے اجتماعی دائرۂ عمل میں) ہر قوم وملت کے فرائض اولیہ میں داخل ہے۔

تقدیریہ (Dots of Omission) وہ نقاط (..........) ہیں، جو لگائے جاتے ہیں:

۱۔ ایسی عبارتوں کے آخر میں، جہاں بات کو عمداً قطع کردیتے ہیں اور وہ اس موقع پر الخ۔ ، فتامل۔ ، اور علیٰ ہذا القیاس یا قس علیٰ ذالک کی جگہ پر آتے ہیں۔

مثلاً: افیون اور قمار بازی کے اشتغال کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا کہ ٹھڈے کو محتاج ہوکر ان کے ہاں اور اُن کے ہاں بھیک مانگنے لگا........

۲۔ بجائے ایسے کلموں کے، جن کا ذکر خلاف ادب ہو یا ان کو دوسری دفعہ ملاحظہ کرنے کیلئے نہیں لکھتے ہیں۔

۳۔ بجائے بعض اسماء اور القاب کے، جن کا ذکر اختصار کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مثلاً: جناب ....

ے۵ بعض موقعوں پر بجائے اس علامت کے خارقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے، جس کی مثالیں ہم اپنی کتاب "رموز املا" میں (جو ابھی زیر ترتیب ہے) پیش کرینگے۔ ۱۲

شبِ غم

(از جناب محمد مظہر اللہ صاحب صدیقی)

(۱)

بیساکھ کا مہینہ تھا اور گرمی کی شدت، رات اپنے سفر کی آدھی سے زیادہ مسافت ختم کر چکی تھی، دنیا پر سکون و خاموشی کی حکومت تھی، بھارت کے ہر خوش نصیب سپوت کو پرماتما کی بخشی ہوئی دو نعمتیں میسر تھیں، آنکھوں میں میٹھی نیند تھی اور دل شانتی کی دولت سے مالامال تھے لیکن آہ! میں قدرت کی ان دونوں نعمتوں سے محروم تھی، بے نصیب تھی، اُن کی یاد مجھے بیقرار کر رہی تھی، میں بے چین تھی سخت مضطرب تھی، کمرہ میں ٹہلتی رہی، حالانکہ برقی پنکھا کمرہ کو ہوادار بنانے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مصروف تھا، لیکن مجھے گرمی معلوم ہو رہی تھی، پائین باغ میں نکل آئی اس خوبصورت حوض کے کنارے کھڑی ہو گئی جس کو چند مہینے پیشتر انہوں نے بنوایا تھا۔ حوض کے چاروں طرف چار قسم کے پھول مہک رہے تھے، ایک جانب خوش رنگ گلاب کا تختہ تھا، دوسری طرف خوبصورت موتیا، سامنے چنبیلی کا منڈوا اپنی بہار دکھلا رہا تھا، اور پیچھے کیوڑہ کے درخت عطر بیزی کر رہے تھے، قندیل فلک روشن تھی، جس نے دنیا کو نور کی چادر اڑھادی تھی، آسمان پر ابر کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا نورباف آسماں کی پرانی چادر کے پھٹے ہوئے ٹکڑے فضائے نیلگوں میں پراگندہ ہو گئے ہیں۔ چاند آنکھ مچولی کھیل رہا تھا، کبھی ان کی اوٹ میں چھپ جاتا اور کبھی نمایاں ہو جاتا، اور نزدیک کی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی، رصد گاہِ نظامیہ کے فلک بوس گنبد، ایک خاص منظر پیش کر رہے تھے۔ کتنا سہانا وقت تھا! کیسا دلفریب سماں تھا! کسقدر دلچسپ نظارہ تھا! قدرت کے پرستار کے لئے کیا کیا سامان فرحت مہیا تھے! پر، آہ! مَیں تو "اُن" کی پجارن ہوں، "اُن" کی پجارن کے لئے "اُن" کے بغیر یہ دل آویز منظر سامانِ مسرت وتسکین بن سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز، نہیں، دنیا روشن تھی، لیکن میری دل کی بستی میں تاریکی کارفرما تھی، چاند کھِلکھِلا کر ہنس رہا تھا لیکن میں رو رہی تھی، غنچے چٹک رہے تھے، مگر، آہ! میرا غنچۂ دل بند تھا، کوئی چیز میری ہم نوا نہ تھی، بس ایک فوارہ تھا جو میری ہم نوائی کر رہا تھا، وہی میرا غمگسار تھا، اور وہی

درد آشنا میں رو رہی تھی، وہ بھی رو رہا تھا۔ اس کا پانی کچھ اس طرح پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ گویا وہ میرے قلب مضطر کے ساتھ عملی ہمدردی کر رہا ہے۔ چاندنی رات تھی، لبریز حوض تھا، فوارہ جاری تھا، پھول مہک رہے تھے، حسین منظر تھا، دلچسپ سماں تھا، غرض سب کچھ تھا۔ لیکن "وہ" نہ تھے۔ اس لئے کچھ نہ تھا، میں "اُن" کے دھیان میں تھی "وہ" میرے دل میں تھے! "وہ" عنقریب ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے ولایت جانیوالے تھے، "انہوں" نے منت مانی تھی کہ انگلستان جانے سے پیشتر "وہ" کاشی جی کے درشن کے لئے جائیں گے۔ بس اسی کی خاطر "وہ" بنارس گئے تھے، روزانہ ایک خط "اُن" کا ضرور آجایا کرتا تھا، چنانچہ آج بھی ایک خط بنارس سے آیا۔ جس میں "انہوں" نے اسی روز وہاں سے روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تھا، لیکن ہائے! پرسوں کے تار نے سب کو پریشان کر دیا، اس تار نے میرے خرمن امید پر بجلی گرادی، یہ تار وہاں کے کسی پنڈت نے بھیجا تھا، کہ .... "(وہ) اپنی قیام گاہ کی چھت سے گر گئے اور اسی کے صدمہ سے سورگ کو سدھار رے"......... میں ان ہی خیالات میں مستغرق تھی کہ پریم کے رونے کی آواز آئی جس کو میں جھولے میں تنہا چھوڑ آئی تھی، میں دوڑی ہوئی کمرہ میں گئی، اور اس کو تھپک کر سلا دیا، کمرے میں آئی تو بجلی کا چراغ بجھا ہوا تھا، پنکھا بھی ازخود بند ہو چکا تھا، شاید برقی رو (الکٹرک کرنٹ) میں کچھ خرابی آگئی ہوگی، تاہم روشن چاند کی نورانی کرنیں کھلے ہوئے دریچہ کی راہ داخل ہو کر کمرہ کو اجاگر کر رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر "اُن کی تصویر آویزاں تھی۔ یہ "اُن" کی سب سے آخری اور بہترین تصویر تھی۔ میری نظریں اس پر جم گئیں، میں آسمان کے چاند کی طرف بھی دیکھتی تھی اور "اپنے چاند" کی طرف بھی، جو حسن "اُن" کے چہرہ پر تھا، اس سے چاند محروم تھا، جو موہنی "اُن" کی صورت میں تھی، بھلا چاند کو کہاں نصیب ہو سکتی! جو شیرینی اور مٹھاس "اُن" کی رفتار میں تھی، اس سے مہتاب کی گردش کو کیا نسبت؟ میں دیکھتی رہی اور بہت دیر تک "اُن" کی نورانی صورت کو دیکھتی رہی ــــ ٹن،....ٹن،....ٹن،.... تین بجگئے۔ ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی، لیکن مجھے نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ میں پلنگ پر بیٹھ گئی، اب میری نگاہوں کے سامنے اسی مقدس مندر کا فوٹو تھا، جس کے درشن کے لئے "وہ" گئے ہوئے تھے، میں کاشی جی کو دیکھکر بھگوان کا دھیان جمانے لگی، آنسوؤں کی گنگا میں آشنان کرتے ہوئے، میں ایشور سے پرارتھنا کرنے لگی، یکایک مجھ پر بے خودی سی چھا گئی، اور چند ہی لمحوں میں اوروں کیطرح

مجھے بھی لیلائے شب نے اپنی پرسکون آغوش میں لے لیا.......

(۲)

میں باغ میں پھول توڑ رہی تھی، قسم قسم کے پھول جمع کر رہی تھی، چند خوشنما گلدستے بھی تیار کر لئے، جب وہ آئینگے تو "اُن" کے سامنے لیجاؤنگی، چند ہار بھی بنا لئے، کیونکہ "وہ" میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہار بہت خوشی سے پہنتے ہیں، بہت سے پھول چاندی کے تھال میں الگ رکھدیئے تاکہ "اُن" کے آگے پیش کروں،......... سنو، ہارن کی آواز سنو! شائد اُن ہی کی موٹر ہوگی، .... "آپ" کہاں تھے؟..... اتنے دن سے؟ لوگ..... آپ کے دشمن، کہ رہے تھے کہ، بھگوان نہ چاہے، آپ بیکنٹھ سدھارے!" وہ مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھے، اور فرطِ محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اُن" کے ہاتھ اس قدر نرم و نازک تھے کہ گویا ریشم سے میرے ہاتھ مس ہو رہے ہیں۔ میں "اُن" کے مدت کے بعد ملنے سے مارے خوشی کے دیوانی بن رہی تھی، میں نے "اُن" سے پوچھا سچ بتائیے، کیا آپ زندہ ہیں؟" — "ہاں، میں زندہ ہوں، تب ہی تو آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے مرنے کی خبر کسی نے غلط مشہور کر دی ہوگی" — "کیا آپ درحقیقت زندہ ہیں؟......... پرماتما کرے ایسا ہی ہو،...... کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے، شاید میری بہکی بہکی باتوں کا مذاق اڑا رہے ہونگے،......

بہر حال "اُن" کے درشن سے مجھ پر مسرت کی برکھا ہو رہی تھی، میرا دل باغ باغ تھا، — ان کو اپنے گلے میں میرے بنائے ہوئے ہار بہت اچھے معلوم ہوتے تھے، مجھے اپنے ہاروں کی قیمت اسی وقت ملتی تھی، جب وہ "ان" کے گلے میں آویزاں ہو جاتے تھے،......... "وہ" ہارمونیم کے پاس جا پہنچے، گانے کے بڑے شوقین تھے،۔ ہارمونیم بجاتے بجاتے آہستہ آہستہ کچھ گانے بھی لگے یہ "اُن" کی مقبول غزل تھی جس کو وہ اکثر ہارمونیم پر گایا کرتے تھے،۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایکبار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

....

کیا ہی سریلی آواز ہے۔ پرمیشور کی قسم "ان" کی آواز میں ہارمونیم کے ترنم سے کہیں زیادہ

شیرینی تھی، گویا "ان" کی زبان پر سرسوتی کا باس ہے۔ ...... نہیں معلوم "وہ" کب چلے گئے، نہ مجھے خبر بھی نہوئی، چپکے سے چلدئے۔ اب آئیں گے تو "اُن" کو جلنے نہ دونگی، ہرگز جانے نہ دونگی، ...... پرماتما کا شکر! آپ "جلد آگئے، مجھے تو امید نہ تھی ...... اتنی جلد واپسی کی"۔ "میں تو آپ سے کچھ عرصہ کے لئے جدا ہونے کی اجازت لینے آیا ہوں"۔ رویئے نہیں۔ اس سے میرا دل دکھتا ہے۔ بعض احباب انتظار کر رہے ہوں گے، اُن سے ملنے کا قصد تھا۔" میں زبان سے تو کچھ جواب نہ دے سکی، ہاں ممکن ہے "انہوں" نے میرے آنسوؤں سے میرا منشا پالیا ہو۔ میں نے "اُن" کے قدموں پر اپنا سر رکھدیا۔ میرے آنسو "ان" کے پیروں کو دھو رہے تھے۔ باوجود "ان" کے منع کرنے کے "ان" کے پیروں کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، تاکہ "وہ" اپنے اس ارادہ سے باز آجائیں۔ باہر نہ جائیں، اس قسم کی جسارت میں نے آجتک نہیں کی تھی، لیکن اس وقت ایسا کر رہی تھی تو صرف اس وجہ سے کہ دل غمزدہ کو اب تاب جدائی نہیں، ایشور نہ چاہے کہ "وہ" کبھی ہم سے جدا ہوں ...... "وہ" خاموش کھڑے رہے، شاید میرے غم کا "ان" کو احساس ہو رہا تھا، "اُن" کی خاموشی پر میں نے "اُن" کے پیروں کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا ......

(۳)

دن چڑھ گیا تھا۔ اماں مجھے اٹھا رہی تھیں، ان کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سوز دروں سے بے خبر اماں متعجب تھیں کہ میں نے اپنے سرہانے کے تکیہ کو اس قدر مضبوطی سے کیوں پکڑ لیا ہے؟

لب خاموش

(از جناب بدر الدین خان صاحب شکیب متعلم بی اے کلیہ جامعۂ عثمانیہ)

یوں تو دل میں ہے مرے دریا نہاں جذبات کا
موج بنکر ساحل لب تک نہ آیا مدعا

غنچہ کو ہے انتظارِ آمدِ بادِ نسیم
یا امیدِ جلوہ میں خاموش ہے رازِ کلیم

ہے وہ طوفانِ معانی میرے ہر انداز میں
جو جھلکتا ہے حسینوں کی جبینِ ناز میں

کچھ اسی طرح تڑپ کر آہ بہنجاتا ہوں میں
آنسوؤں سے کوہِ غم کو اپنے پگھلاتا ہوں میں

آئینہ ہوں میں خوشی کا رنج کا مسکن کبھی
میری جنبش میں تبسم ہے کبھی شیون کبھی

کرنل میکنزی

کا

مجموعۂ ادبیاتِ مشرق

(از جناب ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری ۔ زورؔ، ایم۔اے (عثمانیہ) ایم آر۔اے۔ایس، ایف۔آر۔ایس۔اے (لندن)

یعنے لفٹننٹ کرنل کالن میکنزی، سروے یر جنرل آف انڈیا۔ کے مخزونہ مخطوطوں اور اشیا کا تفصیلی تذکرہ مولفہ ''ہ''، ''ہ'' لسن اسکوائر۔ سکرٹری۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ بنگال۔ دو جلدیں۔ مطبوعہ ۱۸۲۸ء ایشیاٹک پریس۔ کلکتہ۔

اس تذکرہ کے شروع میں مؤلف (ولسن) نے جو بسیط دیباچہ کرنل موصوف کے مجموعہ کے متعلق لکھا ہے اس میں پہلے کرنل کا ایک خط نقل کیا ہے جو سر الگزنڈر جانسٹن کے نام ۱۸۱۷ء میں لکھا گیا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کرنل نے جو وسیع مدت ہندوستان میں گزاری اس کا زیادہ تر حصہ سفر میں گزرا اور اس سفر میں انہیں ہندوستان خصوصاً دکن کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ ۱۷۹۶ء سے انہیں اس امر کا خیال پیدا ہوا کہ ان معلومات کو عملی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ اور اس کا بہترین طریقہ، انہوں نے یہ اختیار کیا کہ جو چیز اپنے مذاق کی نظر آتی وہ اسکو حاصل کرکے محفوظ کر لیتے۔

میسور کی لڑائی اور سرنگا پٹم کی صلح (۱۷۹۲ء) کے بعد کرنل میکنزی کو لارڈ کارنوالس نے حیدرآباد دکن روانہ کیا جہاں انہیں ریاست نظام کے جغرافیہ کی ترتیب دینی تھی، وہ وہاں کئی سال تک رہے اور اس اثنا میں، معلوم ہوتا ہے کہ، انہیں اپنے کام کیلئے بہت زیادہ محنت کرنے کے علاوہ سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔

انہوں نے ۱۷۹۶ء میں ایک جغرافیہ مرتب کرکے سرکار انگریزی میں پیش کیا جس پر ۱۷۹۷ء میں انہیں کچھ اور اضافے کرنے پڑے۔ خصوصاً ۱۷۹۸ء میں جب وہ تیسرے بار حیدرآباد گئے تو انہیں نظام کے فارسی دفتر کے انگریزی ترجموں کی وجہ سے بہت مدد ملی۔ ۱۷۹۹ء میں جب ٹیپو سلطان سے انگریزوں کی لڑائی شروع ہوئی تو کرنل کا حیدرآباد سے

متعلق سب کام بند ہوگیا۔ اور پھر غالباً اس کے بعد انہیں حیدر آباد جانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ کیونکہ میسور کے فتح ہو جانے کے بعد انہیں اسی علاقہ میں متعین کر دیا گیا۔

کرنل ۱۸۲۱ء تک زندہ رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے ہندوستان کے متعلق ایک بیش بہا خزانہ جمع کرلیا۔ مگر اس خزانہ میں زیادہ تر مواد ہندو عناصر پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کی اشیا بہت کم جمع کی گئی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کرنل کو مسلمانوں کی کتابیں اور دوسری قابل قدر چیزیں بہت کم دستیاب ہوی ہوں۔ چند سکوں اور مخطوطوں کے علاوہ کرنل میکنزی کا مجموعہ اسلامی اشیاء سے خالی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل کے مجموعہ سے دکن کی ہندو طرز معاشرت، تاریخ، مذہب اور ادب پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ کرنل کی ان تحریروں کے موضوع بھی، جو برٹش میوزیم میں موجود ہیں، انہی امور سے متعلق ہیں اور وِلسن نے اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد جو روداد لکھی ہے اس سے بھی اِن موضوعوں کے متعلق خاصہ مواد جمع ہو گیا ہے۔

کرنل کی وفات کے بعد جو شخص ان کے عہدہ پر مامور ہوا وہ قطعاً کرنل کا ہم مذاق نہ تھا اس نے اس بات کی خواہش کی کہ یہ عجیب وغریب مجموعہ جلد سے جلد اس کی ذمہ داری سے علحدہ کرلیا جائے۔ وِلسن نے جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے اس وقت معتمد تھے، اس مجموعہ کو اپنی زیر نگرانی لینے کی خواہش ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کے روبرو پیش کی جو منظور کر لیگئی۔

خوشی کی بات ہے کہ کرنل کے مجموعہ کا وِلسن نے نہایت عمدگی سے استعمال کیا اور جو فہرست تفصیلی مرتب کی ہے وہ درحقیقت سخت محنت اور کدوکاوش کا نیتجہ ہے۔

دیباچہ میں وِلسن نے ادب کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کے ضمن میں اردو اور ہندی پر بھی ایک معمولی سی بحث کی ہے۔ جو اُس زمانہ کی معلومات کے لحاظ سے یقیناً قابل قدر ہے۔ آخر میں انہوں نے اردو مخطوطات کی نسبت لکھا ہے کہ بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ قابل قدر نہیں۔ البتہ فارسی کے مخطوطوں میں بعض ایسے ہیں جن سے دکن کے حکمران خاندانوں کی تاریخ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ قابل قدر ہیں۔

میکنزی کے مجموعہ میں کل ۱۵۶۸ کتابیں شامل تھیں جن میں سے عربی اور فارسی کی کتابیں ۱۱۴ اور اردو کی کل ۸ ہیں۔

اردو کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے جو پروفیسر وِلسن کی دوسری جلد کے صفحات

۱۴۵ اور ۱۴۶ پر مندرج ہے۔

(۱) تاریخ شیر شاہی

آکیتو۔ شکستہ آمیز

شیر شاہ کی فارسی تاریخ مولفہ عباس شاہ جو اکبر کے حکم سے لکھی گئی تھی یہ اس کا اردو ترجمہ ہے کپتان موات (Mouat) کے حکم سے مظہر علی خاں ولا نے کیا۔

(انڈیا آفس ۴۱ صـ ۲۰)

(۲) آرایش محفل

(مطبوعہ) رائل کوارٹو۔ نستعلیق

دہلی کے ہندو بادشاہوں کی تاریخ۔ یدہشٹر سے لیکر رائے پتھورا کے زمانہ تک۔

مولفۂ میر شیر علی افسوس

'Appendix to Roebucks'
Annals of the College Page 22

(انڈیا آفس ۳۹ صـ ۱۵)

(۳) جنگ نامہ راؤ بھاؤ

آکیتو۔ شکستہ آمیز

پانی پت کی لڑائی کا ذکر نظم میں۔ مصنف کا نام کا پتہ نہیں چلتا۔ زبان دکھنی ہے۔

(انڈیا آفس ۳۷ صـ ۱)

(۴) ظفر نامہ

آکیتو۔ نستعلیق

محمد حنیف فرزند علی کی فتوحات یزید پر۔ ہندی نظم میں۔ مولفۂ آزاد باشندۂ حیدرآباد۔

(۵) گلشن عشق

آکیتو۔ نستعلیق

عشقیہ نظم۔ جس میں منوہر اور مدھو مالتی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ تین نسخے ہیں۔ اس کا مصنف دکن کا مشہور شاعر شیخ نصرت، نصرتی ہے۔ جو عادل شاہوں کے دور میں گذرا ہے۔

(اسٹورٹ ۱۳ و ۲۷۹ صـ ۲۷۹۔ برٹش میوزیم ـ ۴۵ ـ اسپرنگر ۳۶۰۔ ایتھے ۹۴۳۲)

(۶) قصہ پدماوتی

آکیتو۔ نستعلیق

رتن سین بادشاہ چتور اور پدماوتی، دختر گاندھرب سین شاہِ لنکا کے عشق کا قصہ غلام علی کا تصنیف کردہ۔

(انڈیا آفس ۲۷۰۲ صہ ۳۶ ۔ اسٹیوارٹ ۱۱ صہ ۱۸۰)

(۷) رامائن

دو جلدیں ۔ آکیٹو نستعلیق

رامائن کا پوربی بھاشا میں ترجمہ از تلسی داس۔

APPENDIX To ROEBUCK'S ANNALS, PAGE 27

(۸) نرمل گرنتھ

آکیٹو ۔ نستعلیق

کتاب الصفا کے پہلے چار ۔ لکچر ۔ سکھوں کے ایک بڑے طبقہ کے مذہبی عقائد پنجابی بولی میں

ان اردو کتابوں کے علاوہ اس مجموعہ میں جو فارسی کتابیں دکنیات سے متعلق تھیں انکی تفصیل یہ ہے ۔

(۱) مخطوطہ نمبر ۴ ۔ تاریخ ہفت کرسی و خلاصتہ التواریخ

پہلی کتاب تاریخ بیجاپور ہے جو سات بادشاہوں یعنے یوسف بیگ عادل شاہ بانی سلطنت سے علی عادل شاہ آخری آزاد حکمران خاندان تک کے زمانہ پرحاوی ہے ۔ موخر الذکر حکمران کی فرمایش پر اسد خان لاری نے تصنیف کی ۔ (دوسری کتاب ہمارے کام کی نہیں ۔ زور)

(۲) مخطوطہ نمبر ۵ ۔ تاریخ علی عادل شاہ

چھوٹا آکیٹو ۔ نستعلیق

علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ حکومت کے ایک حصہ کی تاریخ ۔ مولفہ سید نوراللہ[لہ] اس کی اور اس سے پہلے کی کتاب کی اہمیت اسکاٹ کی تاریخ دکن کے حسب ذیل جملوں سے واضح ہوتی ہے ۔

"ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بعد کے عہد کی تاریخ کے متعلق مترجم نالاں ہے کہ بہت مختصر ہے ۔ لیکن اس سے زیادہ تفصیلی واقعات نہیں حاصل کئے جاسکتے تھے اگرچہ ان کے حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ۔" (جلد اول صفحہ ۲۴۲)

لہ اردوئے قدیم مطبوعہ تاج پریس ۔ صہ ۶۹ پر اسکا نام سہو نظری کی وجہ سے سید نور اسد لکھا گیا ہے ۔ "مدیر"

(۳) مخطوطہ نمبر ۱۵۔ **تاریخ قطب شاہی**

فولیو۔ نستعلیق

قطب شاہی بادشاہوں کی (بانی سے لیکر محمدؐ قلی قطب شاہ تک) منظوم تاریخ۔ مؤلفہ ہیرالال خوشدل منشئ حیدر قلی خاں۔

اس کتاب کے متعلق، معلوم ہوتا ہے کہ، میجر اسٹوارٹ کو علم نہ تھا۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی کتاب وقائع حکمران گولکنڈہ کے لئے صرف "لب التواریخ" سے مواد حاصل کیا ہے۔ دیباچہ صفحہ (۵)

(۴) مخطوطہ نمبر ۱۸۔ **حقیقت ہندوستان**[۱]

ہندوستان اور دکن کے تاریخی حالات، گوشوارہ مال، محاصل اور اعداد شمار پر مبسوط کتاب ہے۔ لکشمی نارائن شفیق اورنگ آبادی فرزند منسارام دیوان نظام الملک، اس کے مصنف ہیں۔

(۵) مخطوطہ نمبر ۲۰۔ **وقائع گولکنڈہ وغیرہ**

آکٹیو۔ نستعلیق

گولکنڈہ اور حیدرآباد کے خلاف اورنگ زیب کی مہمات کا ایک ہجویہ بیان[۲] مولفہ نعمت خان عالی۔

(اس کے ساتھ کے دوسرے اجزا ہمارے کام کے نہیں۔ زور)

(۶) مخطوطہ نمبر ۲۱۔ **وقائع گولکنڈہ و دیباچہ شاہنامہ وغیرہ**

آکٹیو۔ نستعلیق

متذکرۂ بالا کی طرح یہ بھی نعمت خان کا کارنامہ ہے۔

(۷) مخطوطہ نمبر ۲۵۔ **مآثر آصفی**

کوارٹو۔ نستعلیق

بانی حکمرانان حیدرآباد آصف جاہ نظام الملک بہادر کے سوانح حیات اور ان کے جانشینوں کی تاریخ ہے۔

مولفۂ لکشمی نارائن شفیق اورنگ آبادی۔ سنہ ۱۲۰۷ھ

۱؎ اس کتاب کا اصل نام "حقیقت ہائے ہندوستان" ہے۔ یہ اس کا تاریخی نام بھی ہے جس سے سنہ ۱۲۰۴ھ برآمد ہوتا ہے، اس کی تصدیق خود کتاب سے ہوتی ہے۔ اس کے اور مخطوطہ نمبر ۲۵ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ تجلی جلد ۲ نمبر ۲۔

۲؎ ملاحظہ ہو "محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن" صفحہ ۲۵ و ۲۶۔

(۸) مخطوطہ نمبر ۵۴ — **قصہ فیروز شاہ**

اکثیو ۔ شکستہ

فرزند شاہ بدخشاں فیروز شاہ کا قصہ ۔ جس نے بیمار کو اچھا کرنے کی غرض سے ایک عجیب پھول حاصل کیا ۔

(۹) مخطوطہ نمبر ۵۵ — **قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال**

اکثیو ۔ نستعلیق

سلیمان پیغمبر کے زمانہ کے ایک مصری بادشاہ زادہ کا قصہ اس کا تعشق جنوں کے بادشاہ کی لڑکی کے ساتھ ۔ قصہ مثنوی میں ہے ۔ اسکا مصنف قطب شاہی دور کا شاعر غواصی ہے (انڈیا آفس ۹۹ ص ۵۲ ۔ برٹش میوزیم ص ۴۷

(اسی جلد میں قصہ لیلی و مجنون مولفہ ہاتفی کا بھی کچھ حصہ اور وقائع جگناتھ و پند نامہ سعدی بھی موجود ہیں ۔)

---

*

ہندی حسن کاری کا اثر چین اور جاپان پر

(از جناب عترت حسین صاحب زبیری، متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

ایک مصنف کا قول ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کی نمایاں ترین خصوصیت درجہ بندی ہے اور اس عہد کو "عہد درجہ بندی" کہنا موزوں ہوگا۔ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو سائنس، مختلف علوم اور حسن کاری کی جدید اختراعات اور انکشافات میں ہر قدم پر درجہ بندی سے سامنا ہوتا ہے۔ کسی علم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنے کا مقصد نہ صرف اس کی ابتدائی منازل کو جو تاریکی میں نہاں ہیں بے نقاب کرنا ہوتا ہے۔ بلکہ تحصیل و مطالعہ میں آسانیاں بہم پہنچانا بھی لیکن عجیب اتفاق ہے کہ حسن کاری کے مغربی اصول درجہ بندی مشرقی حسن کاری پر صادق نہیں آتے۔ مشرقی حسن کاری کو جغرافی زنجیروں میں جکڑ دینا اشیاء کی روح کو مقید کر دینا ہے۔ جاپان، چین و ہندی حسن کاری ایک قالب کی مختلف شکلیں ہیں۔ لہذا کسی ایک خاص ملک کی حسن کاری کو سمجھنے کے لئے تمام مشرقی حسن کاری کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

حسن کاری کے ارتقاء اور اس کی تکمیل میں قوموں کی بتدریج ترقی کی جھلک ہر ہر قدم پر نمایاں ہے۔ فنون لطیفہ کی تکمیل قوم کی ذہنی اور دماغی ترقی کی ایک بین دلیل ہے۔ غلامی قومی زندگی میں جمود پیدا کر دیتی ہے۔ غیر ملکی اثرات قبول کرنے کا رجحان ترقی پذیر ہوتا ہے۔ اختراعات جدیدہ بالکل معدوم ہو جاتی ہیں اور اپنی گم کردہ عظمت کو فراموش کر دینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے؛

لیکن قوموں کی بیداری کے ابتدائی منازل میں جو امر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے وہ ماضی کے طرف واپسی ہے۔ یہ تمام مراحل ہندوستان کو بھی طے کرنے پڑے ہیں۔ ہمارے ذہنی ارتقاء میں ایک جمود پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن زندگی کے آثار نمودار ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ ہم نہ صرف عہد اسلام کے عظیم الشان کارناموں کی طرف متوجہ ہو چلے ہیں بلکہ ہندوستان کی قدیم عظمت پر بھی بجا طور پر نازاں ہیں۔

ہندی حسن کاری اشوک اعظم کے عہد زریں میں درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اسی کے عہد حکومت میں ہندوستان نہ صرف مذہبی اعتقادات کا سرچشمہ بنا ہوا تھا بلکہ اس کے تہذیبی اثرات

(۷۰) کیا کہوں اقبال تیرے دیں پناہا روز رزم
جلوہ گر میداں میں ہو جب نشان زر فشاں

فوج اعدا کی سیاہی یوں نہ چھپے پل مارتے
طلعت خورشید سے جس طرح شب ہووے نہاں (۷۱)

جس کا انبوہ کبھو ہوتا نہیں عدد فصل کا
کیا کروں رنگینی افواج کا تیرے بیاں

موسم برسات میں جیسے امنڈتے ہیں سحاب
جو طرف سے دستہ دستہ اس طرح ہوویں رواں

صدمۂ سم ستم سواروں سے لرزتی ہے زمیں
گرد لشکر سے ملے چشم کواکب آسماں

جن و انساں بولتے ہیں ذالک یوم النشور
شور حشر سے ہم کر تقاضائے رزم کا ہووے عیاں

نقش مار آتش جہت میں ہے تری قیال کے
اڑ گیا منصوبہ زرّاد فلک کا تختہ سال

رعب سے چہرہ کو جیسا ششدر و نالہ روا
اس طرح دشمن کو تیرے فوج گھیرے درمیاں

بیدق شطرنج کی تیرہ کو پہونچے شاہ کے
کج خرامی سے اگر فرزیں کا ہووے ہمعناں

جز دغل بازی نہیں تیرے عدو کی کچھ بساط
مات ہونیکی سوا رخ کو دکھاتا ہے کہاں

(۸۰) سر مخالف کا تراشے ہے ترا اک غلام
تاج شاہی زیب دے ہے تجھکو ای فخر زماں

آیۂ نصر من اللہ۔ سورۂ فتح مبین
واسطے تائید کے تیرے ہمیشہ ہے عیاں (۸۱)

دشمنوں کے دم بدم پامال سر ہو جاویں جہاں
فوج دریا موج تیری جس طرف ہووے رواں

شادیانوں کی تری پہونچی ہے نوبت تا فلک
دل کشی کا اُن کی آوازہ ہے تا افلاک یاں

تو ہے خورشید اور عماری ہو بہو برج حمل
مثل ماہ نو کجاک اور فیل گویا آسماں

کیوں نہ ہووے عید نوروز اسمیں تجھکو دیکھکر
خلق کرتی ہیں لیے شہ قرباں ہے انس و جاں

وہ عماری مکلل، اور فیل باشکوہ
وہ ستاروں کی چمک وہ زرد باجوں کہکشاں

بھول جاوے دیکھکر جسکو تری باغ ارم
اسقدر رشک ہے اُسکی رنگ آمیزی کی شاں

عہدہ داروں سے جلوں میں ہے شگفتہ صد چمن
روبرو بیٹھا ہیں اسکے ہو بہو سرو رواں

اُسکی اب وصف و ثنا میں فکر قاصر ہو گئی
غیر اس مضموں کے شاہا کیا کہے میری زباں

(۹۰) گلشن کشمیر میں بنگلہ مرصع کار ہے
ہیئت مجموع سے یوں حسن اُس کا ہے عیاں

ہے بجا بطبوع تجھ کو وہ عماری زرنگار
کون قائم ہے کیا اللہ نے جسکا بیاں (۹۱)

اُس عماری بیچ تجھ کو دیکھ ہاتھی پر سوار
کام کرتا ہے یہی وہم خیال شاعراں

ذات والا ہی تری گویا کلیم بے نظیر
طور سینا فیل وہ اورنگ تجلی ہے عیاں

جلوہ افروزی تری ہیں کیا کہوں حوضے کے بیچ
ماہ تاباں جس طرح ہالہ میں ہو بر آسماں

اور خواصی میں تری نو نو بہادر کی نشست
جسقدر ہے زیب افزا کیا کروں اسکا بیاں

بے شک و لاریب یہ برجیس و بہرام فلک
نیر اعظم سے پائے ہیں سعادت کیسے قراں

حشر تک یہ دولت و اقبال قائم کیوں نہ ہو
ہیں ترے اعیان دولت کا بہتر از سیارگاں

نامۂ عالی یہ مہر خاص روشن مثل مہر
کب نہ ہو ممتاز منشی جیوں وزیر آسماں

بہتر از شان و شکوہ فرق دارائے حج خو
ہے سواری میں تری ماہی مراتب بے گماں

(۱۰۰) اسقدر رکھتی ہیں صولت ساتھ نقارے ترے
شور جسکا غلغلہ افگن ہے تا ہفت آسماں

ذکر تیرے رزم کا جوں چاہیئے کب ہو سکے
بزم آرائی کا تیری کیا کروں اب میں بیاں

جام جم ہے دیدۂ لبریز حسرت جسکو دیکھ
خون دل اُس کاوس و کے ہوئے ہیں جسد سے ہر زماں

غیرت باغ ارم تیرا ہے وہ عشرت محل
جس کا ہر اک طاق رشک چشم ابروئے بتاں (۱۰۱)

شامیانہ ہے تری مسند پہ ہاں اُس ٹھاٹ کا
چتر شاہنشاہی میں بھی یہ شان و شوکت کہاں

اسقدر ہے جابجا رنگیں لباسوں کا ہجوم
جس طرف دیکھو تو ہے رشک بہار گلستاں

ہر جگہ ہے جشن کا آئین دکانوں نشاط
ساز عشرت سے مہیا ہر محل ہر مکاں

ہر روش اور ہر خراماں میں بصد ناز و ادا
گلبدن غنچہ دہن رشک پری سرو رواں

اسقدر ہے شعلۂ آواز حسن دلفریب
پھونکتے ہیں شمع و گل کو بلبل و پروانہ یاں

دایرہ میں بزم کی ہر اک مقام اُٹھے کے بیچ
تیری آہنگ نوازش سے ہے ہر دم شادماں

(۱۱۰) جس گھڑی تو مسند عالی پہ فرماوے جلوس
دیکھکر روشن ہو مہر و مہ سے چشم آسماں

ہمت عالی کی تیری مجھسے کیا توصیف ہو
بخشنے دیتا ہے ادنا ادنی کو گنج شایگاں

اسقدر تیرے شمس اللہ دریا دل کیا
موتیوں سے جیوں صدف سائل کا بھردے ہے دہاں

بس کہ تیرے فیض نے بخشا یہاں تک لعل و دُر
شرم سے اس رنگ کو پہنچی ہیں سینے بحر و کاں (۱۱۱)

خاک میں یکلخت بس گئے معدن الماس و لعل
پانی پانی ہو گئی گوہر کے بحر بیکراں

تیرے بندوں کو نہیں اکسیر خالص سے غرض
سنگ پارس سے ترا بہتر ہے سنگ آستاں

گر محاسب تجھ ثنا میں اب اقل مرتبہ
ہر احاد اوپر بڑھا کر صفر ذرات جہاں

جز و مد کرتا ہے اکثر وہ تا روز شمار
تب بھی ہو سکتا نہیں عشر عشیر اسکا بیاں

(۱۱۸) نام رکھ کر اس قصیدہ کا "جلوس اصفی"
دیں پناہا ختم کرتا ہو دعائیہ یہ یاں

دوستوں کا دیکھ تیرے منہ بہ رنگ صبح عید
غرق حیرت دشمناں جیوں دیدۂ قربانیاں (۱۱۹)

مسٹر اوکاکورا نے جاپانی حسن کاری کی تشریح نویں صدی عیسوی میں کرتے ہوئے اس امر کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ وہ تحریک جو چینی دماغوں کے رگ و ریشہ میں سرایت کر رہی تھی وہ صرف بدھ کی ہمہ گیر تعلیم ہی نہ تھی بلکہ اس کا ایک اہم جزو لاینفک ہندی تہذیب اور خیالات تھے چینی ذہنیتوں کو ہندی رنگ میں رنگنے کی کوشش بدھ مت نے کی۔ جب جاپان میں آزادی کے آثار نمودار ہوئے اور قومی زندگی کا احساس پیدا ہونے لگا تو حسن کاری نے بھی اپنے ابتدائی منازل طے کرنے شروع کر دیئے۔ اور اپنے ہمسایہ چین سے ہندی اثرات حاصل کیئے۔

جدید جاپان کی حسن کاری مشرقی روایات اور قومی محسوسات کی پوری طرح حامل ہے۔ مشرقی حسن کاری میں شخصیت کو ایک اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کے لئے فنا کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مغرب کی طرح چند حسین پھول اور چہچہاتی چڑیاں مشرقی ذہنیت کو تسکین نہیں دے سکتیں۔ بلکہ ایک اژدہے کا خوفناک تخیل اور خود موت کی پرستش وہ عظیم الشان نظائر ہیں جنکا پرتو بھی۔ مغربی دماغ پر نہیں پڑا۔ اور جن کا صرف مشرقی دماغ ہی متحمل ہو سکتا ہے اپنی ہستی کا دوسروں کو زندہ رکھنے کے لئے فنا کر دینا حسن کاری کا منتہائے عروج ہے اور یہ تمام مشرقی خصوصیات، جاپانی حسن کاری میں نمایاں ہیں۔ اس طرح جاپان نے خیالات کے طرز ادا کے لئے طریقے چین سے اور حسن کاری کی روح ہند سے حاصل کی۔

برخلاف یونان کے جس نے اپنی شخصیت کو یورپ سے بالکل علیحدہ رکھا تھا زمانہ قدیم میں ہندوستان نے اور عہد جدید میں جاپان نے مشرقی حسن کاری کی عام خصوصیات کو کامل طور پر برقرار رکھا ہے۔ اسی طرح جاپانی حسن کاری، مشرقی حسن کاری کا صحیح مظہر ہے۔

مشرق سے جمود کی کیفیت رفع ہو رہی ہے۔ ہندوؤں میں بھی قومیت کے احساسات کی لہریں نمو پا رہی ہیں۔ اور ان کو اپنی گم کردہ عظمت کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی جدید حسن کاری ترکی، ایرانی و چینی اثرات کو جو مغل اپنے ساتھ لائے تھے قبول کر چکی ہے مغربی اثرات اپنا کام کر رہے ہیں۔ اسطرح امید قوی ہے کہ آنے والی نسلیں ہندوستان کی قدیم روایات کو زندہ کر کے ان میں ایسی قوی روح پھونکینگی جو ہند کو نہ صرف مشرق بلکہ مغرب کا بھی حقیقی رہنما بنا دیگی۔

بادۂ دکن

شیر محمد خاں ایمان

(۲)

(قصیدہ در مدح خسروِ ششں صوبۂ دکن یعنی میر نظام علی خان بہادر)

ایمان کا کلیات، تقریباً تمام اصناف سخن سے مملو نظر آتا ہے، حمد و نعت منقبت کے ساتھ قصائد مدحیہ بھی ہیں اور عشقیہ مثنویاں بھی ـــــ اس مرتبہ حضرت آصف جاہ ثانی، غفراں مآب (۱۱۷۶ھ تا ۱۲۱۸ھ) کے جشن جلوس کی تقریب میں جو قصیدہ لکھا گیا تھا وہ مدحی قصائد کے سلسلہ میں سب سے پہلے نذر ناظرین کیا جاتا ہے کہ ایمان کی مادحانہ شاعری کے عہد کا عہد اول یہی ہے؛ اس قصیدہ کا نام ایک مصرع میں "جلوس آصفی" بیان کیا گیا ہے، حضرت آصف جاہ ثانی نے ۱۱۷۶ھ میں مستقل طور پر جلوس فرمایا تھا۔ (عمر یافعی)

(۱) شکر للہ اب سعادت پر ہے دورِ آسماں | راحت و آرام سے معمور ہے سارا جہاں

کھولتی ہے شام بھی اب لف لیلا مرا | جسکی بوئے روح پرور معطر مغز جاں

کشت امید خلائق سبز کرتا ہے زحل | مشتری بھی اب ہوا ہی تا فہی اس کو اماں

نغمہ آرائے نشاط عیش ہے ناہید بھی | اور عطارد ہی دبیر نامۂ عشرت نشاں

(۹) منقلب رفتار اپنی چھوڑ کر راس و ذنب | راہ پر آئے سعادت کی بسان راستاں

شمع افروزی میں بزم عشق کے ہیں آتشی | اور بادی بھی ہوا اور فراغ انس و جاں

ایک ہیئت پہ ہی سایہ کیا بعید کیا فرق | فرق اصطرلاب سے ہووے نہ اندیشہ عیاں

شیشۂ گردوں میں ہر دم رنگ صالح موجزن | ہوگئے عالم سے اب آثار ردیہ نہاں

اس قدر پایا ہی تنقیہ دماغ روزگار | جز رطوبت کے یبوست کا نہیں اب گر نشاں

(۱۱) شرح اسباب علامات کہاں تک کیجئے | جلوہ گر آثار صحت سے زمین تا آسماں

سن کے اس نے مجھ سی بولا کیا تجھے معلوم نہیں | پرورش پایا ہے تو دولت سے جسکی ای جواں!

دم کرے ہی جو طرف باد صبا افسون عیش | ہر سحر اقبال لادے رونما آئینہ ساں (۲)

سبعۂ سیارہ میں فرخندگی کی چال پر | ایک بھی باقی نحوست کا نہیں ذرہ نشاں

پیشۂ جلادی اپنا کر دیا بہرام ترک | پنجۂ خورشید ہی یک دست حاتم زر نشاں

طے کرے ہی اب منازل سعادت کے تمام | روز و شب دورے بدرجہ ہر دو تنقیہ ہر زماں

(۱۰) آبیار گلشن راحت ہوا آبی بروج | اور خاکی بانی دولت سرا کا ہو دواں

شرق سے تا غرب خط استوا کا حکم ہے | بس کہ ہی تابندہ یک ساں آفتاب اندر جہاں

منبسط ہے کیف و کم ہیں لے مرکب تا بسیط | یاں تلک ہی مستوی نبض زمانہ اے ایماں

چار عنصر کو بہم پہنچا مزاج اعتدال | ہیں موالید ثلاثہ بھی سراپا شادماں

مسیح کے مانند احیا اب ہو عظم رمیم | کام عالم میں ہے اعجاز مسیحائی عیاں

الغرض ایمان پوچھا میں نے پیر چرخ سے | کس کے ہے یہ عہد راحت مہد سے امن و اماں

(۲۰) یعنی نواب سلیماں قدر و آصف جاہ عصر | عادل و اکرم نظام الملک عالی خاندان

سنتے ہی یہ نام اقدس ہیں کہاں تک یا چھپے
وہ کریم ابن کریم و بازوی صاحب قراں

گوہر درج سیادت اختر برج شرف
جوہر شمشیر حرب سرگروہ شجعاں

(۲۵) ابتدا سے پرورش پایا ہے میرا گوشت پوست
مو بمو اُس کے نمک سے آب تلک ہوں نمک خواں

گرچہ شعر و شاعری میں کچھ نہیں مجھکو شعور
پر ادا کرتا ہوں میں حق نمک کو یہاں (۲۶)

سرخ رو ہو کر شتاب اے خامۂ رنگیں نگار
مطلع انوار سا لکھ مطلع روشن یہاں

تو ہے وہ مہر جہاں افروز ماہ مہرباں
روز و شب تجھ سے منور ہے زمین و آسماں

بادشاہی کیوں نہ دیوے زیب و افسر تجھے
چتر ہے سر پر ترے فضل خدا کا ہر زماں

(۳۰) پالکی کا بھی ترے ہو اسقدر پایہ بلند
ہے بجا کہئے اُسے گر ہم سر تخت رواں

ذات عالی پہ تیری ختم ہی ہیں عالم میں شہا
لے طیور و وحش و دام و دد سے تا انس و جاں (۳۱)

دولت و حشمت تری مثل سلیماں کیوں نہ ہو
تجھ میں اور اس میں ہے بس اک فرق نبوت درمیاں

مدح تیری صرف میں لاوے کوئی نحو سے
افعل التفضیل کے صیغہ کا عامل ہی یہاں

باندھے جو موصوف مضمون تجھ ثنا و صفت میں
ہے مرے نزدیک وہ مجہول و مکسور اللساں

علم منطق تجھ صواب رائے کا ہی ایک جز
فکر میں تیری خطا کو راہ ہے نہیں بیگماں

ہے سخن موضوع میرا صدق سے ہر شکل میں
مانیے ستا کہیں محمول بر کذب بیاں

میں لکھوں کیونکر یہ مضامین بے ہی یک قلم
شعر میں میرے نہ پایا جا بے نظری کا نشاں

ذات اعلیٰ سے تری پیش قیاس خاص و عام
بے گماں انسان کامل کا نتیجہ ہی عیاں

مصرعے کے مانند موزونی ہی طینت میں ہے
طبع رنگیں سے چلو جیوں بہار گلستاں

(۴۰) خندۂ گل بھی تبسم سے ہی تیرے شرمسار
مدح خواں ہیں بلبل و قمری تیک بندگاں

بادشاہ ملک استغنا کرے محتاج کو
سایۂ عالی ترا ظل ہما ہی بیگماں (۴۱)

تھی اگر مشہور جرأت رستم و اسفندیار
ملے کئی ہنگامے نہ ہوتے گو جہاں میں ہفت خواں

دبدبہ نے اسم کے تیرے کیا تسخیر آب
ہفت اقلیم زمیں سے لے کے تا ہفت آسماں

لالہ و گلرنگ میں جیسے سیاہی داغ کی
کرۂ آتش میں ہے بارود کو حفظ و اماں

کون کر سکتا ہے سینہ کو صدف کے چار آب
واسطے گوہر کے تیرے عہد میں آے در فشاں

کیا بتاؤں جوہر برش تری شمشیر کا
جس کے قبضہ میں ہے لے کر ہند سے تا اصفہاں

اسقدر ہے دبدبہ اس کا کہ شاہ روم و زنگ
بھیجتے ہیں واسطے تیرے ہدیہ ارمغاں

ذکر سے اس کے کٹا جاتا ہے دشمن کا سر
رو برو ٹھیرے کبھو یک دم سو یہ طاقت کہاں

گر اسد، سلطان وحدی تو کو ہم ملا
باندھے جو رنگ چار رونکا برائے امتحاں

(۵۰) ملک ستارہ ہی کر حسب قوت تو یک آن میں
تا سُم گاؤ زمیں ہرگز نہ ٹھیرے درمیاں

کیا کروں وصف سپہر اور اسکے پھولوں کا بیاں
ایک اسد اجس کے نمونہ سے بنا ہے آسماں (۵۱)

کیوں نہ ہووے روز بیدا ہمسر چتر شہی
ہے جہاں کے بیچ وہ پشت و پناہ انس و جاں

کیا بتاؤں جو تجھے حق نے دیا ہے خلق و حلم
آوے دشمن بھی تری سایہ میں لیتا ہے اماں

نقطۂ موہوم کا ایک بار خط بندگی
مرکز اقبال کو پہنچے اگر تیرے یہاں

سرفرازی پاوے تجھ سے اسقدر ہر شکل میں
دائرہ تک چرخ کے فائز ہووے رتبہ قرباں

برج میزاں میں جو ہم سنگ جبال کائنات
حلم کو تولیں اگر تیرے برائے امتحاں

حلم کا پلہ رہے قائم زمیں پہ تا بحشر
پلہ کہسار پہنچے تا بہ ہفتم آسماں

جلوہ گر یوں حسن تیرا جب کہ کھینچے ہی تو
مہر برج قوس میں حسن رنگ ستھے ہو عیاں

فی المثل ہووے اگر الماس کا کوہ عظیم
رہبر و تودہ کے بدلے اے شہ گیتی ستاں

(۶۰) غرق ہووے تیر تیرا اس قدر پل مارتے
جس طرح دریا بحر میں بال کا ہووے نشاں

جیوں پر جبرئیل از بس بے خطا ہی زہ میں
ذرہ ذرہ سہم سے اسکے پکاری الاماں (۶۱)

جب کہ برج قوس میں تحویل ہو تیر فلک
تجھ شفائی شست کی تعریف لکھتا وہاں

تیرے گلگونہ لکھے جو اک ذرہ حسن و لطف
میرے شبدیز قلم کی اسقدر طاقت کہاں

زین اسپ جس گھڑی کا مرصع کا بندھا ہے
تجھ سواری میں کھڑے بن حسن سب دیدہ ایاں

تخت طاؤسی کہوں یا گردہ اسپ براق
برق تازی کا تو اسکے مجھ سے کیونکر ہو بیاں

پاک کا ہلنا تو ہی دشوار جوں نور نظر
جنبش مژگاں سے اڑ جاتا ہے وہ آسماں

نوک بھالے کا زمیں پہ ٹیک کر اشہب سوار
ملک اسے بیٹھا کرے جس دم تو کاوے ریوں

ہر پلٹ میں اسقدر شائستگی ہے دو بچے
گردش پرکار میں یہ حسن یہ خوبی کہاں

چلتے ہیں تیری جلو میں آفتاب و ماہتاب
جسکو یہ باور نہ ہو وہ دیکھ لے تیرے نشاں

ف۔ نقل ہے مگر شاید یہ مصرع یوں صحیح ہو ع طبع رنگیں سے چلوں میں جوں بہار گلستاں۔

تاریخ ادبیات اردو
اور
دورِ تحریک

تمہید

دنیا کی کوئی زبان بھی اول سے لیکر آخر تک ایک حالت پر قائم نہیں رہی۔ بڑی بڑی زبانوں کے ادب پر اگر ہم نظر غائر ڈالیں تو معلوم ہوگا، کہ اس کی نمود اور نمایش مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں ہوئی ہے۔ کسی زمانے میں، کسی خاص صنف ادب کی فراوانی اور ترقی نظر آتی ہے تو کسی وقت اس میں خاص خاص کیفیتیں جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی تو ادب بلندی کے انتہائی مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ اور کبھی اس پر انحطاط اور پستی کے آثار مترتب ہونے لگتے ہیں غرض ادبیات کی عمر اس اُتار چڑھاؤ کا ایک سلسلہ معلوم ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی ملک کی زبان اور ادب اُس کے باشندوں کا مشترک سرمایہ اور انکی حیات ملی کا ایک آئینہ ہوتا ہے، جس میں اچھے اور برے اثرات منعکس نظر آتے ہیں۔ اپنی حیات کے دوران میں قومیں جن جن حالات اور جن جن ماحول کے اندر سے گزرتی ہیں، اُن کا اثر خود قوم پر پڑتا ہے۔ اور اسی واسطے سے ان کا ادب اور زبان بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس خاص نقطۂ خیال سے، تمام زبانوں کے ادب کی حالت بھی ایک ذی روح کی سی ہے کہ جس پر حیات کے مدارج — بچپن، جوانی اور بڑھاپے — کا گزرنا واجبی ہے۔ یہی اتار چڑھاؤ درحقیقت کسی زبان یا ادب کی زندگی کا ہمیں یقین دلاتا ہے۔ وہ ادب ہی کیا جس کے مختلف ادوار میں تنوع نہو! واقعات سے ثابت ہے کہ کسی قدیم یا جدید زبان میں اس کی پیدایش سے لیکر ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہنچنے تک ایک ہی قسم کی تحریریں رائج نہیں رہ سکتیں۔

ادبیات کے مختلف ادوار، عموماً، ان مخصوص رجحانات کے اعتبار سے قائم کئے جاتے ہیں، جن کے وہ مظہر ہوتے ہیں۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں: (۱) سب سے پہلے تو یہ بات بآسانی معلوم ہوسکتی ہے کہ کسی خاص زمانہ میں کسی قوم کے مشاغل زندگی کیا تھے۔ اُن کے

معاشرتی نظامات، اقتصادی، سیاسی، مذہبی مختصر یہ کہ اجتماعی حیات ملی کی نوعیت کیا تھی؟ یہ امور ایسے ہیں، جن کے علم سے خود قوم کی تاریخ پر بیش بہا روشنی پڑتی ہے۔ (۲) دوسرا فائدہ اس کا یہ بھی ہوتا ہے، ادب کے متعلین کے لئے زبان کے مختلف رجحانات اور ان کے اسباب و نتائج کو بہ قید زمانہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

حیات قومی میں ادبیات کو، جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ کچھ اس امر سے قائم کیا جا سکتا ہے کہ بعض وقت صرف ایک قوم کے ادب کا مطالعہ اس کے متعلق بڑی مفید معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ آج یورپ میں متعدد ادارے ایسے قائم ہیں جو دنیا کی تمام قدیم قوموں کے ادبی کارنامے محض اس لئے کرید کرید کر نکال رہے ہیں کہ ان سے اس قوم کے متعلق مفید مواد دستیاب کر سکیں، اس سے دنیا کو استفادہ کا موقع دیں اور اس کے ذریعہ وسیع مستقبل کو شاندار بنانے کی کوشش کریں۔ برٹش میوزیم میں اس کتبے کے آثار اب تک حفاظت کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں، جس کا مطالعہ بابل کے مشہور بادشاہ ہامورابی کے قواعد حکمرانی، اصول تنظیم مملکت اور دیگر مفید احکامات سے روشناسی کا باعث ہوا تھا۔ قدیم مصری، یونانی بلکہ رومی اور عربی دنیا کے ادبی آثار کو (اگر جدید تحقیق ہوں) دنیا بہترین معاوضہ پر بھی حاصل کرنے تیار ہے!

اسی اہمیت کا احساس ہر زبان کی تاریخ ادبیات کو یادگار بنا دیتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے تاریخ ادبیات کی تدوین میں بے حد احتیاط کا برتاؤ ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ حتی الامکان ادب کے مختلف آثار کی ترجمانی غلط طور پر نہ کیجائے۔

یہ مسئلہ اردو زبان کی تاریخ ادب اور زبان کے لئے بھی اب اہم بن چکا ہے۔ بہت سے بہی خواہان اردو اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں کہ اس کے مختلف ادوار کے کارناموں کو جمع کر کے ان کی ترجمانی سے وہ تمام رجحانات اخذ کریں جو ان سے وقتاً فوقتاً ظاہر ہوئے ہیں اور انکی ترتیب سے تاریخ ادبیات اور ادوار زبان آسانی قائم اور مدون کر سکیں۔

اردو ادب کے منتشر مواد پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہمنے اس کے چار ادوار قائم کئے ہیں جس کا ذکر آگے آئیگا۔ ان میں جس دور سے ہم بے حد متاثر ہوئے ہیں اس پر ذیل میں ہم ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس دور کو اس کی پیداوار کی گوناگونی اور عام ہیجان کی وجہ سے ہم نے ”دور تحریک“ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۲

اُردو ادب کے ادوار

اردو ادب کی تاریخ کو سرسری طور پر ہم چار ادوار پر تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) پہلا دور آغاز زبان سے لیکر ولی اورنگ آبادی کی وفات تک تصور کرلیا جائے۔ اس زمانے میں اردو زبان کا مولد اور منشا اور گہوارۂ پرورش دکن تھا یہیں اس کی شاعری نے جنم لیا اور اسی جگہ اس کی نثر کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اصناف شاعری میں مثنوی اور غزل کو اس دور میں خاص ترقی ہوئی۔ نثر زیادہ تر مذہبیات اور قصص کے لئے استعمال کی گئی۔ بیجاپور، گولکنڈہ اور اورنگ آباد باری باری سے اس زبان کے مرکز بنے رہے۔ (۲) اردو زبان دکن میں ایک خاص صورت اختیار کرکے دوسرے دور میں کوہ بندھیاچل کے اس پار دہلی، اور لکھنو اور رامپور چلی جاتی ہے۔ اس دور میں اردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی گئی اور اس کے تمام اصناف مثلاً: غزل، قصیدہ قطعہ، رباعی، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنوی وغیرہ یہاں پر ترقی کی معراج کمال تک پہونچ گئیں، البتہ نثر توجہ کی محتاج رہی۔ کیونکہ اس میں صرف مصنوعی اور پر تکلف مسجّع اور مقفّیٰ عبارتیں لکھنے کا رواج ہوا۔ جو محض ملا طغرائے مشہدی، ملا نورالدین ظہوری اور عبدالقادر بیدل کا تتبع تھا۔ (۳) تیسرے دور کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کے قیام سے شمار کی جائے۔ یہ دور اردو زبان اور ادبیات کی تاریخ میں بے حد اہم ہے۔ کیونکہ جدید اردو کی پیدائش سے متعلق جس قدر تحریکات وجود میں آئیں تقریباً سب کی سب اسی زمانہ کی ہیں۔ قدیم خیالات اور اسالیب کا اس میں خاتمہ ہوتا ہے، اور جدید اصلاحات اور عالمگیر بیداری کی ابتدا۔ یہ زمانہ مغربی اقوام کے ہندوستان میں وارد ہونے کا ہے۔ اس دور کے بانی ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اسکی روح رواں سر سید احمد خاں ہیں۔ جان گلکرسٹ نے ایک وسیع ادارہ، اردو کی اصلاح اور ترقی کی غرض سے کلکتہ کے فورٹ ولیم میں کالج کی شکل میں قائم کیا۔ لیکن اس کی اصلاحی تحریک عالمگیر نہو سکی۔ اسکے اسباب ہم آیندہ موقع پر بیان کریں گے۔ اس کے کچھ دنوں بعد آنریبل سر سید احمد خاں کی مساعی سے اردو زبان کو بالواسطہ اور بلا واسطہ بڑی تقویت پہنچی۔ اور جان گلکرسٹ کی تحریک عملی طور پر ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہی دور ہمارے موجودہ مقالہ کا مطمح نظر ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے یہ دور ختم ہوتا اور چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔

(۳)

ابتدائی دور

تاریخ ادبیات اردو کا سب سے زیادہ اور مختلف فیہ مسئلہ زبان کی ابتدا اور پیدائش کا ہے۔ سرگرم مباحثوں اور تحریروں کے باوجود اب تک کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اردو ادب کا ابتدائی مواد اس قدر منتشر اور مختلف مقامات میں محفوظ بلکہ "مدفون" ہے کہ اس دور پر تحقیقی کام کرنے والے کو کسی امر میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اردوئے قدیم پر سے تاریکی کے یہ بادل کب دور ہونگے؟

عام طور سے اردو زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظرئیے پیش کئے جاتے ہیں۔ بعض قدیم طرز کے بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ اردو زبان کی پیدائش اس وقت سے تسلیم کی جانی چاہئیے جب سے کہ فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش ہندی کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ غیر سائنٹفک اور غیر لسانی فیصلہ شاید ہی کوئی ہو سکے۔ یہ نظریہ اس لئے ناقابل توجہ سمجھا گیا ہے، کہ اول تو یہ بادی النظر میں کچھ غیر معین سا معلوم ہوتا ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش ہندی زبان میں اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی۔ جب سے مسلمانوں کا پہلا قدم ہندوستان میں آیا تھا۔ اور عموماً یہی ہوا کرتا ہے کہ ہر قوم جب ایک نئے ملک میں جاتی ہے تو "کل جدید لذیذ" کے مصداق کچھ تو اس کے نئے تمدن کے اثرات کی دلکشی اور کچھ اس کے مخصوص اشیا، کی ضرورتوں کے لحاظ سے آنے والی قوم کی زبان کے بیسیوں الفاظ، اس ملک کے رہنے والوں کی زبان پر آسانی کے ساتھ چڑھ جاتے ہیں جن کا اظہار تحریروں میں بھی وقتاً فوقتاً ہونے لگتا ہے۔ اس کی مثال ہم کو انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور ولندیزی زبانوں کے ان الفاظ سے ملتی ہے جو ان اقوام کے ہند میں قدم رکھتے ہی یہاں کی زبانوں میں جگہ پانے لگے۔ اسطرح کی آمیزش الفاظ کی کوشش ہر جگہ اس ملک کے اصلی باشندوں کی اپنی کوشش ہوتی ہے۔ اور جس کے کرنے پر وہ فطرتاً مجبور بھی معلوم ہوتے ہیں۔ چودھویں یا پندرھویں صدی عیسوی کی کسی ہندی کتاب کو لیکر ٹٹولا جائے تو ہم کو اس میں بہت سے الفاظ ایسے مل سکینگے جن کے فارسی یا عربی نژاد ہونے میں احتمال نہیں ہو سکتا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کوئی زبان اپنی اصلی جگہ سے اسلئے نہیں ہٹ جاتی کہ اس میں کسی اور زبان کے الفاظ کی آمیزش ہو گئی ہے۔ اگر ایسا نہو تو آج اردو زبان میں انگریزی الفاظ جس کثرت کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں اس کے اعتبار سے انگریز اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ اردو نہیں ہے بلکہ کوئی دوسری نئی زبان تیار ہو رہی ہے۔

بعض بزرگواروں کا یہ خیال ہے کہ اردو زبان کا آغاز ان فارسی اور ہندی آمیختہ جملوں سے تصور ہونا چاہئیے جو مسلمان یا ہندو مشاہیر کی زبان سے کسی نہ کسی وقت ادا ہو گئے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی اردو کی ابتدا کا عدم تعین ظاہر ہے اس جملے کا بھی تو ابھی تک پتہ نہیں لگا جو اس قسم کے مقولوں میں اولین کہا جائے۔ تاہم لسانیات میں ہم کسی زبان کی پیدائش کے مسئلے پر صرف معلومات کے اعتبار سے خیال آرائی کرنے پر مجبور ہیں۔

ایک تیسرے گروہ کا قول بھی اس جگہ نقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اردو کا آغاز اس وقت سے شمار کرنا چاہتے ہیں جبکہ پہلا ہندی شعر فارسی بحر میں، موزوں کیا گیا تھا۔ بہرحال یہ نظریہ ہو یا متذکرۂ بالا دونو کی نوعیت ملتی جلتی ہے۔ کاش ہم کو ایسا شعر، نہیں تو مصرعہ ہی دستیاب ہو جاتا جس کو پورے یقین کے ساتھ ہم پہلا کہہ سکتے!

غرض اس بحث سے اس مسئلہ کا مابہ النزاع ہونا ظاہر ہے۔ درحقیقت یہ مسئلہ سنجیدہ مطالعہ کے قابل بن رہا ہے۔ فی الحال اس بحث سے قطع نظر کرکے ہم اردو زبان کے ابتدائی آثار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

اردو زبان کا اولین اور مشہور دور وہ ہے جس میں اس کا سارا مواد نثر میں چند ہندی اور فارسی آمیختہ جملوں پر اور نظم میں چند اس قسم کی غزلوں پر مشتمل تھا۔ صاحب "گل رعنا" اور مصنف "شعر الہند" نے اس قسم کے جملوں کا کافی ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ انکی تاریخ پیدائش شاہ جہاں شہنشاہ ہندوستان کے عہد حکومت کے ادھر ادھر بتلائی جاتی ہے اس زبان کی ہیئت کذائی کو نہ محض ہندی کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی کی شاخ۔ بلکہ وہ ان دونو اور ایک تیسری زبان عربی کے الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی کے مسخ شدہ لفظوں کو ملا کر ایک مفہوم ادا کر دیا جاتا تھا۔ اور یہی اُس زبان کے ابتدائی آثار ہیں جو ڈیڑھ سو سال بعد ایک قوم اور ایک ملک کی زبان بننے والی تھی اور جو ہند کی سرزمین میں ہندی زبان ہی سے پیدا ہو کر ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے سہارے سے نشو و نما پاتی رہی۔

نثر کی حد تک صرف چند جملوں کی کوئی ادبی وقعت نہیں۔ نظم میں غزلیں وغیرہ اس کا خاص ادبی سرمایہ ہیں۔ ان "ہند فارسی" جملوں میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے ایک خاص چیز ملاحظہ کے قابل ہندی الفاظ کے تغیر کی کارروائی اور فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا اس میں ثبوت ہوتا جاتا ہے۔ ان صاحبانِ بصیرت کے لئے جو ایک زبان کی تعمیری حالت کا بغور مطالعہ کرنا چاہتے

ہیں، یہ آثار ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اس نام نہاد مواد زبان اور اس کے اولین تحریری مواد کو چھوڑ کر اسی دور میں ہم اس کی اس حالت تک پہنچتے ہیں، جس میں ہم کو اردو کی بنیادیں واضح طور پر رکھی ہوئی اور عمارت کے کچھ حصے بھی بنتے بگڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ اردو زبان کی دکھنی زندگی کا دور ہے۔ ابتدائی دور میں اردو زبان پر مذہب کی حکومت رہی۔ جس کا نتیجہ شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں اور "معراج العاشقین" وغیرہ کی شکل میں دنیا سے روشناس ہو چکا ہے۔ اس کے بعد شاعری کی اصناف؛ غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، پہیلی وغیرہ کا تعین ہوا۔ ابتدائی دور میں اردو نے دکن میں تین مرکز بدلے۔ بیجاپور، گولکنڈہ اور اورنگ آباد۔

اس ابتدائی دور کی اردو کے متعلق ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں جملوں کی شکلیں مربوط نثر کی ہئیت اختیار کر لیتی ہیں۔ نظم کی بنیادیں بھی مضبوط اور مستحکم طور پر قائم ہو جاتی ہیں۔ اور اس میں اکثر اشکال بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک اردو (ہندی) زیادہ تر فارسی اور عربی اسالیب اور خیالات کے گہواروں میں پرورش پا رہی ہے۔ سعدی، وجدی، قطب شاہ، تاناشاہ، غواصی، بحری، نصرتی، ذوقی، محمود، سراج اور سب سے مشہور ولی۔ اردوئے قدیم کی مہتم بالشان پیداوار ہیں۔ یہی اردو نظم کے مؤسسین ہیں۔ اگر انہیں "خاقانِ اردو" کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعد اورنگ آباد نے علماء اور شعرا کا آخری مجمع دیکھا۔ یہ صحبتیں یہاں اچھی طرح جمنے بھی نہیں پائی تھیں کہ سیاسی اور دیگر مجبوریوں نے انہیں درہم برہم کر دیا۔ ولی، فراقی، فخری، آرزو نے دکن سے شمالی ہند کی طرف ہجرت کی ولی کے ساتھ ساتھ ان کا دیوان بھی شمالی ہند پہنچا جس نے اپنے ماحول سے زیادہ روشن دور کے لوگ پیدا کئے۔

(۴)

دوسرا دور

جہاں تک اردو زبان کے ارتقاء کا تعلق ہے۔ ہماری دلچسپی کا مرکز اب دکن سے شمالی ہند کی جانب، اور پھر بیجاپور، گولکنڈہ اور اورنگ آباد کی طرح، باری باری سے دلی، لکھنو اور کلکتہ میں منتقل ہوتا ہے۔ ہم نے اوپر اردو کے ابتدائی دور میں نظم اور نثر کی پیدائش اور اس کے استقرار کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ یہاں اب اسی سلسلہ میں اُردو زبان کی ترقی کا ذکر سنئیے۔

علم و فن کی دنیا میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اکثر شاگرد اپنے اساتذہ سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس کا تجربہ ہم کو یونانیوں کے مصریوں سے علوم و فنون سیکھنے اور ان کو مدوّن کرنے سے اور پھر ان کے بعد رومیوں اور قرونِ وسطٰی کی یورپی اقوام کے ان کو ترقی کے معراج کمال تک پہنچانے سے بخوبی ہو چکا ہے۔ اقتضائے فطرت بھی یہی ہے۔ دورِ تخلیق کے گذر جانے کے بعد ارتقائی دور کا آنا ضروری امر ہے۔ اردو زبان میں بھی یہی ہوا۔ کہ دکن کے اساتذہ سے فن کو سیکھ کر شمالی عالموں نے اس کو پایۂ ترقی پر پہنچایا۔ ان کی مساعی سے تھوڑے ہی عرصہ میں سارا ہندوستان اردو کے علماء اور شعراء کے نغموں سے گونج اٹھا۔

اردو زبان پر یہ دوسرا دور گذر رہا ہے۔ اس میں توجہ نثر کی نسبت نظم کی طرف زیادہ رہی۔ زبان کے گذشتہ اور پہلے پیدائشی دور کا کھُردرا پن یہاں کے اہلِ علم و فن کی طبیعتوں کے خراط پر چڑھ کر صاف ہو گیا۔ دکن میں جو سرچشمہ پیدا ہوا تھا، بہتا ہوا دہلی پہنچا۔ یہاں کے نخلبندوں نے اس کی آبیاری سے طرح طرح کی چمن بندیاں کیں۔ دہلی کے اُجڑتے اُجڑتے اس کا رخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا جہاں اس میں نزاکت اور لطافت کی موجیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لکھنؤ کی مصیبت نے اس کو ایک طرف تو رامپور کی طرف چلا دیا اور دوسری طرف کلکتہ میں اسکی دوسری شاخ پہونچی۔ داغ، غالب، ذوق، مومن وغیرہ کے بعد یہ چشمہ سوکھتا ہوا نظر آ رہا تھا کہ حالی نے سرسید احمد خاں کی رہبری میں نظم کی شاخ کے لئے نیا راستہ کاٹ کر صاف کیا۔ اور اس سے قومی فلاح اور بہبودی کے کام لینے کی ابتدا کی۔ خود سرسید نے نثر کی کجروی کو روک کر اس کے لئے نہایت سیدھا اور آسان گذار راستہ تعمیر کیا۔

بہرحال شمالی ہند کے دورانِ حیات میں اردو زبان نے دہلی اور لکھنؤ کے باکمال عالموں اور شاعروں کے فیضانِ صحبت سے استفادہ کیا۔ نظم میں غزل اور مثنوی کے ساتھ ساتھ قصیدہ، مرثیہ، رباعی، اور ترکیب بند کا بھی رواج ہوا۔ اور ان میں ترقی کے تمام زینے ختم کر لئے گئے۔

نثری آثار دکن میں نظم کے ساتھ ساتھ پیدا ہو چکے تھے لیکن یہ مسئلہ کہ آیا شمالی ہند کی نثر دکن کے نمونوں سے مستفید ہو سکی یا نہیں ابھی معرضِ بحث میں ہے۔ دکن میں نثر مذہبی علوم کے لئے رائج ہوئی تھی۔ اس کا استعمال قصوں میں بھی کیا گیا۔ شمالی ہند میں بھی کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج قائم ہونے تک اس کے یہی دو مقاصد زیادہ واضح ہیں۔ تاہم آخرالذکر کی طرف رجحان

زیادہ پایا جاتا ہے۔

اردو نثر نے شمالی ہند میں جو شکل اختیار کی وہ اپنی ایک ذاتی تاریخ رکھتی ہے۔ اردو زبان کے قدیم نثر نگاروں نے پہلے پہل اپنی تحریروں کو فارسی کے اسلوب کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ یہاں یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ فارسی زبان کا آخری دور کن خیالات اور اسالیب بیان کا مظہر ہے۔ ہندوستان فارسی زبان میں مقفیٰ اور مسجع اسلوب کی عبارتیں پیدا کرنے میں یوں تو اول ہی سے مشہور ہے لیکن مغلوں کے آخری زمانے میں اس کا اسلوب جو خاص پیچیدہ مصنوعی اور پُر تکلف طرز اختیار کر چکا تھا اس کا پتہ "سہ نثر ظہوری" "ظہورائے ملا مشہدی" اور "رقعات بیدل" سے بخوبی چل سکیگا۔ ہر مطلب کو ایچ پیچ کے ساتھ، موٹے موٹے لغات اور صنائع و بدائع کے لباس میں ادا کرنا ایک ہنر سمجھا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ باکمال وہی شخص سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ مغلق، پُر تعقید اور صنعتوں سے بھری ہوئی عبارتیں لکھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متوسطین فارسی میں حضرت شیخ سعدیؒ وغیرہ کے علمی کارناموں نے جو مقبولیت عام اور شہرتِ دوام حاصل کی تھی، اسکے تتبع کے خیال نے تمام فارسی نگاروں کو راستے سے بھٹکا دیا۔ انہیں اسالیب کی فضا میں جب شمالی ہند کی اردو نے جنم لیا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے ماحول کے اثرات سے باہر ہو سکتی؟ غرض شمالی نثر نگاروں کے سامنے ہندوستان کے آخری باکمال فارسی نثر نگاروں کے نمونوں کی کثرت تھی۔ جس کی اتباع کرنے پر وہ فطرتاً مجبور تھے۔ اور یہی مجبوری قدیم اردو میں بھی ایک پُر سقم، پیچیدہ اور مصنوعی اسلوب کے رواج پانے کا سبب بن گئی۔

ہم لوگ جو اردو زبان کے اولین بہی خواہوں اور کارکنوں کے زمانے سے اس قدر دور واقع ہوئے ہیں آسانی کے ساتھ اس امر کا اندازہ قائم کر سکتے ہیں کہ ان کا کام کس قدر مشکل ہو رہا تھا اور ان کی کوششیں کیسی نقش بر آب ثابت ہونے کے قریب تھیں۔ لیکن اس سے انکی اہمیت پر کچھ حرف نہیں آسکتا۔ ان بزرگواروں کے بار احسان سے اردو زبان کسی حال میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہے یہ کہ، جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ کیا وہ اس راستے سے ہٹ کر بھی گامزنی کر سکتے تھے؟ تو حسرت ہوتی ہے کہ کاش وہ الفاظ اور جملوں کی پیچیدگیوں میں نہ پڑتے! آج کون اس امر کا دعوےٰ کر سکتا ہے کہ "فسانہ عجائب" کے اسلوب میں "حیاتِ جاوید" لکھی جا سکتی ہے یا ایک "شعر العجم"، "انشائے بہار بے خزاں" کے انداز میں پیش کیجا سکتی ہے؟ "فسانہ عجائب" "انشائے بہار بے خزاں" اپنی اپنی جگہ ضروری شاندار ہیں اور اپنے

منشائے تخلیق کو بھی بوجوہ احسن پورا کر چکے ہیں۔ ان کی عظمت ہر ایک اردو دان پر واجب ہے ورنہ ہماری حالت اس نوعمر لڑکے کی سی ہو جائیگی جو اپنے باپ کے کندھوں پر سوار ہو کر تمام دنیا سے اپنے آپ کو اونچا تصور کرنے لگتا ہے۔ لیکن اب اس قسم کے ادبی شعبدوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ ادبیات اردو کے شاندار مستقبل میں یہ چیزیں صرف اشکال اور اسالیب ادب کے متلاشیوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکیں گی۔ ان کی علمی اہمیت اب ان سے چھین لی گئی ہے۔ یہ خیال محض نظریہ نہیں۔ اردو زبان دوسری تمام زبانوں کے دوش بدوش اسی وقت ترقی کر سکتی تھی، جب وہ اپنے ماضی کے خیال کو دل سے نکال دیتی اور حال کے قدم بقدم چلکر مستقبل کو پیدا کرتی۔ تحریر کے نئے نئے انداز اور نئے نئے خیالات اس وقت تک پیدا اور ضرور پیدا ہوتے اور نشو و نما پاتے رہینگے جب تک کہ ایک قوم کے ماحول اور اس کی ذہنی قوتوں میں وسعت پیدا ہوتی رہیگی اور زمانہ نئی نئی ضرورتیں پیدا کرتا رہیگا۔

(۵)

تیسرے دور کا آغاز

ہندوستان، جس کی تاریخ کے ساتھ اردو زبان کی قسمت کا دامن بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا ہے، مغلوں کی حکومت کے آخری زمانے میں اپنے آپ میں ایک نئے اور انقلاب کن عنصر کو جگہ دیتا ہے۔ یہ یوروپی — فرانسیسی، ولندیزی، پرتگالی اور انگریزی — اقوام کا ہندوستان میں داخلہ ہے۔ یہ لوگ یہاں آئے تو تجارت کی غرض سے تھے، لیکن ہندوستان کی اس وقت کی طوائف الملوکی نے ان کے دل میں بھی حکومت کا خیال پیدا کر دیا۔ ان اقوام کی تہذیب اس وقت بھی معراج کمال کو پہنچی ہوئی نہیں تو کم سے کم ہندوستان کے لئے ایک نئی چیز ضرور تھی۔ ہر نئی چیز خوش آئند ہوتی ہے۔ جدید تمدن کے اثرات ابتدا ہی سے ہندوستان کی ہر شئے پر مسلط ہونے لگے۔ اس کی طرح یہ تھا کہ بہ حیثیت تاجروں کے آنے والی قومیں ہند کے اصلی باشندوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے اور ان میں "مقبولیت عام" حاصل کرنے پر مجبور تھیں ایک طرف تو یہ لوگ ہندوستانی زبان سیکھنے لگے دوسری طرف خود ان کی زبانوں کے بے شمار الفاظ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں پیوست ہونے شروع ہوئے۔ اردو زبان کی لچکدار اور اثر پذیر طبیعت نے اس کو تمام زبانوں سے زیادہ مغرب سے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ انگریزوں کی حکومت کے قائم ہونے سے پہلے ہی بے شمار انگریزی اور کچھ فرانسیسی، ولندیزی اور پرتگالی الفاظ

اردو زبان میں راہ پا چکے تھے۔

یورپ سے ہندوستان آنے والی قوموں میں انگریزوں کی کارگزاریوں نے انہیں اپنی حریف قوموں کو اپنے راستہ سے ہٹانے کے قابل ہی نہیں بنادیا بلکہ ان کو ہندوستان ہی سے بے دخل کر کے، رفتہ رفتہ اپنا حکومتی نظام یہاں قائم کرنے پر قادر کردیا۔ غیر انگریز اقوام کی بے دخلی کے سبب اردو، ان کی زبانوں کے سرمایہ سے چند لفظوں سے زیادہ استفادہ نہ کرسکی۔ لیکن انگریزی زبان کا اثر اس کے رگ و ریشے میں دوڑ گیا۔ اس زبان کی ساری آیندہ ترقیوں کا مطمح نظر انگریزی زبان ہی بنی رہی۔

غرض ہماری زبان بھی اپنی تاریخ ادبیات کا ایک ورق اس وقت الٹتی ہے، جبکہ انگریزی اثرات سے ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اردو زبان کی ترقی کے کئی ایک مزید اسباب بھی یکجا جمع ہوگئے تھے ان میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور سرسید احمد خاں کے وسیلے نہایت مفید سہارے بن گئے۔

اس تیسرے دور کی تمام کائنات پر ایک نظر بازگشت ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور اردو ادبیات کے پہلے دونو دوروں سے بے حد مختلف ہے۔ یہ نہ تو پہلے دکھنی دور کی طرح مذہبی موضوعات اور شعری تخلیق پر محدود ہے۔ اور نہ شمالی ہند کے دوسرے دور کی مانند محض شعر و شاعری کے چرچوں، خیالی مضامین کی کثرت اور مصنوعی اسالیب بیان کی پیداوار پر مشتمل۔ بلکہ یہ زمانہ اردو نظم و نثر میں انقلاب کے آغاز، جدید خیالات کی ترویج اور قدیم اسالیب کے خاتمے کا زمانہ ہے۔ اس دور کی ادبی اور لسانی پیداوار اپنے تنوع میں دنیا کی کسی بڑی زبان کی پیداوار سے پیچھے نہیں۔

اردو ادبیات کے دور تحریک کی ابتدا بہ لحاظ زمانہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ہوتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر موصوف کے اپنے وطن مالوف کو واپس لوٹنے کے بعد فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم منتشر ہوجاتے ہیں۔ اس جماعت میں سوائے جان گلکرسٹ کے شاید ہی کوئی اہل قلم ہوگا جس کا مطمح نظر خالص اردو زبان کی اصلاح ہوگی۔ ورنہ عام طور سے وہاں ہر ایک شخص صرف ہدایت کے ماتحت عمل کررہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے منتشر ہوجانے کے بعد ان لوگوں نے انفرادی طور پر اردو زبان کی اصلاح کے متعلق بہت کم کوشش کی۔ اس کا نتیجہ اس تحریک کی موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فضا اسوقت آہستہ آہستہ تیار

ہونے لگی تھی۔

(۶)

ڈاکٹر جان گلکرسٹ

جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں جم گئے تو ان کے مدبرین کے دل میں یہاں کی دولت سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ یہاں کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن چونکہ اس وقت اردو زبان میں کوئی ایسا سرمایہ موجود نہ تھا جس سے اجنبی لوگ اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکتے۔ اس لئے بعض دور اندیش انگریزوں نے ہندوستان کی زبان (اردو) سے اپنے ہم قوموں کو مانوس بنانے کے لئے کلکتہ میں ایک ادارہ "دی کالج آف فورٹ ولیم" کے نام سے قایم کیا۔ ہندوستان کے تمام سر برآوردہ علما یہاں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اطراف جمع ہو گئے۔ اس محسن اردو نے ایک پیغمبر بنکر اس زبان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور کوشش کی اردو میں مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کے بجائے سادہ سلیس اور بول چال کی اردو کا سرمایہ جمع ہو جائے جس سے اجنبیوں کو اس زبان کے سیکھنے میں مدد مل سکے۔ یہ کام خواہ کتنی ہی تنگ نظری سے کیوں نہ کیا گیا ہو تاہم اردو زبان کے لئے اس کے نتائج نہایت مفید ثابت ہوئے۔ کیونکہ اردو کو فطری راستے پر چلانے کی یہ پہلی کوشش تھی۔

انیسویں صدی کا آخری زمانہ اردو زبان کے لئے ایک نئے دور کے آغاز اور ایک نئی تحریک کی پیدائش کا زمانہ ہے۔ اور اس تحریک کے پیدا کرنے کا فخر جان گلکرسٹ کو حاصل ہوا۔ گو یہ تحریک محدود مدت اور وقت سے پہلے ہونے کے سبب تمامتر کامیاب نہ ہو سکی۔ تاہم یہ بیکار بھی نہیں ثابت ہوئی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کام کی تکمیل مشیت آنریبل سر سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں سے کرانا چاہتی تھی۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ اردو زبان کے محسن ہونے کے اعتبار سے اس تمام وقت کے قابل ہیں جو کسی شخص کو مصلح زبان ہونے کی حیثیت سے مہذب دنیا عطا کر سکتی ہے۔ اردو زبان سے انہیں خاص اُنس تھا۔ انہوں نے اس کا بغور مطالعہ بھی کیا جس کے نتائج ان کے ادبی اور لسانی مصنفات کے تنوع سے بخوبی ظاہر ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد تقریباً (   ) ہے جن میں زیادہ حصہ اردو کتابوں کا ہے۔ ان تمام کارناموں کا مقصد صرف اردو زبان کو مروجہ مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کی بندشوں سے آزاد کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے تمام ہندوستان کے مشہور اہل قلم کو

اپنے اطراف جمع کیا۔ اس جماعت کے اراکین میں سے میرامن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، حفیظ الدین احمد، مظہر علی ولا، مرزا علی لطف، اکرام علی جوان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہیں سے ہر ایک نے اپنے راہنما گلکرسٹ کی ہدایت کے ماتحت بہت سی اردو کتابیں سادہ، سلیس اور روزمرہ کی اردو میں لکھیں۔ اکثر کتابیں فارسی، ہندی، سنسکرت اور عربی کے ترجمے تھے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ مصنفات نہایت محدود ہیں کیونکہ ان میں اکثر و بیشتر قصص اور حکایات کے ترجمے ہیں۔ کامیابی کے زاویۂ نظر سے جان گلکرسٹ کی تحریک فورٹ ولیم کالج ہی تک محدود رہی۔ کیونکہ اس سے باہر بہت کم لوگ اس سے واقف تھے۔ اور جو جانتے بھی تھے، وہ اسکو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کالج کی کوششوں کے ساتھ ساتھ، مرصع اور مسجع نثر کا رواج بھی دن بدن بڑھتا گیا۔ اور اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے گلکرسٹ کی تحریک کی تائید اپنے ذمہ نہ لی۔

(۷)

جان گلکرسٹ کی کوشش محدود کیوں رہی۔

جسطرح یہ مسلم ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دھراتی ہے، اس طرح تاریخ میں یکسانیت بھی قابل دید ہے۔ تقریباً تمام امور اپنی پیدائش اور نشو و نما کے لئے خاص خاص ماحول اور مخصوص زمانوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ آج کا مورخ شہنشاہ محمد تغلق کی مذمت کرتا ہے کہ اس نے "کرنسی نوٹ" (چمڑے کے سکے) وقت سے پہلے جاری کئے تھے۔ اس قسم کے "نوٹ" صرف انہیں مقامات میں رائج ہوسکتے ہیں۔ جہاں کا نظام حکومت ایک غیر متزلزل بنیاد پر قائم ہو اور جس کا نظم و نسق بہترین۔ وہی چیز جس کو اس وقت ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا، آج بے حد کامیاب ثابت ہوچکی ہے! ہم نے کلکتہ کی تحریک کے ناکام ہونے کا اوپر کہیں ذکر کیا ہے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ فضا ابھی اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی تھی۔ تمام ادیب جن کے دماغ قدامت کی ہوا سے ابھی تک بھرے ہوئے تھے سادہ طرز ادا، اور سلیس اسلوب بیان کو اپنی توجہ سے نیچے کی چیز سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کی اتباع کرنے کے لئے تیار ہوجاتے رجب علی بیگ سرور نے اپنے فسانۂ عجائب کے دیباچہ میں، میرامن دہلی والے کے صاف نثر میں قصہ لکھنے پر تعریض کی ہے۔ سرور کی تنقید سے اگر لکھنوئیت کے تعصب کے عنصر کو اگر دور بھی کردیا جائے تو بھی یہ واقعہ ان لوگوں کی ذہنی کیفیت کو بے نقاب ضرور کرتا ہے۔ ممکن نہیں تھا کہ ایسے قدامت پسند ومیں اسقدر جلد تغیر

واقع ہو جاتا۔ ان کے خیال میں ایسی کتاب کا لکھنا کوئی کمال کی بات ہی نہ تھی، جو شاعرانہ طرز میں نہ لکھی جائے۔ اس قسم کی ذہنیت کی پائداری کا حال کچھ اس امر سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ اردو زبان کا آئندہ مصلح، آنریبل سرسید احمد خاں، جیسا شخص بھی اپنی پہلی علمی کوشش کو عوام کے مذاق سے مخالف لباس میں پیش کرتے ہوئے پس و پیش کرتا ہے! "آثار الصنادید" کا مواد فراہم کر کے مولانا امام بخش صہبائی کو ــــ جو مرصع اسلوب کے استاد مانے جاتے تھے ــــ دیدیا گیا تھا تاکہ اس کو وہ اپنے انداز خاص میں تحریر کریں سلیس عبارت میں لکھنے سے سرسید کو اپنی کتاب کے پایۂ اعتبار سے گر جانے کا خدشہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ سرسید کے دل میں اصلاح کا خیال ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس سے دنیا کی ایک بڑی ہستی کے اپنے ماحول سے متاثر ہونے کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے! اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جان گلکرسٹ کی تحریک کو ابھی "مقبولیت عام" حاصل نہیں ہوئی تھی۔

(۸)

دور تحریک کے معاون اسباب تیسرے دور میں جدید تحریکات کے پیدا کرنے والے اسباب کئی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر ضمناً گذشتہ صفحات میں کہیں کہیں آچکا ہے۔ یہاں ہم اجمالی طور پر ان تمام موثر اسباب کو جمع کر کے پیش کرتے ہیں جو اردو ادب کے جسم نیم جاں میں جان ڈالنے کا باعث ہوئے۔

۱۔ دوسرے دور میں لکھنؤ تمام ہندوستان کے باکمال شاعروں اور ادیبوں کا ملجا وماوا بنا ہوا تھا۔ نواب واجد علی شاہ اور ان کے پیشرو نوابوں کی داد و دہش نے تمام باکمالان اردو کو دنیا و مافیہا سے غافل بنا کر اپنے مذاق کی چیزیں پیدا کرنے میں محو کر دیا تھا۔ لیکن جب واجدعلیشاہ بساط سلطنت سے شاہ مہرہ کی طرح نکال کر معزول کر دیئے گئے تو ان کے ظل عاطفت کے پروردہ شاعروں اور انشاء پردازوں کا منتشر نہ ہونا تعجب تھا۔ لکھنؤ کے باکمالوں میں سے بعض رامپور گئے، اور کچھ حیدرآباد چلے آئے۔ لیکن زمانہ بدل رہا تھا۔ نہ وہ اگلی صحبتیں قائم ہو سکیں اور نہ تمام صاحب ذوق بزرگ ایک جگہ مجتمع ہو سکے۔ داد و دہش کے بھی وہ موقعے باقی نہیں رہے تھے کیونکہ انگریزوں کے تسلط نے تمام والیان ریاست کو اپنے زیر اثر رکھا تھا۔ ان کو اس قسم کا اسراف کیونکر گوارا ہو سکتا تھا؟ اس سے آئندہ کیلئے بھی یہ ہوا کہ ایسے شعرا اور انشا پرداز پھر نہ پیدا ہو سکے، جو قدیم دبستان شاعری ہی میں جیتے اور مرتے تھے۔

۲۔ انگریزوں کی تحریکات دوسرا عنوان ہے جس کے ماتحت کرنل ہالرائیڈ C. Halroyd جو اسوقت پنجاب کے ناظم تعلیمات تھے، اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تدابیر آجاتی ہیں اول الذکر کو ملکی زبانوں خصوصاً فارسی اور اردو کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ اور یقین ہے کہ اسی چیز نے ان کو اردو کی فرسودہ شاعری کا مخالف بنادیا تھا۔ ان کی تحریک پر محمد حسین آزاد نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی جو انجمن پنجاب کی صورت میں ہر مہینے ایک مشاعرے کا انعقاد کرتی اس مشاعرے کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس مروجہ طریقہ کے خلاف، طرح مصرعہ کے بجائے موضوع "نظم" مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ سب سے پہلی کوشش آزاد نظم لکھنے کی تھی۔ اس کی ابتدا بھی آزاد ہی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ اس انجمن میں علمی مضامین پر بھی مباحثے اور تقریریں ہوتی تھیں۔ ان تمام کوششوں کا مقصد اردو شاعری کی قدیم روش کو بدلنا اور اس کے اصلی مفہوم سے لوگوں کو مانوس بنانا تھا۔

دوسرے انگریز جن کی کوشش سے اردو نثر کی ترقی کا زینہ تیار ہوا، جان گلکرسٹ ہیں۔ ان کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ۔ یہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی میں طبیب کے عہدہ پر مامور ہوکر ہندوستان آئے۔ کمپنی کی تجارت کو فروغ دینے کا طریقہ ان کے ذہن میں یہ آیا کہ کسی طرح ہندوستانیوں سے میل جول اچھی طرح بڑھایا جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا مطالعہ کیا۔ اردو زبان کی دلچسپیوں اور دست پذیری نے انہیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ نو وارد انگریز عہدہ دار ہندوستان میں آسانی کے ساتھ کاروبار کرنے کے قابل اس وقت نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ ہندوستان کی زبان نہ سیکھ لیں۔ لیکن اس زبان (اردو) میں اسوقت ان کو کوئی مواد ایسا دستیاب نہیں ہوا جس سے ان کا مقصد خاطر خواہ بر آتا۔ مجبوراً انہوں نے کلکتہ کے فورٹ ولیم میں ایک کالج کا افتتاح کیا۔ اور اطراف ہند کے سارے اہل قلم کو بلوا کر ان سے صاف اور سلیس زبان میں کتابیں لکھوائیں۔ اور آئندہ اردو نثر نگاروں کی کوششوں کیلئے ایک نمونہ قائم کردیا۔

۳۔ اردو زبان کو شاہ راہ ترقی پر لاڈالنے والے اسباب کے منجملہ ایک زبردست سبب انگریزی ادبیات کا اردو پر اثر ہے۔ اس وقت تک بعض بعض بزرگوار انگریزی زبان سے واقف ہوچکے۔ خواہ براہ راست ہو یا ترجموں کے ذریعہ اس ادب کی خوبیاں دیکھ دیکھکر خود

ان کے دل میں بھی اپنی زبان میں اسی قسم کا لٹریچر پیدا کرنے کا شوق سمایا۔ چنانچہ نظم میں آزاد شاعری کی ابتدا ہوئی، اس کے موجد آزاد اور حالی تھے۔ نثری اصناف میں سوانح عمری، تنقید، مقالہ نگاری، افسانہ نگاری وغیرہ کی تدوین اور ترتیب اس طرز پر ہونے لگی جس سے آج ہم بخوبی مانوس ہو چکے ہیں۔

۴۔ مذہبی تحریکات سے بھی اسی دور میں اردو زبان نے بے حد استفادہ کیا۔ انگریز مشنری جو انگریزی قوم کا جزو لاینفک بن کر ہر جگہ گھس پڑتے ہیں، ہندوستان کی سرزمین پر بھی وارد ہوئے۔ ان کا صدر مقام تو سرامپور، علاقہ بنگال تھا، لیکن ان کی مقدس کتابوں کے سلیس اردو ترجمے اور اسی طرح ان کے مذہبی رسالے تمام ہند میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کتابوں کو نفرت سے سہی — لیکن لوگ پڑھتے ضرور تھے۔ اور بعض وقت مشنریوں کے ان کے مذہب کی تعریض کرنے کی وجہ سے یہ بھی "ترکی بہ ترکی جواب" ادا کرنے تیار ہو جاتے تھے۔ یہ ساری جنگ روزمرہ کی زبان میں ہوا کرتی۔

خود مسلمانوں کے درمیان بھی فرقہ واری مناقشات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ مقلدین اور غیر مقلدین کا جھگڑا اسی زمانے میں برپا ہوا — مولوی سید احمد اس کے بانی تھے۔ ان کے عقائد کی اشاعت سے تمام مذہبی دنیا میں ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ ہر طرف سے جواب اور پھر جواب الجواب شائع ہونے لگے۔ مولوی سید احمد صاحب کے شاگرد سید عبداللہ نے "تنبیہ الغافلین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ (۱۸۳۰ء) میں حاجی اسمٰعیل شہید نے "تقویت الایمان" لکھی۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اس کی بدولت اردو میں خاصہ لٹریچر پیدا ہو گیا۔ جو پہلی قید و بند سے آزاد تھا۔

۵۔ اسی زمانے یعنی اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں مطبعوں کے قائم ہو جانے سے اردو زبان کے نصیب جاگ اٹھے۔ بے شمار کتابیں چھپنے لگیں جن کی وجہ سے علوم و فنون کی اشاعت نہایت آسان ہو گئی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج میں اردو نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا گیا۔ تاہم اس کے اخراجات زیادہ تھے۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی کا پہلا لیتھو کا مطبع قائم ہوا جو بہ نسبت ٹائپ کے کم خرچ تھا۔ اس سہولت نے اردو کو جو فائدے پہنچائے ان کا حصر کرنا دشوار امر ہے۔

لیتھو کے مطبع کی کامیابی کے ساتھ ہی اردو اخبارات بھی جاری ہونے لگے۔ جو کتابوں کی بہ نسبت آسان، اور اشاعت خیالات کا جلد ترین اور بہترین ذریعہ ثابت ہوئے۔ ان کی بدولت اردو داں نہ صرف جدید خیالات اور علوم و فنون سے واقف ہو گئے

بلکہ خود اپنی زبان میں یوروپی چیزوں پر یورپ ہی کی طرح بحث کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

۶۔ مذکورۂ بالا محرکات نے بہ حیثیت مجموعی زبان اردو کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا تھا ہی لیکن اس کی موجودہ ترقیوں نے اس کی رسائی حکومت کے درباروں اور دفتروں تک بھی کر دی ۱۸۳۲ء میں اردو زبان سرکاری دفتروں کی زبان قرار پاتی ہے۔ اس سے نہ صرف، اردو زبان کا رتبہ بلند ہو گیا بلکہ بہت سی دفتری اصطلاحوں کا اضافہ اس میں ہونے لگا۔

۷۔ اردو میں سادہ خط لکھنے کا طریقہ انگریزی زبان سے منتقل نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی اصلاح کا فخر دہلی کے شہرۂ آفاق شاعر اور ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو حاصل ہوا۔ اس برگزیدہ ہستی کی جدت طراز طبیعت نے خطوط نویسی کے فرسودہ قاعدوں، القاب کی بندشوں سے انحراف کر کے ایک نہایت دلچسپ اور لطیف طرز اردو خطوط نویسی کی ایجاد کی۔ غالب کی زندگی ہی میں لوگ ان کے خطوط کی نقل کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی کماحقہٗ تقلید کسی سے نہ ہو سکی۔ یہ خطوط نصف صدی سے اردو خطوط نویسی کا سرمشق بنے ہوئے ہیں۔

۸۔ یہ اسباب بھی اردو کا مستقبل اس قدر شاندار تیار نہیں کر سکتے تھے اگر ان کی طبیعتیں ان اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ نظر آتیں۔ لیکن معاملہ یہاں ایسا نہیں تھا۔ لوگ اس وقت تک ایک ہی قسم کی گفتگو سنتے سنتے اور ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے اکتا چکے تھے۔ انکی طبیعتیں تازہ چیزوں کی متلاشی بن رہی تھیں۔ اس کا ثبوت تیسرے دور کی ابتدا سے پہلے ہی ملنے لگا تھا۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے، روندے ہوئے مضامین میں طبع آزمائی کرنا پسند نہ کر کے اپنا ایک نیا راستہ تیار کیا۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا مطالعہ بھی مروجہ شعری تخلیق سے انحراف کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ان شاعروں کی یہ جدت خرامی درحقیقت فطرت کے تقاضے کا نتیجہ تھی کسی شے کے بدلنے سے پہلے عموماً اس کا ماحول بدل جاتا ہے۔ موسم باران کے شروع ہونے سے پہلے سرد ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ عرب میں شرک اور بت پرستی کے آخری زمانے میں چند لوگ ایسے پیدا ہو گئے تھے جن کے دل بت پرستی سے بیزار اور جن کی عقل کسی تسلی بخش نظام مذہب کی متلاشی تھی۔ اور ایسے ہی وقت حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔

۹۔ آخری مگر سب سے زیادہ عہد آفریں اثر، سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیالوں کی مساعی کا تھا۔ موجودہ اردو زبان اور ادب کے پیدا کرنے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ گذشتہ تمام اسباب اردو زبان کی ترقی میں اس قدر سرعت کے ساتھ معاون نہ ہوتے، اگر سرسید احمد خاں کی

کوششیں درمیان نہ ہوتیں۔ خود انگریزی زبان کے اثرات بھی سرسید احمد خاں ہی کے ذریعہ ہماری زبان پر براہ راست عمل کرنے لگتے ہیں۔

(۹)

آنریبل سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء

سرسید احمد خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کی طبیعتیں بڑی عمر میں ثمر لانے لگتی ہیں۔ جس طرح دیر رس میوے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں، اسی طرح سرسید احمد خاں کی پختہ کاری کے نتائج دیرپا اور مفید ثابت ہوئے۔ انکی ابتدائی زندگی تو لہو و لعب میں گذر گئی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ان کی فطرت کے پوشیدہ جوہر کو اُجاگر کر دیا۔

سرسید احمد خاں نے پہلے پہل سیاست میں حصہ لیا۔ تاہم اس سے پہلے ہی "آثار الصنادید" کی پیش کشی ان کی علمی اور ادبی افتاد طبیعت کو ظاہر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، اس کتاب کو مولانا امام بخش صہبائی سے اردو کے مروجہ اسلوب میں لکھوانے کا واقعہ ایک ایسا راز ہے جو ان کے اصلاحی احساس کی چغلی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے آپ کو مروجہ اسالیب سے مانوس نہیں بنا سکتے تھے!

سرسید جب ایک دفعہ سیاسیات کے میدان میں اُتر گئے تو پھر انکی دلچسپی ان کو متعلق اور غیر متعلق غرض زندگی کے تمام شعبوں کی طرف مصلحانہ قدم بڑھانے پر ابھارتی جاتی ہے۔ سیاسیات سے وہ اصلاح مذہب، اصلاح معاشرہ، اصلاح زبان وغیرہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور آخر کار اصلاح نظام تعلیم پر آکر یہ ٹھہر جاتے ہیں۔ کیونکہ اب قوم کی حیات کو گھمانے کی کل ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ہندوستان کی بدقسمتی ہوتی اگر سرسید احمد خاں سیاست ہی میں محو ہو جاتے۔ کیونکہ اس وقت زندگی کے دوسرے تمام شعبے، خصوصاً زبان اردو ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ تعلیم ہی وہ مدار ہے جس پر اقوام کی تمام مشنری گھومتی ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر بھی اصلاحی تدبیریں سرسید احمد خاں کے مدنظر ہوتیں وہ یقیناً فروعی ہوتیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے سرسید نے اپنی پبلک زندگی سیاسیات سے شروع کی۔ پہلی جنگ آزادی کی رستخیز کے ختم ہونے پر انگریز ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں سے برافروختہ ہو رہے تھے۔ اور حاکم و محکوم کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ انہیں کے

ازالے کیلئے سرسید نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سعی بلیغ کی۔ رسالہ "اسباب بغاوت" (۱۸۵۸ء) اور کئی ایک مقالے اس کی یادگار ہیں۔

انگریز واعظین کی کوششوں سے جو ہلچل اسلامی دنیا میں پیدا ہو رہی تھی اس کا دور کرنا بھی سرسید کی کوششوں کا ایک دوسرا رخ تھا۔ اس خاص میدان میں مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک مولوی مہدی علیخاں نے انکا پورا پورا ساتھ دیا۔ اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں اقوام عالم خصوصاً یورپ میں پھیلائی جا رہی تھیں اس کو روکنے کی جان توڑ کوشش کا آغاز سب سے پہلے خود سرسید احمد خاں سے ہوا۔ انہوں نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا نہایت پر جوش جواب لکھا۔ وہ اس سے تو واقف تھے کہ اس وقت سلمانوں کے عقائد میں بہت سی ایسی باتیں داخل ہوگئیں ہیں جن کا اصلی احکام اسلامی میں کہیں پتہ نہیں ہے لیکن علوم اسلامیہ میں تبحرّ کامل کے نہونے کی وجہ سے وہ بذات خود صحیح راستہ تک نہ پہنچ سکے۔ تاہم انہوں نے مسلمانوں کو جمود سے نکال دیا۔ اور ان میں جستجو، تلاش اور صحت کی تحقیق کا احساس پیدا کر دیا۔ ان کی اسلام سے متعلق کتابیں ممکن ہے کہ صحت کلی پر مبنی نہوں لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح راستہ کی طرف راہبری کرنے والی ہیں۔ اردو زبان کی حد تک سرسید احمد خاں اور ان کے شرکاء کار کی مذہبی تحریریں بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ قدامت پرست مسلمان پہلے پہل تو ان کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہے۔ لیکن آخر کار ایک غیر معمولی طریقہ پر رفتہ رفتہ خود بھی اسی راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ یہ تبدیلی اردو زبان میں بہت سا مواد فلسفیانہ اسلامی تحریروں کے ذریعہ وجود میں لانے کا باعث ہوئی۔

مذہب اور معاشرت میں جو قریبی تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ سرسید جیسا شخص مذہب اسلام کی طرف متوجہ ہوتا لیکن مسلمانوں کی معاشرتی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیتا سرسید نے مسلمانوں کے دماغوں کو قدیم رسوم و رواجات اور فضول ظاہر پرستانہ مشاغل کے قیود سے آزاد کرنے میں اپنی عمر صرف کر دی۔

مغربی اقوام کے اصول زندگی کو کچھ تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ وہ تمام مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ سفر انگلستان کے منجملہ محرکات کے ایک محرک یہ بھی تھا کہ وہ وہاں کی ترقی یافتہ اقوام کے تمام اجتماعی اداروں کا بغور مطالعہ کریں تاکہ یہی چیزیں خود اپنے ملک میں بھی کامیابی کے ساتھ اختیار کی جا سکیں۔

غالباً سرسید کو انگلستان جانے کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ کسی قوم کی آئندہ ترقی، اصلاح اور بہبودی کا دارومدار کس حد تک تعلیم پر ہے۔ سرسید احمد خاں نے انگلستان کی قدیم ترین باوقعت جامعات آکسفورڈ اور کیمبرج کا بغور مطالعہ کیا۔ اور آخر وہ اصول اپنے ذہن میں محفوظ کر ہی لئے جن پر یہ ادارے کام کر رہے تھے۔ اپنی معلومات کا نہایت سلیقہ شعارانہ ثبوت سرسید نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اردو زبان کی زندگی میں یہ بے حد اہم موقع ہے۔ کیونکہ یہیں اس کے آئندہ ترقی دینے والوں کی ذہنیتیں مشکل ہوتی ہیں۔ اور گویا علی گڑھ کالج آئندہ جامعہ عثمانیہ کی شاندار عمارتوں کی تیاری کے لئے بنیادیں تیار کرتا ہے۔

علی گڑھ کی بالواسطہ کوشش کے علاوہ قیام سائنٹفک سوسائٹی اور اجرائے "تہذیب الاخلاق" ایسے واقعات ہیں جو اردو زبان کی ترقی پر براہ راست موثر اور اس کے بہت بڑے معاون ثابت ہوئے۔ ان کے ذریعہ اردو زبان میں بہت سی سائنٹفک کتابوں کا اضافہ ہوا بلکہ ایک سیدھا راستہ تمام کارکنان اردو کیلئے میسر آگیا۔

۱۰

دور تحریک کی پیداوار پر سرسری نظر

اس دور کی حقیقی عظمت کو بے نقاب کرنے کے لئے اس فصل میں اپنے قائم کردہ دور تحریک یا تاریخ ادبیات اردو کے چوتھے دور کے قریبی زمانے میں جو جو علمی کارنامے پیش کئے گئے ان پر ایک شعبہ واری نظر اس طرح ڈالنا چاہتے ہیں کہ جدید اور قدیم نمونوں کا ایک بالمقابل مطالعہ ہو جائے۔

اس وقت اردو زبان کے تمام شعبوں میں، تخریب، تعمیر، اصلاح، تجدید اور ترقی کا ایک عجیب سلسلہ بندھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اردو زبان کا سب سے پہلا تغیر جو ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ مذہبی تحریروں پر فلسفیانہ رنگ کا غلبہ پانا ہے۔ اب تک صرف الزامی مناظرے اور خیال پرستانہ عقائد کی تحریریں عام طور سے اردو میں مروج تھیں۔ یہ تحریریں ایسی تھیں کہ ان کو کسی عقل و شعور رکھنے والے شخص کے سامنے پیش کر کے، اس کو انکا معتقد بنانا بلکہ بسا اوقات ان کا سمجھانا بھی مشکل کام تھا، عیسائی مشنریوں کے رسالے تو فہم عامہ ضرور موثر ہوتے تھے لیکن مسلمانوں کی طرف سے ان کے جو جوابات ادا کئے جاتے وہ یا تو جھگڑے فساد کی صورت اختیار کرتے یا الزامی بحثیں ہوتیں۔ اکثر اوقات مغلظات کی بھی

بھرمار رہتی۔ سرسید احمد خاں کے معاصرین نے عیسائی پادریوں کی کتابوں کے جو جوابات لکھے یا خود آپس میں کسی معاشرتی یا مذہبی مسئلہ پر خامہ فرسائی کی، ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ مذہب کے وکیلوں کا جوش کیسے شرمناک طریقے اختیار کرتا تھا۔ "رفع النقاب" "تنبیہ الجہال" وغیرہ سے اس کا کافی ثبوت مل سکتا ہے۔ جب سرسید اور پھر ان کے ساتھیوں میں سے مولوی چراغ علی نواب محسن الملک مولوی مہدی علی نے اس شرمناک طریقہ کی اصلاح کرنی چاہی تو پہلے پہل ان کی بھی بری طرح آؤبھگت کی گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ ذہنیتوں میں ارتقا ہوا۔ اور لوگ انہیں بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے لگے۔

۲۔ دور تحریک کا ایک عظیم الشان کارنامہ اردو شاعری کی اصلاح ہے۔ شعر گوئی اس زمانے کا ہر دلعزیز اور وسیع ترین فن بنا ہوا تھا۔ لوگ ابھی ابھی لکھنؤ، رامپور، اور حیدرآباد کے مشاعروں سے متاثر ہو کر باہر نکلے تھے۔ میر، سودا جرأت، مصحفی، انشا، اور پھر امیر اور داغ، اور ذوق۔ مومن اور غالب کی شیریں بیانیاں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بچہ بچہ شعر کہنے پر تلا ہوا تھا۔ بایں ہمہ جو حالت اردو شاعری کی ہو رہی تھی۔ وہ فنی نقطۂ نظر سے کتنی ہی ذلیل کیوں نہ ہو، لیکن سوسائٹی کے لئے بھی اس کے اثرات زہریلے ثابت ہونے لگے تھے۔ اور سب پر طرہ یہ کہ اردو شاعری حیات انسانی سے اس قدر بُعد اختیار کر چکی تھی کہ یہ ایک بے سود اور فضول چیز بن گئی۔

اتفاق سے ایک انگریز عہدہ دار کرنل ہالرائیڈ، وزیر تعلیمات پنجاب کو اس کا احساس ہوتا ہے اور وہ محمد حسین آزاد کو لاہور میں ایک جدید طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالنے پر ابھارتا ہے (۱۸۷۴ء) کے مشاعرہ میں طرح مصرع کی جگہ موضوع نظم، طبع آزمائی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ آزاد ہی نے اس قسم کی نظموں کی ابتدا کی۔ اور حالی نے ان کی کوششوں کو بارآور کیا آزاد کی نظمیں چھوٹی چھوٹی مثنویوں پر مشتمل ہیں جن میں "مثنوی خواب امن" "مبارکباد جشن جوبلی" "مثنوی زمستان" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حالی کی بہت سی نظمیں جن میں "برکھا رت" "نشاط امید" "حب وطن" شامل ہیں۔ اسی مشاعرے کی پیداوار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جدید نظمیں اپنی جدت اور خوبیوں کے سبب لوگوں میں ہر دلعزیز بننے لگیں تھیں۔ لیکن انکی کامیابی کا سہرا حالی کے مسدس مدوجزر پر ہے۔ جو حالی کے سرسید سے ملنے کے بعد، اور خود انہیں کی تحریک پر لکھا گیا۔ مسدس کی کامیابی نے حالی کا پایہ اردو شاعری میں بلند کر دیا۔

اور یہ حسب اصلاح شاعری میں اپنی بڑی معاون ثابت ہوئی۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، لوگ اس کو شوق سے سنتے اور اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتے۔ غرض جس تحریک کی طرف اشارہ کرنل ہالرائیڈ نے کیا، اس کی ابتدا آزاد نے کی، اور حالی نے اس کو وسعت دیکر آئندہ نغز گفتار شعرا، اکبر، اقبال کے لئے راستہ تیار کر دیا۔

نظم کی اصلاحی تحریک کا ممتاز نشان غزلگوئی کی طرف سے رجحان کا ہٹنا اور موضوعی نظموں پر نظر کا جمنا ہے۔ فطری شاعری، اور قومی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ نظم معرا (بلینک ورس) کی ابتدا بھی اسی وقت سے شمار کیجا سکتی ہے۔

۳۔ حالی ہی کی کوششوں نے جدید شاعری کے ساتھ، مغربی طرز کی تنقیدوں کو اردو میں مروج کیا۔ اس سے پہلے تنقید کا صحیح مفہوم اردو زبان میں تو مفقود تھا ہی۔ لیکن تنقید کے اچھے نمونے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے اور تنقید کے معنے تعریض یا توصیف کے ہوتے تھے۔ موخر الذکر کا نام "تقریظ" رکھا گیا تھا۔ جو دوستوں کے کارناموں کے ساتھ مخصوص چیز تھی۔ اسی طرح مخالفین کے لئے تعریض متعین تھی۔ اس میدان میں حالی کے ساتھ ساتھ شبلی نے بھی قدم رکھا۔ چنانچہ ذہنیت کی تبدیلی کی وجہ سے اردو زبان میں "یادگار غالب" "مقدمۂ شعر و شاعری" "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر" جیسی بعض بہتر تنقیدیں پیدا ہو سکیں۔ لیکن حالی معقولیت کے حدود کے اندر ہی رہ کر بھی کبھی جانبدار تنقیدیں لکھ جاتے ہیں اور شبلی عموماً خیال پرستی (Sentimentalism) کے دائرہ میں محصور ہو کر، رجال پرستی شروع کر دیتے ہیں "موازنہ" اسکا اچھا ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔

۴۔ حالی اور شبلی ہی کی مساعی کا ایک دوسرا رخ سوانح نگاری بھی ہے۔ اردو میں مغربی طرز کی حاوی اور تنقیدی سوانح عمری کے آغاز کا سہرا حالی کے سر ہے۔ "حیات سعدی" "یادگار غالب" "المامون" "الفاروق" وغیرہ اردو زبان کی عمدہ سوانح عمریاں ہیں۔ "حیات جاوید" اس صنف ادب کی ایک مکمل پیداوار ہے۔ جو انگریزی کی بہترین "بیوگرفی" کی مدمقابل ہو سکتی ہے۔

۵۔ اسی زمانے میں ذکاءاللہ دہلوی مقالہ نگاری میں مصروف ہوئے۔ مقالہ نگاری کی ابتدا تو سرسید احمد خاں اور ان کے ہمنواؤں سے ہو چکی تھی۔ لیکن ذکاءاللہ کے انگریزی مقالوں کے ترجمے، اور انکی اتباع میں خود دوسرے طبعزاد مقالے، اردو دان پبلک میں

مقالہ کو ہردلعزیز بنانے میں بے حد کامیاب ثابت ہوئے۔

۶۔ ذکاءاللہ دہلوی اور شبلی اردو زبان کے اولین مورخ ہیں، جنہوں نے تاریخوں کا مواد نہایت مستند ذریعوں سے اخذ کرکے، اہم تاریخیں پیش کیں۔ انکے سامنے انگریزی تاریخوں کے مکمل نمونے موجود تھے۔ جن سے انہوں نے مواد کو فراہم کرکے اس کی چھان بین اور کانٹ چھانٹ کا صحیح طریقہ سیکھا۔

۷۔ اردو لسانیات اور تذکرہ نگاری پر آزاد نے قلم اٹھایا۔ فارسی، عربی ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقفیت نے ان کو اس کام کا بے حد اہل بھی ثابت کیا۔ لسانیات میں جتنی معلومات پر دسترس حاصل ہوسکتی تھی، ان کو آزاد نے نہایت سلیقہ کے ساتھ پیش کیا۔ "آبحیات" کا ابتدائی حصہ جس میں آزاد نے اردو زبان کی پیدائش اور اس کے ترکیبی عناصر پر تفصیل او صحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے وہ درحقیقت لسانی نقطۂ نظر سے آزاد کی نہایت قابل قدر کوشش ہے۔ آزاد سے پہلے تو خیر شاید ان کے بعد بھی کسی اردو مصنف نے اس مسئلہ پر اس اہمیت کے ساتھ نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

تذکرہ نویس کی حیثیت سے آزاد کا درجہ کچھ ایسا بلند نہیں۔ کیونکہ قدیم اردو اور فارسی تذکروں کے مقابلہ میں اس میں شاید ہی کچھ اضافہ ہو۔ تاہم آزاد کے تفحص نے کاوش کرکے قدیم شعرائے اردو کے متعلق بعض ایسی معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں جن سے ان شعرا کے کردار اور انکے ماحول پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ اس کے سوائے ان کے مشہور تذکرہ میں بہت کم امور قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ نویسی کا طریقہ اردو اور فارسی میں تاریخ ادبیات کی جگہ رائج اور اسکی کمی کو پورا کرنے کے لئے مروج ہوا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جو خامیاں قدیم تذکروں میں نظر آتی ہیں آزاد کے پاس بھی کم وبیش موجود ہیں۔ شاعروں کے کلام پر جو ریویو کیا گیا ہے وہ ایک دوسرے سے اس قدر ملتا جلتا نظر آتا ہے کہ کسی میں کوئی انفرادیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

۸۔ اردو افسانہ نگاری کے لئے بھی یہ دور بے حد مسعود ثابت ہوا۔ اس میں خیالی افسانوں سے فطری افسانوں پر عبور حاصل ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور حافظ نذیر احمد کی کوششوں سے افسانہ نگاری ایک مفید اور دلچسپ فن کا درجہ حاصل کرنے لگی۔ لیکن عبدالحلیم شرر پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو افسانہ نگاری کے معیار کو معتدبہ بلندی تک

پہنچایا۔ اور اردو دانوں میں خیالی افسانوں کے بجائے انگریزی طرز کی فنی اور تاریخی ناولوں کے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا۔ شرر ہی سب سے پہلے اہل قلم ہیں جن کے افسانے انگریزی ناول کے اصول پر لکھے گئے۔ ظاہری شکل اور اکثر معنوی خوبیوں کے اعتبار سے شرر کے ناول بالکل انگریزی ناول کا چربہ ہیں۔ شرر کی غیر معمولی کامیابی نے تمام اردو فسانہ نگاروں کو انہیں کے نقش قدم پر چلنا سکھایا۔ جدید طرز کی ناولوں نے قدیم خیالی اور فوق الفطرت افسانوں کو پایہ اعتبار سے گرا دیا۔ فطرت نگاری اب اردو ناول کا اصل اصول بن گئی ہے۔

اس زمانے میں ادبی اور علمی میعادی رسالوں کو آزادی نصیب ہوئی۔ ان اخباروں اور رسالوں کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے اردو مدیران صحائف نے وہی اصول اختیار کیا جس پر مغرب کے خداوندان صحافت کاربند تھے۔ یہ مختصر قصوں کو رسالوں اور اخباروں میں جگہ دینا تھا۔ اس وقت سے آج تک مختصر قصہ نویسی کو عروج اور وسعت ہی نصیب ہوتی رہی اب قصے کے بغیر کسی رسالے یا میعادی اخبار کے پڑھنے میں عوام کو لطف ہی نہیں مل سکتا۔ غرض یہی احساس تھا جو اردو میں بھی انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے مختصر قصوں کے رواج پانے کا باعث بنا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس سوسائٹی نے بعض نہایت ضروری اور مفید علوم و فنون کو اردو زبان سے روشناس کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی تحریر و ترجمے موضوع میں سائنس، معاشیات، معاشرت، سیاسیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام براہ راست انگریزی زبان سے اردو میں منتقل کئے گئے یا انہیں کو سامنے رکھکر ان کی اتباع میں ان موضوعات پر طبعزاد مصنفات پیش کئے گئے۔ اور حقیقت میں یہی وہ مقام ہے جہاں جدید علوم و فنون کا دریا جنم لیتا ہے۔ اور سر سید احمد خاں کے معاصرین اور علی گڈھ کے متعلقین کی کوششوں سے راستے پا کر تمام دنیائے اُردو کو سیراب کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

اردو اخبارات اور رسائل کے جاری ہونے سے بھی اردو زبان کو معتد بہ فائدہ پہنچا ان کے ذریعہ اس دور کی تحریکات کو وسعت اور عالمگیری نصیب ہوئی۔ بلکہ زیادہ موزوں ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ انکی کامیابی کا دارومدار بڑی حد تک انہیں اخبارات اور رسائل پر تھا۔ رسائل اور اخبارات سے اردو زبان نے کس کس طرح استفادہ کیا، اس کا ذکر تفصیل چاہتا ہے۔

یہ ہے وہ مختصر خاکہ جو تاریخ ادبیات اردو کے عبوری اور تحریکی دور کی تمام پیداوار پر مشتمل ہے تاہم اس دور کی مختلف الموضوع پیداوار کا تفصیلی مطالعہ مزید ضروری اور مفید امور کو روشنی میں لانے کا باعث ہوگا۔ اس مختصر مقالے میں یہ اجمالی اشارے انکی طرف راہبری کرنے کیلئے کافی ہیں۔

اس دور کی تحریکات کا ذکر ہم اطمینان کے ساتھ اس وقت تک ختم نہیں کرسکتے جب تک اس اصولی تغیر کو بھی اس میں شامل نہ کریں جو اردو کے اسالیب بیان میں پیدا ہونے لگا تھا۔ جان گلکرسٹ موسس فورٹ ولیم کالج کی مساعی جمیلہ نے دور تحریک کے آغاز سے قبل ہی قدیم اردو اسالیب بیان کی تخریب کا سرمایہ فراہم کردیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم نے جدید اسالیب کے نمونے بھی چھوڑے تھے، جن کو سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے اپنا مطلع نظر بنایا اور انہیں کے نقش قدم پر چلکر شاندار کامیابی حاصل کی۔ اردو زبان کے جدید اسالیب بیانکی تعمیر میں بھی انگریزی زبان اور انگریزی قوم کے اثرات کا پورا پورا دخل ہے۔ انہیں اثرات کی وجہ سے قدیم حشو و زوائد سے مملو، پُر تکلف، مصنوعی اور پیچیدہ اسالیب کا رواج مفقود ہوتا گیا۔ خود سرسید احمد خاں کی حیات دو مختلف (قدیم اور جدید) اسالیب کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ پہلے وہ قدیم اسٹائیل کے مخالف نہ تھے۔ چنانچہ انکی پہلی علمی کوشش "آثار الصنادید" کے قدیم اسلوب بیان میں لکھے جانے کا حال مفصل درج ہوچکا ہے لیکن جب زمانہ کے تھپیڑوں نے سرسید احمد خاں کی آنکھیں کھول دیں تو وہ اپنی تمام قدیم چیزوں سے اکتانے لگے۔ اس احساس نے ان کی رہبری جدید اور انگریزی اسالیب بیان کیطرف کی۔ سرسید کی اثر پذیر اور موثر طبیعت نے جس طرح جدید اسالیب بیان کے اثرات قبول کئے، اسی طرح ان کو اردو زبان میں بھی مروج کرکے چھوڑا۔

مدیر

رسید کتب

۱۔ "بہشتی جھومر" از جناب محمد مرزا خاں صاحب دہلوی قیمت ۱۰/
۲۔ "یوروپین شعرائے اردو" از جناب محمد سردار علی صاحب۔ کتبخانہ مسجد چوک قیمت ۸/
۳۔ "تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد" " " " ۶/

سُہاگن کا راگ

(از جناب سید محمد اکبر وفاقانی صاحب بی اے (عثمانیہ))

ذیل کی نظم انگلستان کے شہرۂ آفاق شاعر براؤننگ کی نظم (A WOMAN'S LAST WORDS.) کو دیکھکر لکھی گئی ہے۔ براؤننگ کی نظم انگریزی معاشرت کے جذبات کی نمایندگی کرتی ہے! انہیں حالات میں ہندوستان کی صنف لطیف کے جو جذبات ہو سکتے ہیں، ان کا اس میں اظہار کیا گیا ہے۔

"مکتبہ"

او میرے لڑنے والے کینا! — مجھ سے جھگڑنے والے کینا!

یوں مجھ سے انجان نہ ہو جا — بے دل کا انسان نہ ہو جا

مجھ سے نہ لڑ میں ہوں البیلی — تیرے گھر میں نئی نویلی

مجھ لاچار سے لڑنا کیسا — بے ہتیار سے لڑنا کیسا

جس کی ہوں وہ مجھ سے خفا کیوں — اپنوں میں شکوہ و گلا کیوں

کوئل ہوں میں تیرے بن کی — جوگن ہوں میں من موہن کی

بے کس کی آواز یہی ہے — بے پر کی پرواز یہی ہے

تو ہے راجہ میں ہوں داسی — میں ہوں تیرے عشق کی پیاسی

وہ جادوگر جادو کر لے — وہ افسوں گر افسوں پڑھ لے

بن کے الفت دے دلداری — بن کے محبت دے بیماری

بن کے خدا اب بندہ کر لے — بن کے مسیحا زندہ کر لے

مالک میرا ناتھ تو ہی ہے — دکھ مشکل میں ساتھ تو ہی ہے

مجھ کو تو من باسی کر لے — میری روح کو داسی کر لے

روتی ہوں میں تیرے دکھ پر — خوش ہوتی ہوں تیرے سکھ پر

یہ جو کبھی ہوں روٹھ کے روتی — مفت کے غم میں جان کو کھوتی

ہے یہ فقط میری نادانی — میں نے تیری قدر نہ جانی

میں جو کچھ ہوں سو ہوں تیری — الفت تیری قسمت میری

جدید مطبوعات

خاص رسائل

اس سال اردو میعادی رسائل کی جدت طرازیوں میں ایک قابل ذکر چیز خاص نمبروں کی اشاعت ہے یہ اردو صحافت میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس جدت کی وجہ سے بعض اہم موضوعات مثلاً اردو اور دکنی پنجابی لٹریچر، مولانا شبلی کی فارسی شاعری، تاریخ ابجد، ترکی، مشرقی ادب پر واقعہ کربلا کا اثر، افسانہ نگاری اور اردو زبان، وغیرہ روشنی میں آسکے۔ اسی طرح بعض قابل قدر مقالات بھی اس تحریک کی پیداوار ہیں خاص نمبروں کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے ان میں ذوق نظر کا بھی سامان وافر موجود کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

اردو کی رفتار ترقی میں خاص نمبروں کی اشاعت نے تیز گامی پیدا کر دی ہے ان کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ علما سے زیادہ ایسے لوگ ان کے گرویدہ بن رہے ہیں جن کو علمی معاملات سے شاید کبھی دلچسپی نہیں تھی کم سے کم تفریح ہی کی خاطر سہی لیکن ایسے حضرات کو اپنے طرف متوجہ کر لینا خاص اشاعتوں کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

عام طور سے مغرب کے اکثر اخبار اور کچھ رسایل اس طرز روش پر گامزن ہیں۔ اس سے ان کا مقصد اپنی اشاعت کی توسیع اور دلچسپیوں میں اضافہ کرنا تو ہوتا ہے لیکن ذرا توجہ سے کام لینے پر زبان اور ادب کے لئے ان کو بے حد مفید بنایا جاسکتا ہے۔ شاید مصر کے مشہور شامی صحیفہ نگار علامہ جرجی زیدان کا طریقہ اس خصوص میں بہترین قابل تقلید نمونہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے وقیع اخبار "الہلال" کے کسی خاص موضوع سے متعلق شایع شدہ مضامین کو ایک جگہ جمع کر کے ان کو کتاب کی شکل میں پیش کر دیتا تھا "تاریخ تمدن اسلام" وغیرہ اسی طریقہ کی غیر فانی یادگاریں ہیں۔

بہرحال ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسایل اور اخبارات کی خاص اشاعتیں اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دے رہی ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو رسایل اور اخبارات کے خاص نمبر اپنی خوبیوں کے ساتھ ان کی فطری برائیوں سے بچنے کے ابھی قابل نہیں ہوے ہیں، ان کی کثرت اور ان کے ساتھ "حسن عریاں" کی اشاعت سے خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ مذاق عالمگیر استقلال حاصل نہ کر لے اور صحیفوں کے جاری کرنے کا اصلی مقصد خاص نمبروں کا اجرا نہ قرار پائے۔

مجموعی حیثیت سے تمام رسالوں اور اخباروں کی خدمات مع خاص نمبروں کی خدمات کے ہماری زبان کے لئے مفید ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہماری نظر کے سامنے اکثر خاص نمبر

موجود ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط سے زیادہ ہمیں متاثر کر رہا ہے لیکن فی الحال ہم انھیں کے چند نمونوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور اس لئے "نگار" کے مومن نمبر "مخزن" کے سالگرہ نمبر اور "زمانہ" کے جوبلی نمبر تک ہم محدود ہو جاتے ہیں۔

نگار نے اردو ادبیات عالیہ کے ایک نغز گفتار مگر بھولے ہوئے شاعر کی زندگی اور کلام پر مستقل اور مبسوط مضامین شائع کر کے ایک جدت طراز طریقہ سے اپنے روایتی وقار کو قائم رکھا اسکو ہماری زبان کی خوش نصیبی سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنے شاعر کی عظمت کی طرف حسن ظن کے ساتھ بڑھ رہے ہیں یہ ہمارے قومی احساس کی بین دلیل ہے مومن اپنی تمام قابلیتوں کے باوجود گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا امید ہے کہ اردو اور پھر نگار کی یہ کنج کاوی ہم کو حکیم مومن خاں کے پوری طور پر سمجھنے کے قابل بنا دیگی۔ مومن نمبر کل پانچ مقالات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک شاعر کی زندگی یا کلام پر کسی نہ کسی طرح روشنی ڈال رہا ہے۔ مومن کی شاعری سے زیادہ خود مومن کو سمجھنے میں طائرانہ نگاہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ کلام کو سمجھانے کے لئے تقابلی مطالعہ کا طریقہ بھی نہایت مستحسن ثابت ہوا ہے ان تنقیدی مضامین کے لکھنے کے دوران میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاعری اور چیز ہے اور شاعر کے متعلق لکھنا اور چیز۔ کلام مومن کا انتخاب گویا رسالے کو مکمل بنا رہا ہے۔

مخزن کے سالگرہ نمبر سے اسکی جدت مانوس سنجیدہ خرامی جھلک رہی ہے تصاویر کم گر خوب ہیں مضامین میں کثرت اور تنوع دونو کا لحاظ رکھا گیا ہے "دکن میں اردو" اور "پنجابی لٹریچر" نوعیت کے لحاظ سے ایک مگر نتیجے کے اعتبار سے دو مختلف مضامین ہیں اور خیال آرائی کیلئے دو وسیع میدان۔ علمی مضامین میں جدید سائنس کا ایک ورق یو میں آئی یورپ میں اسلام محنت کے نتیجے ہیں علمی پایہ کی نسبت ادبی اور ادب لطیف کا پایہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔ کئی افسانے اور کئی ایک چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں اگر کسی رسالہ کی موجودہ حالت سے آیندہ کا پتہ چلایا جاسکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "مخزن" دور ثانی میں بھی اپنے خیال کے مطابق عام اردو رسائل سے اپنا مذاق بلند رکھے گا۔

زمانہ کے جوبلی نمبر کی اشاعت خود زبان حال سے اسکی استقامت کا اعلان کر رہی ہے صوری اور معنوی دونو اعتبار سے "زمانہ نمبر" کا اہتمام محو زمانہ بن رہا ہے اسکی غیر معمولی اہمیت کا انحصار زیادہ تر اسکی تصویروں پر ہے جنمیں سے ہر ایک مفید اور کار آمد اور اکثر جدید اور قدیم اہل قلم کی کیا تصویریں ہیں ہر مضمون کو مصور شایع کرنے کی کوشش کیگئی ہے اور اسکو اتفاق سمجھئے یا رسالہ کی قسمت یا مدیر کی مقررہ تجویز کہ اکثر مضامین کسی نہ کسی مصنف اردو سے متعلق ہو گئے ہیں نثر کے حصہ میں تقریباً تمام مضامین مفید ہیں نظم کا حصہ طویل ہے ایک نیک آدمی کی فطرت اضطراری حالتوں میں کیا ہوتی ہے؟ اسکی اچھی ترجمانی سدرشن کا افسانہ کر رہا ہے زمانہ کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آپ مشاہیر اردو کی ایک محفل میں ہیں جنمیں سے ہر ایک آپ سے شناسائی پیدا کر کے رخصت ہو رہا ہے۔ اردو مصنفین کی اتنی تصویروں کا ایک جا ملنا محال ہے۔ اس وقت ان خاص نمبروں پر اکتفا کیا جاتا ہے آیندہ چند ایسے رسائل پیش کئے جائینگے جن میں سے ہر ایک کا ایک معمولی نمبر غیر معمولی اشاعت کے برابر ہے۔

مدیر

معلومات

لکڑی کے برادے سے شکر سازی | حال ہی میں پروفیسر ہیگ لینڈ نے اسٹاک ہوم کانفرنس میں لکڑی کے برادے سے شکر بنانے کے متعدد طریقے بتلائے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ جینوا میں جب تجارتی نقطۂ نظر سے اس پر تجربہ کیا گیا تو لکڑی کے برادے سے ۶۰ اور ۷۰ فی صدی کے قریب شکر برآمد ہوئی سویڈن میں جہاں لکڑی کثرت سے پائی جاتی ہے یہ تحقیق بہت کارآمد ثابت ہوگی۔

ہیڈروجن گیس سے ہیلیم کی تیاری | جامعۂ برلن کے کیمیائی معمل میں دو سائنس دانوں نے ہیڈروجن گیس (جو سب سے ہلکی ہے) سے ہیلیم کو حاصل کرنے میں کامیاب تجربے انجام دیے ہیں یہ فی الحقیقت ایک عجیب و غریب تحقیق ہے اور اس کی ارتقائی صورت دنیائے سائنس میں ایک نئے شعبے کا اضافہ کرے گی ابتداءً یہ امر بہت ہی بے بنیاد سمجھا جاتا تھا کہ کسی عنصر کو دوسرے میں تبدیل کرسکتے ہیں لیکن برق کی کرشمہ سازیوں نے اب گوناگوں انکشافات کا باب کھول دیا ہے چنانچہ برلن ہی کے ایک پروفیسر نے پارہ میں طاقت دار برقی رو گزار کر پارہ کو سونے میں تبدیل کر دیا ہے۔ قدیم زمانے کے لوگوں نے بھی اس میدان میں جولانیاں کھلانے کی کوششیں کی ہیں لیکن چونکہ ان کا عمل اصول پر مبنی نہیں تھا اس لئے ان کی ناکامی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دُور نمائی | لاسلکی ٹیلیگرافی اور ٹیلیفون نے دنیائے کاروبار میں جو آسانیاں پیدا کر دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں پہلے پہل اس ایجاد کو عوام نے مافوق الفطرت چیز سمجھا لیکن جب انھوں نے اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہیں یقین ہوا کہ ہاں دنیا میں انسان یہ بھی کرسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں محققین نے ایک اور بات معلوم کی ہے جو "دُور نمائی" کے نام سے یاد کی جاتی ہے اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنے گھروں میں بیٹھ کر لندن اور فرانس کی مجالس رقص و سرود کا لطف اٹھاتے تھے لیکن اب وہاں کے مناظر، طرز زندگی اور نمایشوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں اس اصول کا نام دور نمائی ہے۔ آلہ کے اوپر ایک پردہ ہوتا ہے جب ہم آلہ کو چالو کر کے گفتگو شروع کرتے ہیں تو متکلم ہمارے روبرو رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کر رہے ہیں ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ تین ابعاد کی بجائے دو ابعاد ہوتے ہیں۔ اس تحقیق نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور بالخصوص یورپ کی عورتیں تو اسکو اپنے لئے آیۂ رحمت سمجھتی ہیں وہ گھر بیٹھے روزانہ مختلف مقامات کے فیشن کا معائنہ کرتی ہیں، لندن میں رہنے والی عورتیں ہر شام پیرس کی تبدیلی فیشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں، تجارتی معاملات روبرو طے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس آلہ کی قیمت ریڈیو ٹیلیفون سے زیادہ نہیں ہوتی ابھی اس آلہ میں بہت سی باتیں ترمیم طلب ہیں اور امید ہے کہ پانچ چھ سال کے اندر اندر یہ چیز نہایت اچھی صورت میں منظر عام پر آجائے گی۔ (ف م)

مجلّہ مکتبہ کی خریداری میں سہولتیں

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس (۴۰) روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ (۶۰) روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات خرید فرمائیں گے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس (۲۵) روپے کی مطبوعات مکتبہ یا پینتیس (۳۵) روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک رسید دی جائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیج دیں رسالہ اُن کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں۔ اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

حسب ذیل ماہانہ و ہفتہ وار رسالے اور اخبار مکتبۂ ابراہیمیہ سے خریدے جا سکتے ہیں:-

نام	کلدار	عثمانیہ	نام	کلدار	عثمانیہ
نیرنگ خیال	۵ر کلدار	معادل ۵ر۱۰ا عثمانیہ	زمانہ	۸ر کلدار معادل	۹ر۴مر عثمانیہ
عالمگیر	۵ر "	۵ر۱۰ا "	مخزن	۶ر "	۷ر "
عصمت	۵ر "	۵ر۱۰ا "	مجلّہ مکتبہ		۶ر "
بنات	۲ر "	۲ر۴مر "	تجلی (سہ ماہی)		۱۲ر "
نگار	۸ر "	۹ر۴مر "	مجلّہ عثمانیہ (")		عـ۸ـر "
معارف	۸ر "	۹ر۴مر "	نظام گزٹ (ہفتہ وار)		۲ر۶ا "
ہمایون	۸ر "	۹ر۴مر "	رعیت	"	۲ر "

عالمگیر (خاص نمبر) عسعہ کلدار عسعہ عثمانیہ۔ نیرنگ خیال (عید نمبر) عسعہ کلدار عسعہ عثمانیہ

زمانہ (جوبلی نمبر) عسعہ " عسعہ " ہمایون (سالگرہ نمبر) عسعہ " عسعہ "

مخزن (سالگرہ نمبر) عسعہ ک عسعہ عثمانیہ

جدید و تازہ کتب

وہ کتابیں جو حال ہی میں ہندوستان میں شایع یا مکتبہ میں آئی ہوی ہیں اس قسم کی کتابوں کی فہرست ماہانہ مجلہ میں درج ہو گی۔

تفسیر بیان القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی للعہ
پیغام سروش از ایم اسلم عا/
ناموس اسلام از محمد ہاشم عہ
بچوں کے گیت از محمد اسمٰعیل ۳۶/
سنہری گیت از سید وجاہت حسین ۵/
گیتان جلی مترجمہ نیاز فتحپوری عا/
مراۃ الغالب از بیخود دہلوی ۱۲/
دی نیو اسکول آف اردو لٹریچر (انگریزی) عہ
اسکوٹنگ کھیل از غلام محبوب ۱۰/
مباحثہ گلزار نسیم از محمد شفیع ۱۲/
آئین اردو از زین العابدین عہ
سوراجیہ کا راستہ۔ از نارائن دت سہگل عصہ
بہار درشن از رام سروپ عہ
پیغام آزادی از تلک عا/
مجموعہ تقاریر سی آر داس ۱۵/
کلام منشی تلوک چند محروم ہر حصہ ۱۲/
مظلوم کسان از لالہ شام داس ۸/

محبان وطن از اجیت سنگھ ۱۵/
انقلاب روس از آنند کشور جی ۱۵/
مہاراجہ اشوک از شردھے پرکاش ۱۵/
یورپ کی تہذیب کا دیوالہ۔ از اسوگ ماکس ۱۲/
ہسٹری آف اردو لٹریچر (انگریزی) از رام بابو سکسینہ ۱۲/
ہسٹری آف انڈیا (انگریزی) ۱۲/
حیات فرشتہ از محمد الدین ۹/
درس حیات از محمد اکبر عہ
ارتقاء تمدن از غمارہ ۵/
مسٹر بہاری بھرکم از " ۸/
مسٹر مجنوں از " ۸/
عربوں کا تمدن جامعہ ملیہ دہلی عا/
نکات رموزی از ملا رموزی عہ
صراط الحمید سفرنامہ عراق و حجاز از الیاس برنی عا/
فلسفۂ خواب از محمود علی ۱۲/

رشد الراشدین از محمود علی عہ
دختران شمشیر از سعادت سلطانہ عہ
غازی انور پاشا از سید ظہور احمد عہ
اکابر قوم از اکبر شاہ خان ۸/
برزخ از سید محمد ذوقی ۱۵/
مشاہیر ہند از شیخ نذر محمد ۱۲/
میزان عمل از امام غزالی مترجمہ ملک نصر اللہ خان عہ
انسان کامل از سید عبدالکریم بن ابراہیم عا/
نغمات مترجمہ فضل میراں ۱۲/
مشاہیر اسلام حصہ اول دوم فی ۱۲/
مذہب اور تلوار از اکبر شاہ خان ۱۳/
رموز شادی خانہ آبادی از محمد خلیل خان ۱۵/
مصنوعی شوہر از قاضی شفیع الزماں ۳/
تاریخ اندور از خافی خان ۱۵/
مولانا شبلی از سعید انصاری ۱۲/
پیکر وفا از خاتون اکرم ۸/

چند پرند از مرزا اسلیم بیگ۔ اس میں پرندوں کے متعلق حسب ذیل معلومات جمع کئے گئے ہیں (۱) پرندوں کے اعضا پر مختصر بحث (۲) چڑی مار اور فن چڑی ماری (۳) پرندوں کا شکل و صورت اور طریق زندگی (۴) پرندوں کی داشت اور انکی ضرورتیں (۵) پرندوں کے امراض اور علاج۔

مختلف چڑیوں کی (۲۰) عدد نفیس تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ قیمت (عا/)

صراط الحمید

یعنی

مقامات مقدسہ کا دلکش اور دل افروز سفر نامہ

عراق، شام، فلسطین اور حجاز ان چاروں اسلامی ممالک کے چشم دید حالات۔ دینی مقامات بالخصوص بغداد شریف، کربلائے معلےٰ، نجف اشرف، کاظمین شریفین، سامرہ شریف، دمشق، بیت المقدس، بیت اللحم، خلیل الرحمٰن، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ سب جگہ کے تبرک زیارات، حج بیت اللہ کے تمام مسائل و تفصیلات سب سے بڑھ کر جابجا قرآنی معارف اور ایمانی نکات قلبی روابط کے نازک اشارات، عبارت کی لطافت گویا آب حیات، ایک درجن قابل دید عکسی تصویرات۔ سفر کے مکمل ہدایات و نقشہ جات غرضکہ عامۃ المسلمین اور بالخصوص حجاج و زائرین کے واسطے یہ سفر نامہ واقعی بڑی نعمت ہے، بے نظیر ہے، ہاتھوں ہاتھ جا رہا ہے۔ لکھائی چھپائی نفیس حجم ۲۵۰ صفحے علاوہ نقشہ جات۔ قیمت دو روپے تیرہ آنے (عہ ۲/۱۳)

تائیس

اناطول فرانس

نے ایک ایسا ناول لکھا ہے جسے اس نے سوا لاکھ کا نوبل پرائز دلاتے ہیں مدد دی۔ ناول کیا ہے اہرمان اور یزدان کی جنگ ہے شیطانی اور ملکوتی قوتوں کی کشمکش ہے، اسکندریہ کی ایک آراستہ اور معطر عروس بازاری اور دشت لیبیا کے ایک نیم وحشی اور نامغسول راہب کے ارادوں کا الجھاؤ اس صداقت سے بیان کیا ہے کہ پاپائے روم نے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا۔ قریباً ۵۰۰ صفحہ کی مجلد کتاب قیمت عہ ۲/۱۲

پریم پچیسی

حصہ اول و دوم

ادیب فطرت نگار منشی پریم چند کے مختصر افسانوں کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مقبول مجموعہ جو پہلا اڈیشن تمام ہونے کے بعد کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتا تھا قیمت حصہ اول و دوم کامل ہے ۱۲/

پریم بتیسی

حصہ اول و دوم کامل للعہ ۶/

جمال یار

علامہ نوری اور مہاراجہ سرکشن پرشاد اعظم بہادر کے پرکیف خطوط کا مجموعہ۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

ہیبتناک افسانے

مترجمہ سید امتیاز علی تاج

موریس لیول عہد حاضر کے فرانسیسی ادیبوں میں مشہور و ممتاز افسانہ نویس ہیں۔ طنز۔ وحشت ہیبت اور تاثیر گداز اُن کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہیں مصنف مذکور کے تیرہ بے مثل افسانے اس مجموعہ میں نہایت خوبی و عمدگی سے درج کئے گئے ہیں جنکی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ بنک کا منیم (۲) کون (۳) ٹھاٹھ (۴) لال لیمپ کی روشنی میں (۵) ایک غلطی (۶) تخفیف جرم کی وجہ (۷) اعتراف (۸) باپ (۹) یوں ہی (۱۰) فقیر (۱۱) وہ بدمعاش مرد (۱۲) آلودگی (۱۳) ۵۰۔۱۰۰ کی ایکسپریس

ان میں سے اکثر افسانے مخزن اور اردو کے دوسرے مشہور رسائل میں چھپ کر بے حد مقبول ہو چکے ہیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ مغربی افسانوں کا یہ اردو میں بے مثال مجموعہ ہے۔ کاغذ کتابت طباعت نہایت نفیس جلد خوشنما۔ قیمت عہ/

بیس آنے (۲۰) میں نو

بہترین افسانے

(۱) تصویر عروج (۲) زور بازو (۳) پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی کا مالک (۴) فولاد کا شہزادہ (۵) نوجوان لکھ پتی (۶) گلڈری میں لال (۷) قبر پرستی (۸) العین بالعین (۹) دور اندیش۔ ان دو دھری اور دلچسپ افسانوں کے مجموعہ کا نام عروج زندگی ہے۔ قیمت عہ ایک روپیہ چار آنے

ایک روپیہ میں گیارہ

(۱) بنت الرشید (۲) انجام ہوس (۳) کرشمۂ تعلیم (۴) نیرنگی تقدیر (۵) عروج و زوال (۶) انتقام قدرت (۷) ترکی ٹوپی (۸) خونی گلوری (۹) صلۂ طاعت (۱۰) پاداش گناہ (۱۱) چاہ کندہ را چاہ درپیش

یہ گیارہ افسانے وہ افسانے ہیں۔ جن کو بے انتہا پسند کیا گیا ہے جو اپنی دلچسپی اور عبارت آرائی کے ساتھ موثر بھی ہیں اور نتیجہ خیز بھی ہیں ان افسانوں کے مجموعہ کا نام درس عبرت ہے۔ قیمت عہ/

ایک روپیہ میں دس

ولولہ انگیز افسانے

(۱) پیر فرتوت (۲) خواب پریشاں (۳) تیر از کمان جستہ (۴) تازیانہ عبرت (۵) اشتہاری شادی (۶) بھائی بہن (۷) فریب دولت (۸) عیار طبیب (۹) ثمرۂ محبت (۱۰) چاندنی چوک میں۔ ان دس افسانوں کا مجموعہ **زندگی کی صبح شام** کے نام سے مشہور ہے یہ وہ سچے عشق و محبت سے لبریز افسانے ہیں جنکے پڑھنے کے بعد دنیا کے تمام ناول اور افسانے حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ دلچسپ ہیں۔ مفید ہیں۔ عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہیں۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے عہ

ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

یونانی علاج کی شاندار کامیابی

ایک [illegible] طبیب کی رائے

یہ امر اطبائے قدیم و جدید کا مسلمہ ہے کہ مرض برص صعب تر اور ناقابل مداوا ہے اس وجہ سے کہ منحوس مرض جذام جو علاج مجذوم کی شکل اور وجاہت کو بگاڑ کر کریہ المنظر بنا دیتا ہے اسی طرح یہ مرض بھی مریض کے جسم کو بدنما کر دیتا ہے اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ جواب مبروصین کیلئے مایوس کن ضرور ہے لیکن ہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دنیا میں کوئی ایسا مرض نہیں پیدا ہوا جس کی دوا قادر مطلق نے نہ پیدا کی ہو چنانچہ اس لاعلاج مرض کے معالج بھی بلدہ حیدر آباد میں بافضال لم یزل موجود ہیں جنھوں نے سالہا سال کی عرق ریزی و دماغ سوزی اور تجربہ سے آخر اس مرض صعب کا علاج تحقیق کیا اور آپ ہماری مراد مولوی الحاج حکیم **محمد عبد القادر صاحب** سابق مددگار صدر مخزن ادویہ یونانی حال مددگار شفاخانہ [illegible] اولی سرکار عالی ساکن سلطان شاہی ہیں حکیم صاحب نے فارغ الامتحان ہونے کے بعد طبیب خاطر حصول تجربیات کیلئے میرے ہی زیر نگرانی عرصہ دراز تک نہایت سعی اور خاص پابندی کے ساتھ اصول علاج اور کارہائے مطب کو سیکھا اور کامیاب رہے حکیم صاحب عہد حاضر کے اطبا میں ایک ممتاز خصوصیت رکھتے ہیں ان کا ذہن رسا، فکر عمیق، نظر دقیق تجویز نسخہ اور تشخیص مرض قابل تحسین ہے تقریباً بارہ سال سے مرض برص کے علاج اور اس کے امور معینہ کی تحقیقات میں مصروف ہیں اور مرض مذکور (کوڑھ اور سفید داغ) جس کا علاج نہایت مشکل ہے کے معالج خصوصی ہیں میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ صاحب موصوف اس مرض کے تداوی و علاج میں خاص ید طولیٰ رکھتے ہیں بلکہ اس کی دوا مجربہ کے موجد ہیں۔ ان کے پاس رجوع شدہ مریضان برص کا میں نے بارہا برای العین مشاہدہ کیا ہے کہ مریض بالکل اچھا ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مریض مریض ہی نہ تھا مقام برص یعنی سفید داغ بالکل اصلی ہمرنگ بدن ہو جاتا ہے میں عامۃ الناس کی توجہ اس جانب متوجہ کرانا چاہتا ہوں اور نہایت زور کے ساتھ اس امر کی سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مبروصین کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو مغتنم سمجھتے ہوئے حکیم صاحب سے علاج کرائیں، اور اس منحوس مرض سے نجات پائیں۔ وما علے الرسول الا البلاغ

(حکیم) (محمود صمدانی)
مددگار مہتمم دواخانجات یونانی ممالک محروسہ سرکار عالی

جمیل اینڈ کمپنی

[illegible] کی دواخانہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن جہاں سے دن رات دوا مل سکتی ہے ہر شخص کی [illegible] نسخہ تیار ہوتا ہے آپکی ضرورت پر فوری امداد ملتی ہے بلدہ کے علاوہ اضلاع پر بھی دوائیں احتیاط سے روانہ کیا [illegible] تجربہ [illegible] مقوی اور گرامیں مفرح [illegible] کی نمایاں کارگزاری ہے مرکبات ادویات کا ذخیرہ موجود ہے [illegible] کیلئے [illegible] متعدد امراض میں فوری فایدہ دیتا ہے کس گھر میں بھی نہیں [illegible] اس کا استعمال خود ثابت کریگا ہر جگہ سے بھیجئے۔
[illegible] محفل میں جو [illegible] شریفوں کا دل دھڑکتا ہے سستے علاج سے اپنے پاؤں کے [illegible] دوا [illegible] داد کلیف [illegible] اور لاعلاج نہیں لیکن دوستوں کیلئے

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے ال ال بی

۱ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے جو ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

۲ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے۔ حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴ قیمت سالانہ للعہ مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کیلئے عاہں فی پرچہ ۶ر

۵ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے صہ نصف کیلئے سے اور چوتھائی کے لئے عہ ہے۔ اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ۱/۲ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

۶ ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط منتظم مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

منتظم مجلہ

رجسٹرڈ نشان پتہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان پتہ سرکار انگلشیہ (...)

مجلّۂ مکتبہ

جلد (۱) شمارہ (۳)

بابتہ ماہ امرداد ۱۳۳۷ف م جون ۱۹۲۸ء

فہرست

شذرات

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ حیدرآباد دکن کے ایک قدیم شاعر اور ادیب مولانا سید شاہ ابراہیم عفو نے نود سال کی عمر میں ۲۷ اردی بہشت ۱۳۵۶ف کو انتقال کیا۔ مولانا عفو ان چند باقیات الصالحات سے تھے جنھوں نے ہندوستان کے کئی انقلابی دور دیکھے۔

عفو صاحب کی ولادت اور تعلیمی نشو و نما مدراس میں ہوئی تھی۔ یہیں آپ نے عربی اور فارسی کی تکمیل کی۔ انگریزی میں بھی مہارت حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹری میں ڈپلوما حاصل کیا اس کے بعد حیدرآباد دکن آرہے۔ یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد مہتمی تعمیرات آبپاشی سے وظیفہ حسن خدمت پر علٰحدگی اختیار کی۔ تصنیف و تالیف کے صلہ میں اعلیحضرت سلطان العلوم کی بارگاہ سے آپ کو تصنیف و تالیف کا وظیفہ رعایتی بھی عطا ہوا تھا۔

اردو میں آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ حضرت خالد بن ولید کی سوانحعمری۔ نورجہاں۔ تحفۂ عشاق قواعد حرف نے مثنوی عاشق رسول شایع ہوچکی ہیں۔ ابھی کچھ کلام مسودات کی حالت میں ہے۔

مرحوم کی ایک غزل اس اشاعت میں شامل ہے۔

اردو زبان کی مضمر لگاوٹوں نے آخرکار کلیۂ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کے ایک قابل پروفیسر انگریزی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) کو اپنے مقالہ (دی انفلوئنس آف انگلش لٹریچر آپ آن اردو لٹریچر) کی تکمیل کے بعد سے، جو گہری دلچسپی اردو کے ساتھ پیدا ہوگئی ہے اس کا اظہار وہ غالب کے دیوان کو تاریخ وار ترتیب دیکر کر رہے ہیں

ہم کو اس دیوان کے دیکھنے، دیباچہ کے پڑھنے اور پروفیسر صاحب سے طریقۂ کار پر گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے ہمیں یقین ہے کہ اُردو میں شاعر کے کلام کو تاریخی دوروں میں تقسیم کرنے کی یہ قابلِ قدر کوشش، ہمارے ادب کے لئے ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

دیوان کے ساتھ پروفیسر صاحب موصوف نے ایک مبسوط انگریزی کتاب بھی لکھی ہے جس میں غالب کی شاعری کے اصولی راستوں سے ان کی حقیقی عظمت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دونو چیزیں مغربی اُصول تحقیق اور تنقید کا بہترین نمونہ ہوں گی۔

دیوان انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ کی طرف سے شایع ہو رہا ہے۔ مانوگراف کا اُردو میں ترجمہ بھی ساتھ ہی ساتھ مولوی سید معین الدین قریشی بی۔ اے مدیر "مجلۂ عثمانیہ" خوبی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ دونو چیزیں عنقریب منظر عام پر آجائینگی۔

اُردو دنیا ایک ادیب اور پروفیسر زبان انگریزی کے اس احسان کو شاید کبھی نہ بھول سکیگی۔

اس اشاعت میں "محمد حسین آزاد اور جدید شاعری" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہو رہا ہے، وہ مسدوسی صاحب کی کتاب "جدید اُردو شاعری" کا ایک حصہ ہے، جو زیر ترتیب ہے۔ ہم نے بھی اس کے مختلف حصوں کو سنا ہے۔ جدید اردو شاعری کے بنانے والوں، آزاد، حالی، شبلی، محمد اسمٰعیل، اکبر اور اقبال کے کارناموں کا اس میں گہری تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

اس کے دیگر دلچسپ حصّے بھی آئندہ موقعوں پر ناظرین "مکتبہ" کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔

اِس مہینے کا رسالہ پریس سے نکل ہی رہا تھا کہ سرکار انگریزی سے سالِ نو کے خطابات کی فہرست ملی۔ اس میں ہمارا جاذب نظر ڈاکٹر نواب حیدر نواز جنگ بہادر، وزیر مالیات حیدرآباد کا اسم گرامی تھا۔ نواب صاحب درحقیقت قابل مبارکباد ہیں کہ آپ کی ملکی خدمات نے آپ کو اعلیٰ ترین اعزازات سے سرفراز کیا، آپ کی ہمدردیوں نے ملک کے بچہ بچہ کی زبان پر "مسٹر حیدری" کا نام جاری کردیا اور آپ کی علمی خدمات جو ان سب پر طرہ ہیں، معلوم نہیں کہ آپ کے مرتبہ کو کہاں سے کہاں تک پہنچا کر رہینگی۔

اس مہینے کا رسالہ مع شل اگلے دو رسالوں کے تمام کرمفرماؤں کی خدمت میں نمونتہً اور ہدیتہً پہنچ رہا ہے۔ امید ہے کہ اکثر بزرگوں نے رسالہ کے متعلق اپنی رائے قائم کرلی ہوگی۔ دفتر کو آپ کے تصفیہ کا سخت انتظار ہے۔

شکر اور صبر

ہمارے اُن معاصرین کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے، جنھوں نے اپنی مہربانی سے "مکتبہ" سے اپنے رسالہ کا تبادلہ منظور فرمالیا اور بعنوان 'ریویو' رسالہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

لیکن اکثر مقامات سے اب تک کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ پرچے تبادلہ میں روانہ کئے گئے اور نہ تبصرہ کی زحمت گوارا ہوئی۔

یقین ہے کہ تیسری اشاعت کے پہنچنے کے بعد، اِس طرف خاص طور سے توجہ مبذول کی جائے گی۔

(۞)

شعاعیں اور اشعاع[1]

از ڈاکٹر اے، ایس رسل - ڈی، ایس، سی

مترجمہ

جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی متعلم کلیۂ جامعہ عثمانیہ

ایک عامی جب اخباروں میں وقتاً فوقتاً سائنس کے حیرت انگیز انکشافات کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کی عقل حیران ہوجاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا ان واقعات میں حقیقت کا کوئی عنصر بھی موجود ہے یا یہ سب خیالی گھوڑے ہی ہیں۔ اس کا تصفیہ اس کی ادراک سے باہر ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں سائنس نے حیرت انگیز باتوں کا اعلان کیا ہے۔ مگر یہ سب باتیں بالکلیہ صحیح نہیں ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے پریوں کی تصویریں لی ہیں، دوسرا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے معمولی عناصر مثلاً سیسہ اور پارے سے سونے کو حاصل کیا ہے، تیسرا اس بات پر نازاں ہے کہ وہ اپنی آنکھ سے، محض دیکھکر، برقی آلات کی سوئی کو منحرف کرسکتا ہے۔ چوتھا گٹھیا کا مجرب علاج رکھتا ہے، پانچواں ذیابطیس کو دور کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور ایک چھٹا آدمی اعلان کرتا ہے کہ میں شعاعوں کے ذریعے مفید اور کارآمد تجربے مترتب کرسکتا ہوں۔ زمانہ کی ضروریات انسان کو جدید انکشافات کی طرف مائل کرتی ہیں اور اگر ان میں صداقت کا ذرا بھی شائبہ موجود ہو تو کوئی چیز ان کی ترقیات میں سدِ راہ نہیں بن سکتی۔ بشرطیکہ عقلِ سلیم سے کام لیا جائے۔ یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ زمانۂ حال کی سائنٹفک تحقیقات سائنٹفک اخباروں میں طبع ہوجاتی ہیں اور پھر ان کی باقاعدہ تحقیق کی جاتی ہے اور دوسرے ہمعصر سائنس داں ان کو تجربے کی کسوٹی پہ کستے ہیں۔ اگر تحقیق اعلیٰ ہو تو محقق کو خواہ وہ موجودہ زمانہ کا نیوٹن یا فیراڈے ہو یا نہو اس کا کافی صلہ ملتا ہے۔ جو ایجادات تحقیقات کے معیار پر پوری پوری نہیں اترتیں۔ طبعی سائنس ان کو کالعدم قرار دیتی ہے۔ اور اس کو دیوانہ کے خواب اور مجنوں کی بڑ کے مشابہ تصور کرتی ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کو طبعی سائنس کے

---

[1] RAYS AND RADIATION.

دائرہ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے لیکن علم تشخیصِ امراضِ نفسی کے جدید اور دلچسپ میدان میں ان کے لئے کافی جگہ ہے۔

اس جماعت کے محققین کی خاص خصوصیات ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کو بآسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی ذہنیت اور رسرچ پر کافی اعتماد نہیں رکھتے اور اپنی ایجادات یا نظریات کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، وہ اپنے خیالات کو پوشیدہ اور عقل ہی کے صندوق میں مقفل رکھنا گوارا کرتے ہیں۔ مجالس وغیرہ کا منعقد کرنا اُن کے مسلک میں ہرگز داخل نہیں ہے بلکہ وہ اپنی تحقیقات کے دفتر کو بجائے سائنس دانوں کے سامنے کھولنے کے ان بڈھوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اس لئے کہ یا تو سائنس دانوں کے ساتھ ملکر کام کرنا ان کے شایانِ شان نہیں ہے یا یہ کہ جب سائنس دانوں کے سامنے ان کے نظریات پیش ہوتے ہیں تو بدقسمتی سے تجربہ ہمیشہ ناکامیاب ثابت ہوتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل کسی طرح معقول نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص فی الحقیقت سونا بنانا جانتا ہے تو البتہ اس کے لئے مجالس کا منعقد کرنا یا اخباروں کے ذریعہ لوگوں کو اپنی ایجاد سے واقف کرانا واقعی تضیع اوقات ہے۔ برخلاف اس کے اس کو چاہیے کہ وہ سونا بنائے اور ہمیشہ بناتا رہے کیونکہ اس کے سونا بنانے سے دوسروں کا کیا نقصان ہے۔ بجائے اس کے اگر موجد چاہے تو حسب دلخواہ دولت کا مالک بن سکتا ہے اور اگر وہ شہرت پسند ہو اس کی شہرت میں چار چاند بھی لگ سکتے ہیں۔

حال ہی میں عوام کو شعاعوں اور اشعاع سے واقف کرا کے ان کے عجیب و غریب خواص کا اظہار کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ ان کی مدد سے سرطان کا مجرب علاج کیا جاسکتا ہے دور دراز فاصلہ پر کی موٹروں کو روک دیا جاسکتا ہے اور وہاں کے کسی مقام کو آگ بھی لگا دی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بادی النظر میں یہ باتیں مجنون کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں لیکن جب ہم سائنٹفک نقطۂ نظر سے اشعاع کی کرشمہ سازیوں کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بیشک مجنوں کی بڑ میں صداقت کا عنصر ضرور موجود ہے۔

جب ایک سائنس داں شعاعوں یا اشعاع سے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کے خیال میں اشعاع توانائی کا ایک سیلاب ہے۔ جو مبدا سے نکلکر دائری شکل میں ہر طرف کو بہتا ہے۔ یہ توانائی دو صورتوں میں خارج ہوتی ہے پہلی صورت میں یہ توانائی موجوں کے ذریعہ ایثر میں پھیلتی ہے اور دوسری صورت میں تیز تیز حرکت کرنے والے مادی ذرات کی شکل میں اشاعت پذیر ہوتی ہے۔ ان دونوں گروہ کی نوعیت اور خصوصیت بالکل جداگانہ ہے، لاسلکی اور معمولی نور کی موجیں گروہ اول کی مثال ہیں اور دوسرے گروہ میں وہ ذرات شامل ہیں جو ریڈیم سے تیز تیز نکلتے ہیں۔

پہلے گروہ میں بیشمار خصوصیات موجود ہیں اگر ہم ان کی خصوصیات کی تشریح کرنا چاہیں تو اس کے لئے ایک کتاب درکار ہوگی ۔ اس گروہ میں مختلف قسم کی موجیں شامل ہیں ۔ لاسلکی کی وہ موجیں جو بڑے بڑے فاصلے طے کرتی ہیں اور جن کا احساس ہمارے حواس خمسہ کو نہیں ہوتا ' زیرین سرخ (INFRA-RED) موجیں جو غیر مرئی ہیں لیکن اشعاع حرارت کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں ' معمولی نور جس کو ہم دیکھتے ہیں اور جو اشعاع کی ایک عام مثال ہے ' غیر مرئی مگر کیمیائی اثر رکھنے والی بالا نفشی (ULTRA-VIOLET) شعاعیں اور معمولی اشیاء کے اندر داخل ہونے والی 'لا' شعاعیں (X-RAYS) اس گروہ میں داخل ہیں ۔ داخلی نقطۂ نظر سے یہ شعاعیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ۔ لیکن ذہنی نقطۂ نظر سے بالکل ایک ہی ہیں ۔ یہ تمام شعاعیں فی الحقیقت موجیں ہی ہیں جو ۱۸۶,۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے ایتھر میں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور ان میں جو فرق ہے وہ صرف طولِ موج کا فرق ہے ' طول موج ' موج کی متواتر چوٹیوں کے درمیانی فاصلہ کو کہتے ہیں ۔ 'جہ' شعاعوں (GAMMA-RAYS) کا طول موج بہت چھوٹا ہوتا ہے اور لاسلکی کی موجوں کا طول بہت بڑا ہوتا ہے ('جہ' شعاعیں 'لا' شعاعوں کی ' ایک قسم ہے جو تابکار اشیاء سے خارج ہوتی ہیں) درمیانی موجوں کے لئے یہ فاصلے بدلتے رہتے ہیں ۔ اگر ہم ایک میٹر (۳۹½ انچ) کو طول کا معیاری پیمانہ قرار دیں تو 'جہ' شعاعوں کا طول ایک میٹر کے لاکھویں حصہ کے نصف لاکھویں حصہ سے لیکر اس کے سولہ گنا تک بدلتا ہے ' 'لا' شعاعوں کے لئے یہ فاصلہ متذکرہ فاصلہ سے لیکر اس کے ۱۵۰ گنا تک بدلتا ہے اور 'جہ' شعاعوں کے لئے یہ فاصلہ 'لا' شعاعوں کے انتہائی تبدیلی فاصلہ سے لیکر اس کے ۱۳۰ گنا تک بدلتا ہے ۔ یہ تمام شعاعیں ہماری آنکھ کے لئے بالکل غیر مرئی ہیں ان کو صرف ضروری اور خاص آلات کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے ' دوسری قسم کا اشعاع یعنی معمولی نور مرئی ہے اس کا طول موج ایک میٹر کے لاکھویں حصے کے ۲/۵ سے لے کر ۳/۵ تک بدلتا ہے ۔ طیف میں سرخ رنگ کی شعاعوں کا طول موج بڑا اور منفشی کا کم ہوتا ہے سرخ شعاعوں سے پرے غیر مرئی شعاعیں ہوتی ہیں جن کو ہم زیرین سرخ ۔ شعاعوں کے نام سے یاد کرتے ہیں ان کا طول موج سرخ موجوں کے طول موج سے لیکر اس کے ۴۰۰ گنا تک بدلتا ہے یہاں یہ موجوں کے طول کی تبدیلی میں ایک قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ لاسلکی کی بڑی موجیں اس وقت تک اشاعت پذیر نہیں ہوتیں جب تک کہ ان کا طول موج کم از کم ایک میٹر کا دو ہزارواں حصہ نہ ہو جائے ۔ یہاں سے موجوں کا طول مسلسل کئی ہزار میل تک بڑھتا چلا جاتا ہے ۔

موجوں کے طول کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کسی قدر پیچیدہ ہے ۔ ذیل کی مثال سے یہ

بات واضح ہو جائے گی کہ مختلف طول موج کے ترتیب سے کیا مراد ہے۔ اگر ہم 'جہ' شعاعوں کے طول کو ایک انچ کا دسواں حصہ فرض کریں تو 'لا' شعاعوں کا طول موج ایک انچ سے لیکر . اگز تک بڑھے گا۔ بالا بنفشی کا . اگز سے ... اگز تک۔ مرئی نور کا ... اگز سے ... ۲گز تک۔ اور 'زیرین۔ سرخ' شعاعوں کا طول موج ... ۲گز سے .. ۴ میل تک اور لاسلکی کی موجوں کا طول ... ۳ میل سے لیکر کئی لاکھ میل تک بڑھتا چلا جائیگا۔

اس میں ہمیں دو باتوں پر غور کرنا چاہیئے پہلے یہ کہ ہماری آنکھ ایک محدود طول موج کی موجوں کو دیکھ سکتی ہے اور اگر ہماری آنکھ مذکورہ بالا شعاعوں کو قبول کرلے تو پھر کائنات کا ذرہ ذرہ ہم کو ایک دوسرے رنگ میں نظر آئیگا۔ مثلاً ہماری آنکھ اگر 'لا' شعاعوں کے لئے حساس ہو جائے تو گویا ہم کائنات کو 'لا' شعاعوں کی آنکھ سے دیکھیں گے۔ ایسی صورت میں نظام کائنات میں ہمارے لئے رنگ کا کوئی وجود نہ ہو گا۔ درختوں میں سوائے عرق کے ہمیں کچھ نظر نہ آئیگا اور کوچہ و بازار میں اچھے خاصے انسان ہمیں صرف ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آنے لگیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ طول موج کی کمی و بیشی کے تسلسل میں جو ایک قسم کا ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ وہ عقل انسانی کے لئے اس قدر دلچسپ نہیں ہے' چنانچہ یہ فرض کرنا بھی کوئی ایسا زیادہ اہم نہیں کہ دو قسم کی شعاعوں کے درمیان کی خالی جگہ میں جو شعاعیں ہوتی ہیں وہ اپنے بازو والی شعاعوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زیرین سُرخ اور 'لا' شعاعوں کے درمیان جگہ خالی ہے لیکن اب یہ معلوم کیا گیا ہے کہ یہ جگہ خالی نہیں بلکہ پُر ہے' ساتھ ہی ساتھ اخباروں میں یہ اطلاعیں ملتی ہیں کہ ان شعاعوں کے خواص بہت زیادہ غیر معمولی ہیں۔ جو ایک حد تک بالکل غلط ہے کیونکہ ایسی شعاعوں میں کسی قسم کی کوئی غیر معمولی یا اہم بات نہیں پائی جاتی۔

لاسلکی کی موجیں اب بالکل عام ہو گئی ہیں اس لئے ان کے متعلق مفصل طور پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے لاسلکی کے اسٹیشن سینکڑوں میٹر لانبے طول موج کے ذریعہ توانائی کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرتے ہیں۔ بڑی طاقت کے اسٹیشنوں سے دور دراز مقامات پر جو موجیں ارسال کی جاتی ہیں ان کا طول موج .... میٹر لانبا ہوتا ہے اگر کسی خاص سمت میں موجوں کو مرتکز کرنا ہو تو اس مقصد کے لئے چھوٹے طول کی موجیں استعمال کیجاتی ہیں یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ لاسلکی کی موجیں ان تمام اشیاء میں سے گزر جاتی ہیں جو نور اور حرارت کی موجوں کے لئے غیر شفاف ہیں۔ چنانچہ یہ موجیں بڑے بڑے مکانات سے گزر جاتی ہیں البتہ مزاحم جسم میں اگر برق ہو تو کسی قدر مزاحمت درپیش ہوتی ہے ایسی صورت میں کچھ توانائی ضائع ہوتی ہے اور برقی رو پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم ہوائیہ میں موجوں کو چن لیتے ہیں۔ اگرچہ ہم کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہیں کر سکتے جس سے ان موجوں کو اپنے میں گزرنے نہ دیں۔ تاہم یہ موجیں اگر ہمارے اندر سے گزر جائیں تو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچتا۔

دوسرے قسم کا اشعاع زیرین سرخ موجوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ نام ان کو اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ سرخ شعاعوں کے اُس طرف کو ہوتی ہیں۔ اور ان کا طول موج بہ نسبت ان مرئی سرخ شعاعوں کے زیادہ ہوتا ہے ان شعاعوں کو ان کے حرارتی اثر کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ اس طرح سے حرارت کی شعاعیں اس لئے غیر مرئی ہیں کہ ان کا طول موج نور کی موجوں سے زیادہ اور لاسلکی کی موجوں سے کم ہوتا ہے اگرچہ ان شعاعوں کا مبداء آفتاب ہے لیکن ہر ایک گرم جسم اور ہر ایک مبداء نور سے ان کا اشعاع ہوتا ہے چنانچہ پانی گرم کرنے کے برتن سے جو موجیں نکلتی ہیں ان کا طول موج مرئی شعاعوں کے طول موج سے بارہ گنا بڑا ہوتا ہے اور ہمارے جسم سے جو حرارت کی موجیں نکلتی ہیں ان کا طول موج تیرہ گنا بڑا ہوتا ہے یہ شعاعیں ہوا میں اچھی طرح داخل ہوتی ہیں لیکن پانی میں نہیں اور عکاسی کی تختی پر تو ان کا اثر بالکل ناقابل لحاظ ہے۔ ان کا پتہ چلانے کے لئے جو آلات تیار کئے گئے ہیں ان کی حساسیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اس حرارت کو بھی معلوم کرسکتے ہیں جو ..اگز کے فاصلہ پر رکھی ہوئی واحد موم بتی سے نکلتی ہے۔

اس کے بعد نور کی مرئی شعاعوں کا درجہ ہے جن کی وجہ سے ہم چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں سفید نور میں جو رنگ ہوتے ہیں ان کے طول موج سرخ، نارنجی، زرد، سبز، آسمانی، نیلگوں، بنفشی رنگ کی شعاعوں کے لئے بتدریج گھٹتے جاتے ہیں۔ یہ رنگ طیف اور قوس قزح میں واضح نظر آتے ہیں پودوں کے کیمیائی نشوونما میں نور کی موجوں کا بہت بڑا حصہ ہے اور یہی وہ موجیں ہیں جن سے عکاسی کی تختی متاثر ہوتی ہے۔

جب نور کی موجیں سلینیم (SELENIUM) عنصر پر گرتی ہیں تو عجیب وغریب کیفیات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ دھاتی سلینیم ناقص موصل برق ہے۔ لیکن جب اس پر نور کی شعاعیں پڑتی ہیں تو اس کی موصلیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر سلینیم کو برقی دور میں شامل کر دیا جائے تو اس وقت تک دور پورا نہ ہوگا۔ جب تک کہ نور کی شعاعیں اس پر نہ پڑیں۔ جب دور پورا ہوجاتا ہے تو انجن کو روکنے اور سکان کو گھمانے اور دیگر متوقع کاموں میں ان سے مدد ملتی ہے۔ اسی طرح ایک دور دراز فاصلہ سے تار بیڈیو یا تہ آب کشتیوں کی حفاظت کیجاتی ہے اگرچہ یہ ایجاد واقعی قابل تعریف ہے تاہم نور کا عمل کچھ ایسا زیادہ غیر معمولی نہیں ہوتا۔ بلکہ نور کی شعاعوں کی ایک کثیر تعداد جب سلینیم پر گرتی ہے تو البتہ کسی دور مقام پر کے بٹن کو دبانے میں ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔

سلینیم عنصر بہت دلچسپ خواص کا اظہار کرتا ہے اور جب اس پر نور کی شعاعیں پڑتی ہیں تو اس میں اور بھی زیادہ دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے متعلق مزید معلومات ڈاکٹر فورنیر ڈالبی[1] کی جدید کتاب

[1] DR. FOURNIER D'ALBE

"سیلینیم" کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

بالا بنفشئی شعاعیں غیر مرئی ہوتی ہیں اور ان کا طول موج بنفشی شعاعوں کے طول موج سے کم ہوتا ہے عکاسی کی تختی پر ان کا نمایاں اثر ہوتا ہے اور یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ان کی پہچان آسانی سے کیجا سکتی ہے اس گروہ کی صرف وہ موجیں جن کا طول بڑا ہے فضا یا شیشے میں سے گزر سکتی ہیں۔ چنانچہ ان شعاعوں کی تحقیق میں ہمیں صرف اس لئے دقت واقع ہوتی ہے کہ ہمیں اب تک کوئی ایسا مادہ معلوم نہیں ہوا جس سے وہ بآسانی گزر سکیں البتہ (ملزسات) میں سے وہ کسی قدر بآسانی گزر سکتی ہیں۔ یہ بات کس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ ایک قسم کا ایسا بھی اشعاع ہے جو شیشے میں نہیں گزر سکتا۔ لیکن فی الحقیقت ہم سے جو غلطی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے اشعاع کو مرئی نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک مادہ جو ایک خاص طول موج کی شعاعوں کے لئے شفاف ہے ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کے لئے بھی شفاف ہو۔ جہ شعاعوں کا طول موج معلومہ شعاعوں کے طول موج سے کم ہے اور یہ شعاعیں ہر قسم کی مادی اشیاء سے بآسانی یا کسی قدر دقت سے گزر جاتی ہیں۔ مزاحمت مادہ کی نوعیت کے تابع نہیں بلکہ اس کی کثافت کے تابع ہوتی ہے مثلاً الومونیم، شیشے کے اتنا کثیف ہے اور یہ دونو بلحاظ کثافت سیسے کے ایک چوتھائی کثیف ہیں اب اگر الومونیم اور شیشے کی چار انچ موٹی چادر ان شعاعوں کو روک سکتی ہے تو سیسے کی صرف ایک انچ موٹی چادر سے یہ کام نکل سکتا ہے۔ بالا بنفشئی شعاعیں بعض خاص خواص کی مالک ہیں (BACTERIA) کو مار سکتی ہیں اور کھجلی اور دیگر مماثل امراض کو دفع کر سکتی ہیں۔ ان شعاعوں کی پیدائش پارہ۔ بھاپ مشعل میں معمولی روشنی کے ساتھ ہوتی ہے۔ برقی قوس سے بھی یہ شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور ان کو پیدا کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ میگنیشیم کے فیتہ کو ہوا میں جلایا جائے۔

اب 'لا' شعاعوں نے اپنے اس راز کو کھول دیا ہے جس کی وجہ سے آج سے کوئی ۳۴ سال قبل ان کو 'لا' شعاعوں کا نام دیا گیا تھا۔ جنگ سے قبل ان کی حقیقت کا مسئلہ سائنس دانوں کے یہاں بالکل لاینحل تھا لیکن سنہ ۱۹۱۲ء سے ان میں حقیقت کے آثار ہویدا ہونے لگے اور اب ان کی حیثیت بالکل دوسری شعاعوں کی سی ہے مگر ان کا طول موج بہت چھوٹا ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کو عجیب و غریب خواص کا مالک بنا رکھا ہے۔ شیشے کے منشور سے وہ بغیر کسی انحراف کے گذر جاتی ہیں اور عدسوں کا ان پر کوئی عمل نہیں ہوتا۔ ہلکی چیزیں مثلاً کاغذ، کپڑا، گوشت اور الومونیم ان کو اپنے اندر سے گزار دیتی ہیں۔ مگر بھاری اجسام مثلاً تانبا، سیسا اور ہڈیاں ان کو جذب کر لیتے ہیں۔ ان کی اس انوکھی خاصیت نے فن جراحی کے میدان کو اور بھی وسیع کر دیا ہے، مشین وغیرہ میں دوسری دھات کے جوڑ اور دیگر ادنیٰ معاتوں کے جو

نوٹ ہوتے ہیں۔ ان کا بھی آسانی سے پتہ چلالیا جاسکتا ہے۔ 'لا' شعاعیں جسم کے سڑے ہوئے حصوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر ان کا اثر جسم کے کسی حصہ پہ کافی وقت تک ہو تو اس صورت میں لا شعاعیں بہت خطرناک ثابت ہوتی ہیں، یہ خطرات صرف ان ہی صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ کوئی شخص مبداء کے بالکل قریب ہو یا اس کے پاس اپنے کو بچانے کا کافی انتظام نہ ہو۔ نیز جیسے جیسے ہم مبداء سے دور ہوتے جاتے ہیں ان کی حدت میں کمی واقع ہوتی ہے اور تھوڑے سے فاصلہ پر ہم ان شعاعوں کے خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

'لا' شعاعوں کی قسم میں کسی مادہ کے اندر داخل ہونے کی سب سے زیادہ اہلیت 'جہ' شعاعوں میں ہے، سیسے کے ایک فٹ موٹے کندے سے وہ بآسانی گزر جاسکتی ہیں اور جب ان کو مناسب طریقہ پہ استعمال کیا جاتا ہے وہ سرطان کے کہنہ مرض کو بھی دفع کرسکتی ہیں۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے ان میں خرابی صرف یہ ہے کہ وہ آسانی سے حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ کیونکہ ان کا اشعاع صرف تابکار اشیائے سے ہوتا ہے جو ہماری کائنات میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

دوسری جماعت کی شعاعیں مادی ذرات سے مرکب ہیں جن پر برقی بار لدا ہوا ہے۔ اگرچہ ان کا عملی استعمال سائنٹفک نقطۂ نظر سے بہت ہی دلچسپ ہے تاہم ان میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ کسی واسطہ میں مشکل سے داخل ہوتی ہیں۔ ایسی شعاعیں شیشے کی خلائی نلی میں برقی بار کو آن بر قابا کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور تابکار اشیاء (جن میں رڈیم کو سب سے زیادہ خصوصیت حاصل ہے) سے بھی ان کا اشعاع ہوتا ہے مشکل یہ ہے کہ ہم ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل نہیں کرسکتے کیونکہ وہ ہر مادی چیز میں جذب ہوجاتی ہیں۔ ان مادی ذرات میں سب سے زیادہ اہمیت 'عہ' ذرات (ALFHA PARTICLES.) کو حاصل ہے جو کیسی ہیلیم کے برقائے ہوئے جوہر ہوتے ہیں اور جن کی رفتار ... و. امیل فی ثانیہ ہے لیکن ایک ثانیہ کی بہت ہی چھوٹی کسر کے اندر اندر وہ رک جاتے ہیں اس لئے کہ ہوا جیسی لطیف چیز کے اندر بھی ان کا گزر ۳ انچ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کاغذ کا ایک معمولی پرزہ ان کے لئے سدِ راہ بن سکتا ہے۔

عہ ذرہ توانائی کا گویا ایک گچھا ہے جو بہت زیادہ مرتکز حالت میں ہوتا ہے۔ تاریک کمرے میں اگر کسی پردے سے اس کو ٹکرانے کا موقع دیا جائے تو وہ بآسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ جب پردہ سے تصادم ہوتا ہے تو یہ ذرۂ نور کی ایک چنگاری پیدا کرتا ہے۔ اور اگر ان ذرات کو بلند گو (LOUD SPEAKER) کی جھلّی سے ٹکرانے کا موقع دیا جائے تو ہلکے ہلکے تصادموں کی آواز نہایت صاف سنائی دیتی ہے۔ ان ہی شعاعوں کی مدد سے کیمبرج یونیورسٹی کے سرارنسٹ رتھرفرڈ (SIR ERNEST RUTHERFORD.) نے

خاص خاص دھاتوں کو متاثر کیا اور پہلی دفعہ تبدیل ہیئت عناصر کے مسئلہ کو کامیاب بتلایا لیکن ان کا یہ اثر صرف چند عناصر تک محدود ہے اور یہ بھی بہت ہی کم۔ میرے خیال میں شاید اس کا اثر کسی زمانہ میں بھی عملی نقطۂ نظر سے مفید ثابت نہ ہوگا۔

آخر میں ہم 'بہ' ذرات (BETA PARTICLES) کا ذکر کریں گے جن کو ہم برقیوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ذرات منفی برق کے برقائے ہوئے چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں جو ...۰۰۰ میل سے لیکر ...۱۵۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں ان میں قوت دخول بھی کم ہے اور نہ یہ کسی مرض کو دفع کرسکتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ رَد کو لاسلکی آلہ کے صمام اور دیگر مشابہ آلات سے گزار دیں۔

جو کچھ بھی اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مختلف شعاعوں کے مختلف خصوصیات کا ہمارے کاموں میں کیا حصہ ہے۔ یہ شعاعیں "عہ" ذرات کی شکل میں عناصر کی ماہیت کو بدل دیتی ہیں، 'جہ' شعاعوں کی شکل میں مختلف قسم کے امراض کو دور کرسکتی ہیں۔ 'لا' شعاعوں کی شکل میں پوشیدہ چیزوں کو وضح کر دکھاتی ہیں، بالانفشی شعاعوں کی شکل میں تاریکی میں تصویر لینے میں مدد دیتی ہیں۔ یا انسانی زندگی کو ملیامیٹ کر دے سکتی ہیں بحیثیت زیریں۔ سرخ شعاعوں کے کسی دور کی چیز کو مشتعل کر دے سکتی ہیں اور معمولی نور کی حالت میں جب سلنیم پر گرتی ہیں تو برقی دور کو پورا کرکے گھنٹی بجانے اور ہوائی جہاز اور تہ آب کشتیوں کی حفاظت میں مدد دیتی ہیں۔ لاسلکی کی موجیں بھی عجیب و غریب کام انجام دیتی ہیں جبکہ آلات اس طرح ترتیب دیئے جائیں کہ ان موجوں کی وجہ سے دور پورا ہو۔ اور عمل شروع ہوجائے۔

لیکن عملیات میں یہ اتنی زیادہ عامل نہیں ہیں کیونکہ معمولی حالتوں میں اشعاع کا عمل ایسا نہیں ہوتا اس لئے کہ عناصر کی ماہیت کو بالکلیہ بدل دینا کوئی آسان کام نہیں ہے، خطرناک 'لا' شعاعیں اور بالانفشی شعاعیں انسان کو ملیامیٹ نہیں کرسکتیں تا وقتیکہ ہم ان کے بالکل قریب نہ ہوں۔ یہ شعاعیں اگر معمولی حالت میں مضرت رساں ہوتیں تو اشتعال پذیر اشیاء کو سورج کی روشنی میں اس طرح کھلا نہیں چھوڑ دیا جاتا اور موٹر ہوائی جہاز اور کشتیوں کے مالک کبھی اپنی سواریوں کو اعلیٰ درجہ کے آلات سے تیار نہیں کرتے اس لئے کہ اگر ان کا دشمن اوپر سے کوئی شعاع ڈالے یا بم پھینکے تو ان کی محنت کے رائگاں جانے کا خوف تھا۔

یہ خدا کے طرف کی بات ہے کہ چھوٹے طول موج کی شعاعوں کا اثر جو بہت خطرناک ہے تھوڑے فاصلہ پر قابل لحاظ ہے اس لئے انکو معمولی پردہ کی مدد سے روک دیا جاسکتا ہے دوسرے یہ کہ انکو پیدا کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ بخلاف اسکے لاسلکی کی موجیں ان سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اور بہت زیادہ توانائی سے بھیجی جاتی ہیں انکو کوئی چیز روک نہیں سکتی اور جب وہ ہم سے گزرتی ہیں تو ہمیں ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچتا بہت ممکن ہے کہ یہ تمام واقعات کچھ زمانہ بعد بے معنی ثابت ہوں کیونکہ سائنس ابھی اپنے بچپن کے دن گزار رہی ہے لیکن خوش قسمتی سے وہ ابھی دور نہیں

نسوانی شاعری

(منطقیانہ نظر میں)

از جناب ابوالعرفان فضائی مدیر رسالہ "کیف" اجمیر

میرا ارادہ تھا کہ فارسی گو شاعرہ خواتین کا ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دوں اور ذیل کا مضمون اُسی کی تمہید میں لکھا تھا لیکن فرصت، زمانہ کے صفحات حالیہ سے۔ ماضی کے مجلدات بعیدہ میں محفوظ ہوتی چلی جارہی ہے اور یہ ارادہ پست سا ہوگیا ہے اس لئے عنوان بدلکر اپنے خیالات کو "مجلہ مکتبہ" کے ناظرین کے تفنن طبع کے لئے پیش کرتا ہوں اور خود ہی اس کا اعلان کئے دیتا ہوں کہ اڈیٹر کا نامہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔" فضائی

مشرقی زبانوں کے ماہرین کے نزدیک یہ قضیہ مسلّم ہے کہ دنیا میں جتنی زبانیں نوع انسان کے لئے گویائی کی زینت ہیں، اور "اس مستقیم القامت" حیوان کو بہیمیت کی پست ترین وادیوں سے نکال کر دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں، اِن تمام زبانوں میں عرب کا طالع سب سے بلند ہے۔ قطع نظر اس سے کہ خاتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم اس قوم میں مبعوث ہوئے اور قرآن کریم جو ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے، عربی زبان میں نازل ہوا۔

یہ ایک سچی حقیقت اور آشکار واقعہ ہے کہ جو لطافت و وسعت عرب کی زبان میں ہے کسی دوسری زبان میں نہیں۔ جو حروف کہ مخصوص العرب ہیں۔ وہ فرداً فرداً لطیف، اور لذت بخش ہیں۔ جیسے صاد۔ ضاد۔ طوئے۔ ظوئے۔ عین۔ قاف بخلاف دوسری زبانوں کے حروف کے جیسے پ۔ چ۔ ژ۔ فارسی میں۔ اور ٹ۔ ڈ۔ ہندی میں کہ ارباب ذوق اور طبع سلیم کے نزدیک ان حروف کے مخارج لطافت میں حروف مخصوص العرب سے کمتر درجہ پر ہیں۔ یہ خاصیت عربی حروف ہی کی ہے کہ جس زبان کے لغت میں ان کو منضم کردیا جائے اس میں فصاحت و بلاغت کی ایک مخصوص چاشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے برخلاف فارسی یا ہندی کے مخصوص حروف کو اگر عربی لغات سے ممزوج کردیا جائے تو فصاحت پیدا ہونا درکنار، وہ اپنی وضع اصلی سے بھی گر جائیں گے۔

صرف الف لام (اَل) کا اضافہ ہی عربی زبان میں ایک ایسی طرفہ چیز ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اس ندرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، تاہم مشرقی زبانوں میں عربی کو اگر سماعت سے تقرب اولیں حاصل ہے، اور قمری عرب کی نواگلزمینِ علم وادب میں درخت کی بلند تر شاخ سے سُنی جاتی ہے تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ ذائقہ کیلئے شکر فروشانِ فارسی کی چاشنی بھی انگبینِ سماعت ہے۔ اور عندلیبِ فارسی قمریٔ عرب سے نیچی والی شاخ پہ بیٹھی ہوئی لذت افروز نغمہ سنجی ہے۔

فارسی زبان کی معنیٰ آفرینیاں، نازک خیالی کے ذوق آساشیوئے فکر و اندیشہ کی کاوشوں نے مراتب امکان کی انتہائی اور آخری حد تک پہنچادیئے ہیں۔

اس اعتبار سے کہ اُردو زبان کو فارسی سے ہم لذتی کا دعویٰ ہے۔ اور دورِ حاضر میں اردو زبان اپنی اصلی شاہراہ پر روشن خرامی کی مشق میں مصروف ہے۔ ضرورت ہے کہ کتب درسیہ کے علاوہ فارسی کے اُن ذخائر کو بیش از بیش ٹٹولا جائے۔ جو دنیائے ادب میں عام نہیں ہیں۔

پنجاب کے فارسی امتحانات نے ملک میں فارسی زبان کا کافی ذوق فراہم کر رکھا ہے، لیکن یہ "حظِّ وافر" ہنوز مردوں تک ہی محدود ہے۔ جس طرح ہم فردوسی، انوری، اور سعدی کو فارسی شاعری میں تثلیثِ[1] رسالت کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، ضرورت ہے کہ ملک کی روشن خیال خواتین اپنی جنس کی بہنوں سے واقفیت تامہ رکھیں۔ خواہ وہ عرب کی ہوں یا ترکستان کی۔ ہند کی ہوں یا ایران کی۔

اپنی ذات کو پستِ فطرتی سے نکال کر منشاءِ تخلیق کے بالاترین مرکز پر پہنچادینے کا زبردست طریقہ ایک یہ بھی تو ہے کہ ہم ماضی کے پردوں کو اُلٹ کر گاہے ماہے پردگیانِ قابلیت کے جلوہ ہائے ملیح کی زیارت کر لیا کریں۔

اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ کنزاً تحت العرش ومفاتیحہا السنۃ الشعراء اس قولِ حکمت اساس کا مصداق صرف مرد ہی نہیں ہیں بلکہ عرش کے سربستہ خزانوں کی کنجیاں حسب مراتب عورتوں کے لبوں میں بھی رکھی گئی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدحت طراز شعراء میں جہاں ۱۲۹ رجال کا نام گنایا جاتا ہے وہاں (۱۲) افراد کا نام جنسِ لطیف سے بھی لیا جاتا ہے۔

بخاری شریف کی مشہور حدیث اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمۃً کا الحاق مبالغہ سے قطع نظر کرکے اگر "کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیثما وجدھا فھو احق بھا" کے ساتھ کیا جائے تو شکل اوّل اس طرح

---

[1] در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ لا نبیّ بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

ترتیب پاتی ہے۔

(صغریٰ) اشعار کلمۂ حکمت ہیں (کبریٰ) کلمۂ حکمت مومن کی گم کردہ بضاعت ہے۔

صغریٰ کبریٰ میں حد اوسط "کلمۂ حکمت" ہے اس کو ساقط کر دینے کے بعد نتیجہ نکلا کہ

"اشعار مومن کی گم کردہ بضاعت ہیں" حیثما وجدھا فھواحق بھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ حکمت یا دولتِ شعر جہاں ہو جس جگہ ہو مسلمانوں کی دولت ہے۔ مسلمان اسے حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ لفظ "مومن" اور "مسلم" کا عورت اور مرد پر مساوی اطلاق ہوتا ہے اس لئے جس طرح مرد اس دولتِ عظمیٰ کے حاصل کرنے کے حقدار ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی گو فائق نہ ہو، مگر حقِ تحصیل ضرور حاصل ہے۔

"شرف شاعری" کی بحث ہر چند فرسودہ ہے لیکن اُن اصحاب کے لئے جو تنگنائے منقولات میں تسکینِ قلب کی گنجائشیں تلاش کرتے ہیں، اور شعر کی بناء لغویت پر قائم جانتے ہیں خصوصیت کے ساتھ شعر کو زہرِ قاتل اور خنجرِ ہلاکت مانتے ہیں، مسطورۂ بالا چند کلمات، مطالعہ کی کاوش تلاش کرائی ہے اور یہ منقول بہ نظرِ معقول ان کے خاموش کرنے کے لئے کافی ہے۔

(۱) ہندی عورت جس وقت برسات کی اندھیری راتوں میں اپنے پردیسی پیا کی خیالی صورت کو پیشِ نظر رکھکر ایک ایسا شعر کہتی ہے۔ جس میں جذبۂ فراق کی بندشیں نسوانی خلفشار کو ظاہر کرتی ہوں۔ اور وہ ھوسٹِلم کی دھیمی لے میں اس کو گنگناتی ہے تو قریب کے جنگل میں جتنے چنار کے درخت ہوتے ہیں سب میں آگ لگ جاتی ہے۔

(۲) بدوی لشکر کے ایک لاکھ افراد کو میدانِ قتال میں اتار دینے کے لئے ایک رجز کافی ہے لیکن وہ کسی مرد شاعر کے منہ سے نکلنے کے بجائے لشکر کے آخری حصہ میں کسی عرب شاعرہ کو بلند ٹیلے پر کھڑا ہو کر کہنا چاہیئے، جس میں عربی شجاعت کے ذکر کے ساتھ اپنی عصمت و عفت کی دہائی بھی ہو۔

(۳) ایک ترکی خاتون، صرف اپنی قوت شعری اور جذبات نسائیت کی نگارش کی بدولت قائدانِ اعظم کے دلوں کو تسخیر کرلیتی ہے۔ اور ایوانِ وزارت میں ممتاز نشست کی مالک ہوجاتی ہے۔

خواتین کی علمی، ادبی کاوشیں مردوں کے حوصلے بڑھانے میں جس طرح کامیاب ہوسکتی ہیں۔ اس طرح کوئی اور قوت کام نہیں کرسکتی۔ مگر ہم نے انہیں دبادیا ہے ان کے جذبات کچل دیئے ہیں۔ اپنی رعونت اور مبالغۂ رشک کے مہیب ہتیاروں سے ہم انھیں ڈرار ہے ہیں، اسی لئے ہندوستانی نسائیت کا وہ عنصرِ لطیف جسے شہرت و ترقی کہتے ہیں۔ سیاست و تاریخ اور علم و ادب کے صفحات سے منسوخ ہوتا چلا جارہا ہے

آج زیب النساء کا نام دنیا میں کیوں زندہ ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ قصر شاہی کی ایک معصوم شاہزادی تھی! آج نورجہاں کے نام سے ہندوستان کے علمی طبقوں میں لرزش پیدا کیوں ہو جاتی ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ پہلے وہ شیر افگن جیسے بہادر کی بیوی، اور پھر جہانگیر جیسے بادشاہ کی محبوبہ تھی! ہرگز نہیں! بلکہ ان کے بقائے نام کا راز اُن کے مشغلۂ شعریت میں نہاں ہے۔ ان کے نازک جذبات، فارغ الافکار خیالات روشن تخییل، اور لطیف اندازِ نگارش میں ان کی بقائے دوام اب تک خوشگوار سانسیں لے رہی ہے۔ وہ زندہ رہیں گی، اور اس وقت تک ان کے سطابات کی پرستش ہوگی۔ جب تک کہ زبانِ فارسی اپنی عجمیت کے مکمل ساز و سامان کے ساتھ مسلمانوں میں زندہ ہے۔

کیا وہ...... جمیل...... خواتین جن پر جذباتِ شعریہ کا مدار ہے۔ محض اپنے حُسن و جمال کی وجہ سے ہندوستان تو درکنار۔ اپنے شہر، اپنے محلے، اور خود اپنے گھر میں نصف صدی تک بھی مرنے کے بعد زندہ رہ سکتی ہیں۔ کون ہے جو اس کا جواب اثبات میں دے سکے۔

پرستارِ حُسن، حدودِ نگاہ میں ان کی جتنی پرستش چاہے کرلے۔ جمالِ محصور خواہشات کے قلعہ میں جس طرح چاہے زندگی بسر کرلے۔ مگر مرنے کے بعد بجز ایک دل کے جو تجلیاتِ جمال سے مأوف ہو چکا ہے دنیا میں کہیں بھی اس کی زندگی کے نشانات باقی نہیں رہ سکتے۔

عقلاً اور نقلاً، مذہباً اور اخلاقاً غرضکہ جس نظر سے دیکھیے خواتین کو اکتسابِ علم و ادب اور فنونِ حاضرہ کی تحصیل کی طرف فوراً متوجہ ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں انحطاط الرجال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مردوں کی رفاقت جن مخصوص سے ہوتی ہے۔ ان میں شعریت تو کیا عرفانِ حروف بھی نہیں ہوتا۔ مگر قرونِ اولیٰ اور عہد وسطیٰ میں یہ قحط کہیں نظر نہیں آتا۔ اُس زمانہ میں عورتیں جاہل نہ تھیں، شعریت ان میں بحدِ کمال جذب تھی۔ اور وہ صحیح معنی میں ایک مرد کی رفیقۂ حیات کہی جا سکتی تھیں۔

اُمِ صالحہ ابن مروان کی شامی کنیز، اس کے کتب خانے کو اس ترتیب کے ساتھ آراستہ رکھتی تھی کہ ابن مروان اگر رات کے اندھیرے میں کوئی کتاب طلب کرتا تو فوراً حاضر کردی جاتی تھی۔ اس نے اس کی تمام کتابوں کی ایک فہرست، ایک خلاصہ۔ اور ایک فرہنگ تیار کی تھی وہ اکثر اس کی باتیں نظم کر کے بطور تعلیقات جمع کرتی جاتی تھی۔ خلیفہ کے انتقال کے بعد اُمِ صالحہ کی یہ خدمات علمائے عرب میں بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھی گئیں اور اس کا نام اب تک فصحائے عرب و عجم میں زندہ ہے۔

اسی طرح عرب۔ فارس۔ عراق۔ شام۔ دمشق۔ ترکستان۔ مصر۔ ایران۔ شیراز۔ اور ہندوستان میں بھی ایسی خواتین گزری ہیں جو اپنے کارناموں کی وجہ سے آج تک زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گی۔

نل اور کنوئیں کا مناظرہ

از جناب سید محمد حسین صاحب آزاد (منشی فاضل کم)

(۱) نل نے کہا آکے کنوئیں سے بزور　دفن ہوا مجھ سے تو زندہ بگور　سامنے میرے تری ہستی نہیں　پیش بلندی کوئی پستی نہیں (۲)

ناسخ و منسوخ ہیں ہم ہر طرف　میں ہوا مامور تو تو برطرف　پیٹ بھرا خاک نہیں چھانکتا　میں جو رہوں کون کنوئیں جھانکتا

تیری طرح میں کہیں کیا بند ہوں!　میں نہ مقید ہوں نہ پابند ہوں　ہر جگہ جاتا ہوں میں سیار ہوں　حوض میں میں صورتِ فوارہ ہوں

جس کے مکاں میں میں گیا شکلِ ریل　ہوگئی پانی کی وہاں ریل پیل　پھرتی ہے کیا جلد یہ ٹونٹی کی چول　دیکھ تو میں کتنا ہوں سہل الحصول

(۹) جتنا بڑھایا مجھے اتنا بڑھا　جتنا گھٹایا مجھے اتنا گھٹا　میں نہیں تیری سی مجھے رسی نہ ڈول　تجھکو مبارک ہو یہ سب تیرا جھول (۱۰)

رسی سے جو کوئی کرے ہاتھا پائی!　پانی ملے یا نہ ملے منہ کی کھائی　ایک نہ آئی ہوئی ہے یاں واردات　ایک نہیں سینکڑوں ہیں واقعات

سیکڑوں جانیں ہوئیں نذرِ اجل　تیرا یہ اچھا نہیں طرزِ عمل　کوئی غرق اپنا ہوا ہے نہ جب　پانی پئے جاکے کہیں تشنہ لب

چور ہے قزاق ہے ڈاکو ہے تو　ہائے غضب جان کا لاگو ہے تو　تجھ سے یہاں جان کبھی چھوٹی نہیں　مجھ سے تو نکسیر بھی پھوٹی نہیں

دہر میں تو موجبِ آلام ہے　مجھ سے بہت خلق کو آرام ہے　گھر میں اگر نل ہو تو پھر ظرف کیوں؟　پانی اگر سرد ملے برف کیوں؟

(۱۹) ساتھ ہنوں میں نل ہوا ہو جہاز　تو کہاں مجھ سا ہے مسافر نواز　کرتے مسافر ہیں مری آرزو　اب نہیں کرتے وہ تری جستجو (۲۰)

گوشۂ ویراں میں ہے اب تو پڑا　کون یہاں لئے اٹھا کر گھڑا!　میں ہوں ہر اک خانہ و گلزار میں　میں ہوں ہر اک کوچہ و بازار میں

میں ہی نظر آتا ہوں دیکھو جہاں　اب کہاں باقی ترا نام و نشاں"　نل کو کنوئیں نے دیا تب یہ جواب　"تم سے ہی ہے تیری سب آب و تاب

تیرا خزانہ بھی تو ہوگا کنواں　آگ ہیں ہم تو ہے ہمارا دھواں　آب رسانی کا ذریعہ ہے تو　تو ہی بتا کون ہے؟ دریا ہے تو

یاروں کے بل پر ہے تری کردھاند　ہوگئی سب روشنی اب تیری ماند　اصل سے تو اپنی بہت دور ہے　عقل سے دنیا میں تو معذور ہے

(۲۹) تجھ میں ہمارا ہی ہے پانی رواں　تو اسے کرتا ہے بہت رائیگاں　اصل کو تو اپنی ہے بھولا ہوا　یاروں کے پانی سے ہے پھولا ہوا (۳۰)

آبرو تیری نہیں خانہ خراب　آب نہیں تجھ میں نہیں ہے تو، سراب　پانی کے مخزن تو ہیں ہم، ظرف تو　ظرف نہیں بلکہ ہے کم ظرف تو

ساغر و کنٹر تو عجب ظرف ہیں　تیری طرح اتھلے نہیں ژرف ہیں　ان کی طرح تو کبھی بھاتا نہیں　کوئی تجھے منہ تو لگاتا نہیں

ڈول کو رسی کو تو سمجھا ہے جھول　میں ہی ترے جھول کو دیتا ہوں کھول　آب رسانی تو بھی ہے اور وہ بھی ہیں　دیکھ یہاں تو بھی ہے اور وہ بھی ہیں

تو ہی بتا کس کا زیادہ ہے مول!　تو ہی بتا کس کا زیادہ ہے جھول؟　یہ تو سدا رکھتے تھے لوگوں کو چاق　تو نے کیا کاہل ہیں انکو چاق

(۳۹) پہلے تو کم ہوتے تھے بیمار، یاں　تیرے سبب آئی ہیں بیماریاں　آکے جو بیماریوں نے جان لی　تو کی تھی یہ بات جسے جان لی (۴۰)

ان کے سوا عشق لگاتا ہے تو　باغ فقط سبز دکھاتا ہے تو　تو ہی بتا جان کا لاگو ہے کون!　تو ہی بتا مال کا ڈاکو ہے کون؟

میرے مقابل کے تو قابل نہیں　ان کا بھی تو مدِ مقابل نہیں　ہم نہیں ہرجائی تو کچھ غم نہیں　ہم تو ہمیشہ سے ہیں گوشہ نشیں

(۴۵) شکر ہے زندوں میں ہے اپنا شمار　اس سے بتر ہے ترا حالِ زار

حجاز کے فرنگی سیاح

از جناب الحاج مولوی سید علی شبیر صاحب رشتہ دار انتظامی ہائیکورٹ
حیدر آباد دکن

حضرتِ ابراہیم کے مقرر کردہ مناسکِ حج جو خالص توحید پر مبنی تھے بسبب امتدادِ زمانہ اِن میں شرک کی رسوم بھی داخل ہوگئی تھیں۔ بیت اللہ ایک زبردست بت خانہ بن گیا تھا۔ مگر ابتدا میں چونکہ اسلام بہت ضعیف تھا مسلمان کفار کے ہاتھ سے سینکڑوں قسم کی اذیّت برداشت کرتے تھے۔ پر ان کو بیت اللہ سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مجبوراً آغازِ اسلام سے ۸ھ تک مسلمان اور مشرکین ملے جلے اپنے اپنے طریق پر مناسکِ حج ادا کرتے رہے۔ ۸ھ میں بعد فتح مکہ بت یہاں سے علٰحدہ کر دیئے گئے اور ۹ھ میں حفاظتِ توحید اور سازشوں کے انسداد کے لئے حسب ارشادِ الٰہی مشرکین کو حرمِ کعبہ میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ تاکہ دوسرے مذہب والوں کے میل جول سے مسلمانوں کی عبادت میں مشرکانہ رسوم داخل نہ ہو جائیں اور مشرکین بیت اللہ بھی جا کر مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش نہ کر سکیں۔ اِن احکام کی تعمیل اب تک سختی کے ساتھ ہوتی رہی ہے اگر مکۂ معظمہ میں کسی پر ذرا بھی غیر مسلم ہونے کا شُبہ ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کی شمشیرِ برہنہ سے کوئی چیز اس کو نجات نہیں دلا سکتی۔

باوجود اس خوف وتشدّد کے بہت سے فرنگی عیسائی خانۂ کعبہ تک پہنچے ہیں اور حجاز میں پوشیدہ وخفیہ سیاسی مہمات انجام دیکر اپنے ملک وقوم کی بڑی بڑی خدمتیں کی ہیں۔ اگرچہ ان سیاحوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صدقِ دل سے مسلمان ہوگئے تھے مگر اس وقت ہم کو اُن کے کفر واسلام سے بحث نہیں ہے ہمیں تو مسلم ومنافق دونوں ہی کی کارستانیوں سے یکساں نقصان پہنچا ہے۔

بگزر ز سعادت ونحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت ومریخ بہ قہر

جس طریقے سے اِن فرنگیوں نے حجاز کا سفر کیا جس ڈھنگ سے انھوں نے یہاں کی سیاسی خبریں جاسوس کی حیثیت سے اپنے اہلِ ملک کو پہنچائیں اور جس ترکیب سے اپنی مفوضہ پولیٹکل خدمات انھوں نے انجام دیں وہ مسلمانوں کے حق میں زہرِ قاتل ہوئیں۔ آج افریقہ وعرب میں اہلِ فرنگ کے جو اثرات نظر آرہے ہیں اور نشانِ صلیب جو آسمانِ سیاست پہ آفتاب بن کر چمک رہا ہے۔ وہ انہیں سرفروشوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مجھے

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض بے حمیت، ملّت فروش مسلمانوں نے بھی اپنے تھوڑے سے فائدے کی خاطر اِن منافقوں کی تکمیل اغراض میں بڑی بڑی سہولتیں پیدا کیں اور اس طرح اپنی قوم اور اپنے مذہب کو ایسی کاری ضرب لگائی جس کا علاج قیامت تک ناممکن ہے۔

جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ جو کچھ کرنا تھا ہم کر چکے مگر اس خیال سے کہ شاید آیندہ غافل مسلمانوں کے لئے ذریعۂ بصیرت ہو اور کوتاہ بینوں کے واسطے سُرمۂ عبرت میں نے اب سے کوئی ۲۰ برس قبل ایک مضمون "فرنگی حجّاج" کے عنوان سے لکھا تھا جو حیدرآباد کے مشہور علمی و ادبی رسالہ "افسر"[1] میں نومبر ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا تھا۔ اور اُس سے بعض دوسرے اخبارات "چودھویں صدی" وغیرہ نے نقل کیا تھا۔ میں نے اِس مضمون میں اُن یورپین سیّاحوں کے حالات اور سفرناموں پر ایک اجمالی نظر ڈالی تھی جنہوں نے مسلمانوں کا بھیس بنا کر حجاز کا سفر کیا ہے اور مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ کے حالات تحریر کئے ہیں لیکن اس مضمون میں اختصار سے کام لیا گیا اور تیس چالیس صفحوں میں کل مضمون آگیا تھا ضرورت اس کی تھی کہ اس بارے میں تفصیلی حالات لکھے جاتے اور تمام سیاحان حجاز کا ذکر کیا جاتا۔ اس لئے میں نے اس مضمون کو دوبارہ دیکھا اور اس وقت تک جتنے فرنگی پیروان مسیح مسلمان بن کر حجاز میں داخل ہوئے ہیں اور جن کے حالاتِ سیاحت کسی سفرنامے۔ کتاب یا اخبار و رسالہ میں شایع ہو چکے ہیں ان سب کا تذکرہ درج کرکے ایک مورخ کی حیثیت سے اِن کے بیانات پر نظر ڈالی۔ اِن کے متعصبانہ حملوں کی تصیح کرکے اور جابجا حاشیہ و شرح تحریر کرکے اس مضمون کو مکمل کر دیا۔ اس فقیر کا یہ نقشِ ثانی "حجاز کے فرنگی سیّاح" کے عنوان سے اوائل ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۲ھ تک حیدرآباد کے ادبی رسالے "ترقی" میں باوقات مختلف جزواً جزواً شائع ہوا تھا جب رسالۂ مذکور بند ہو گیا تو ربیع الاول ۱۳۴۴ھ میں حیدرآباد دکن کے ایک دوسرے رسالہ "ترجمان" میں باقیماندہ مضمون کا سلسلہ شروع ہوا مگر اس پرچے کو بھی مرگِ مفاجات نے آلیا اور یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اب اس تالیف کے باقیماندہ حصے میں سے فرانس کے ایک مشہور سیّاح حجاز حاجی عمر عرف لیون راچیز کے حالات جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ ہدیۂ ناظرین "مجلۂ مکتبہ" کرتا ہوں تاکہ مسلمان ان سیّاحوں کی کارگزاریاں دیکھ کر خواب گراں سے چونکیں اور عازمین بیت اللہ[2] اس فقیر کا یہ پیغام خدا کے پڑوسیوں تک پہنچا دیں کہ وہ ملت فروشی و ناشائستہ حرکات سے ہمارے مقدس شہروں کو بدنام نہ کریں۔ زیادہ حدِ ادب۔

---

[1] اس رسالہ کے اڈیٹر فاضل اجل ادیب یکتا مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل اورنگ آباد کالج تھے۔

[2] ۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار ادائے فریضۂ حج کے لئے حجاز گیا تھا تو اس نے بھی خدا کے خاص بندوں تک اپنی کمزور آواز پہنچا دی تھی۔

حاجی عمر

عرف لیون راچیز

ہمارے حجاز کے فرنگی سیاحوں کے سلسلہ میں حاجی عمر عرف لیون راچیز کا نواں نمبر ہے۔ مسٹر رالی اپنی کتاب کرسچینز ایٹ مکہ (پیروانِ مسیح مکہ میں) لکھتے ہیں کہ راچیز سے ایک مرتبہ کسی مسلمان متعصب عورت نے یہ کہا تھا کہ "اگر خدا کے اس سیدھے رستے سے تم بھٹکو گے تو بڑے عذاب میں پڑو گے" راچیز کے واقعات سے ثابت ہے کہ دو مرتبہ وہ بڑی سخت مصیبت میں پڑا اور عجیب و غریب طور پر فرار ہو کر اس نے جان بچائی اور اور اس طرح اس عورت کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔

راچیز ۱۸۰۹ء میں بمقام گرینوبل[1] واقع فرانس پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی میں اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جانے کے سبب سے اس کی خالہ نے پرورش کی۔ اس کا باپ الجزائر چلا گیا تھا اور وہاں ملازمت کر لی تھی۔ راچیز کا بچپن اس کی خالہ کے پاس گزرا۔ کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے قانون پڑھا مگر اس سے کچھ اس کو دلچسپی نہ تھی اس کا رجحان تجارت کی طرف تھا اور اس کے ذریعہ سے وہ سیر و سیاحت کرنا چاہتا تھا مگر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہوا اس کو دفعتہً اس کے باپ نے الجزائر طلب کیا۔ اس وقت اس کی عمر (۲۲) سال کی تھی۔ چونکہ اس کا باپ ایک معمولی کاشت کار تھا اور اس کے پاس کوئی بہتری کی امید نظر نہ آئی تھی اس لئے اسکو فرانس چھوڑنا بہت شاق گزرا۔ اس زمانہ میں الجزائر کے فرانسیسی گورنر جنرل نے ایک فوج نیشنل گارڈ کے نام سے بھرتی کی تھی الجزائر پہنچکر راچیز اس فوج میں کسی عہدہ پہ مامور ہو گیا اور وہاں ایک مولوی سے عربی پڑھنی شروع کی۔ اور جب اس کو کسی قدر استعداد ہو گئی تو وہ ان معاملات میں جو فرنگیوں اور دیسیوں کے مابین اراضی کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ خدمت ترجمانی پہ مامور ہو گیا مگر اس کا فوجی تعلق بھی بدستور قائم رہا۔ راچیز نے الجزائر کے اپنے قیام کے

---

[1] گری نوبل فرانس کا ایک خوشنما شہر ہے جو دریائے ایسر کے دونوں کناروں پر آباد ہے بکری کے بچے کی کھال کے دستانے یہاں کی خاص صنعت ہے آبادی کوئی (۰۰ ہزار) نفوس ہے۔

[2] شمالی افریقہ میں ایک ملک الجیریا ہے جس کا رقبہ دو لاکھ پچپن ہزار مربع میل اور آبادی کوئی (۰۰) لاکھ ہے۔ آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے پہلی صدی ہجری میں اس ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ یہاں کی زبان عربی ہے تقریباً تمام آبادی عرب ہے ۱۸۳۰ء سے فرانس نے اس ملک پر تسلط قائم کر لیا ہے اس ملک کا پایۂ تخت الجزائر ہے جو بحر روم کے کنارے اس طرح آباد ہے کہ ہر مکان کی چھت سے سمندر کی سیر ہو سکتی ہے ہر جدید تہذیب کی ہر چیز یعنی برقی روشنی ٹرام وے ہوٹل، باغات، سیرگاہیں سب کچھ یہاں موجود ہے بہت سی عالیشان مسجدیں قابل دید ہیں۔ آبادی کوئی پونے دو لاکھ ہے عام طور پر الجزائر سے پورا ملک الجیریا مراد لیا جاتا ہے۔

حالات میں ایک عاشقانہ تجربہ کے واقعات بڑی آب و تاب سے بیان کئے ہیں جس نے اس کے سفرنامے کو ناول بنادیا ہے۔ ہم اس خرافات سے قطع نظر کرکے اس کے دوسرے کارنامے تحریر کرتے ہیں۔

اس زمانے میں الجزائر کی سیاسی حالت یہ تھی کہ ترکی حکومت عرب سرداروں کے آئے دن کے جھگڑوں کے باعث عرصہ دراز سے کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی خودمختاری سلب ہو چکی تھی اور وہ فرانسیسیوں کے ۱۸۳۰ء کے حملے سے قبل ہی مفلوج ہو چکی تھی۔ اگرچہ الجزائر، اوران[1] قسطنطین[2] اور ساحل کے دوسرے شہر فرانسیسیوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ مگر اندرونی پہاڑوں اور ریگستانوں کے باشندے اپنی آزادی کے قیام و بقا کے لئے برابر جد و جہد کر رہے تھے۔ الجزائر میں فرانسیسی حکومت سے عربوں نے جو مقابلے کئے اِن میں امیر عبدالقادر[3] نے سب سے بڑھکر حصہ لیا۔ یہ بڑا روشن خیال شخص تھا اور اپنے ملک کو وہ نہایت مستحکم و مضبوط و مہذب بنانا چاہتا تھا۔

---

[1] اوران ملک الجیریا کے صوبہ اوران کا پایہ تخت ہے۔ تمام بڑے بڑے عہدہ دار یہاں رہتے ہیں۔ سڑکوں پر بجلی کے زور سے ٹراموے چلتی ہے۔ آبادی ایک لاکھ دس ہزار ہے۔

[2] قسطنطین ملک الجیریا کا ایک نہایت خوشنما شہر ہے یہاں کی سڑکیں وسیع اور مکان نہایت ہوادار ہیں مسجدیں، گرجے، سرکاری دفاتر، مارکیٹ خوش وضع ہیں۔ جامع صلاح بے اور سابق والی قسطنطین احمد بے کا محل قابل دید ہے۔ آبادی کوئی پچھتر ہزار ہے۔

[3] امیر عبدالقادر اُن شجاعان اسلام میں سے ہے جنہوں نے حریت و آزادی برقرار رکھنے کے لئے اور حفاظت اسلام کے واسطے انیسویں صدی عیسوی میں مدعیان تہذیب سے جہاد کیا۔ اس کا پورا نام الحاج سید عبدالقادر محی الدین ہے۔ یہ ایک مشائخ خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا سلسلہ نسب خلفائے بنی فاطمہ پر منتہی ہوتا ہے جو تقریباً تین سو برس تک مصر و شام و حجاز کے فرمانروا تھے اور جن کا طریق شیعہ اسماعیلیہ تھا۔ عبدالقادر کا خاندان ایک باوقعت خاندان تھا اس کی تعلیم بھی بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ اس وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں اس کا اثر اہل ملک پر اسی طرح قائم ہوگیا جیسا کہ اس کے آباد اجداد کا تھا۔ اس کی شہرت اور پبلک معاملات میں حصہ لینا فرانسیسیوں کی فتوحات الجزائر کے وقت سے شروع ہوا اور اس نے الجزائر کی جنگوں میں جو فرانسیسیوں اور عربوں کے درمیان ہوئیں۔ بڑا نام پیدا کیا۔ جب ترکوں کی قوت الجزائر میں کمزور پڑگئی تو صوبہ اوران کے عرب قبائل نے اس کو اپنا امیر منتخب کیا اس طرح وہ اُن عرب قبائل کا سردار ہوگیا جو شمالی افریقہ میں فرانسیسیوں کی روز افزوں طاقت کو گھٹانے کے لئے جد و جہد کر رہے تھے اور ۱۸۳۲ء سے

راچنر نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا وہ دو سال سے مسلمانوں کا بھیس بنائے ہوئے شیخ عمر کے نام سے الجزائر میں رہتا تھا۔ خدمتِ ترجمانی نے اس کو عربوں کی عادت و رسوم و طرز معاشرت سے بہت واقف کر دیا تھا اس کے استاد نے بھی اس کو ہزاروں باتیں ایسی بتا دی تھیں جو فرنگیوں کو نہیں معلوم ہوتیں۔ غرضکہ وہ ایک نومسلم فرانسیسی کی حیثیت سے امیر عبد القادر سے ملا۔ رفتہ رفتہ اس کا معتمر بن گیا اور اس کی تنظیم جدید کی وسیع اسکیم میں شریک رہا۔ اگرچہ راچنر کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر مصلحت وقت کے لحاظ سے وہ اپنے تئیں بڑا نمازی و پرہیز گار ظاہر کرنے لگا تھا۔ اس نے یہ منصوبہ گانٹھا کہ اگر وہ عبد القادر کے مزاج میں دخیل ہو گیا تو وہ اس سے یہ کہکر فرانس سے صلح پر آمادہ کر دے گا کہ اس صلح سے مذہب اسلام پر بہت اچھا اثر پڑیگا جو لوگ ترکوں کی بدنظمی کے باعث اسلام سے متنفر ہو گئے ہیں۔ وہ اس طرف مائل ہو جائیں گے اور اس طرح فرانسیوں کا ایک زبردست گروہ دائرہ اسلام میں

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) ۱۸۴۷ء تک نہایت عزم و استقلال کے ساتھ اس نے اپنے قوی دشمن کی مدافعت کی۔ کئی مرتبہ اس کو شکست ہوئی مگر فوراً ہی جدید فوجیں فراہم کر کے یہ مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا اور اس نے اپنی معجز نما ہنر مندی و شجاعت سے غنیم کو متحیر کر دیا۔ ۱۸۳۴ء میں اس نے فرانسیسیوں کو ایک ایسی صلح پر مجبور کیا جس سے اس کی سیادت تمام اندرونِ ملک پر قائم ہو گئی۔

۱۸۳۵ء میں جنگ پھر شروع ہو گئی اور اس نے جنگ مقطع میں فرانسیسیوں کی بہت بڑی فوج کو زبردست شکست دی آخر فرانسیسیوں کی ٹڈی دل فوجوں کے مقابلہ میں اسکو مراکو میں پناہ لینی پڑی۔ یہاں اس نے دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ اور ہزارہا مجاہدین اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ۱۸۴۴ء میں اسلی کی فیصلہ کن جنگ کے بعد سلطان مراکو نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور یہ الجزائر واپس ہونے پر مجبور ہوا۔ یہ بہت کا دھنی تین برس تک اور فرانسیسیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار فرانسیسیوں نے اپنے تمام عہد و پیمان بالائے طاق رکھکر ۲۲ / دسمبر ۱۸۴۷ء کو اسے گرفتار کر لیا اور یہ مع اپنے خاندان کے فرانس بھیجا گیا۔ جہاں وہ ایک معزز نظر بند کی حیثیت سے رہا۔ ۱۸۵۲ء میں لوئی نپولین شاہ فرانس نے اسکو رہا کر دیا۔ مگر الجزائر جانے کی ممانعت کر دی۔ عبد القادر نے اپنی بقیہ عمر قسطنطنیہ۔ بصرہ و دمشق وغیرہ مقامات میں بسر کی اور مئی ۱۸۸۳ء میں بمقام دمشق وفات پائی۔

عبد القادر کی کریم النفسی و شرافت و ملوحصلگی کا اندازہ اس برتاؤ سے ہوتا ہے جو اس نے ایک مکار فرانسیسی راچنر کے ساتھ ملحوظ رکھا تھا۔

داخل ہو جائیگا۔ اِن دنوں راچیز اکثر چھوٹے چھوٹے مسلمان عہدہ داروں کے خیموں میں وقت گزارا کرتا تھا اپنے تئیں اس نئے مذہب کا بڑا واقف کار ظاہر کیا کرتا تھا اور صوم وصلواۃ کا بھی بہت پابند ہوگیا تھا مگر حب الوطنی سے بھی خالی نہ تھا۔ اس کے مسلمان دوست فرانسیسیوں پر پھبتیاں کسا کرتے تھے جن کو وہ جنگ میں قتل کرتے تھے اس کے متعلق شیخیاں مارا کرتے تھے اور راچیز سے بھی کہا کرتے تھے کہ اگر جہاد ہو تو تم ہماری طرف سے لڑنا اور اپنے باپ کا بھی ملاحظہ نہ کرنا۔ یہ باتیں اس کو ناگوار گزرتی تھیں چنانچہ ایک مرتبہ وہ ان لوگوں کی باتوں پر اس قدر مشتعل ہوا کہ اس نے (۲۰) عربوں سے یہ کہا کہ میں اکیلا تم بیس سے لڑتا ہوں تم سے ہو سکے تو تم مجھے مار لو ورنہ میں تم بیسوں کو ٹھکانے لگا دیتا ہوں

راچیز کا مذکورہ بالا بیان محض شیخی ہے کسی زمانہ میں بھی مسلمان ایسے بے حمیت نہیں ہوئے۔ کہ ایک عیسائی کے مقابلہ میں بیس آدمی اتنا بڑا بول سنکر تلوار سے اس کی زبان کی تواضع نہ کرتے۔ راچیز بتدریج عبدالقادر کے منہ اس قدر چڑھ گیا کہ وہ خود اس کو مذہب اسلام کی تعلیم دیا کرتا تھا اور اگرچہ اس پُر آشوب زمانہ میں ایک فرانسیسی کا اپنا مذہب و وطن چھوڑ کر فرانسیسیوں کے مشہور دشمن کے پاس دن رات رہنا مصلحت یا فریب سے خالی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ مگر عبدالقادر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر شبہ کرنیوالا شخص نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی نیک گمانی بھی قابل غور ہے کہ جو شخص اپنی زبان سے اسلام کا اقرار کر دیتا ہے اس کو فوراً اپنا بھائی تصور کر لیتے ہیں۔ اس تعقیر کو امید ہے کہ حجاز کے فرنگی سیاحوں کے حالات پڑھکر ہمارے بھولے بھالے مسلمان بھائی اس حکم کے ساتھ ساتھ کہ مومنین کی نسبت نیک گمانی کر لینا چاہیئے۔ اس شعر پر بھی عمل پیرا رہیں گے۔

نگہ دارد آں شوخ در کیسہ دُر — کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بر

بہت دن تک راچیز کی عبدالقادر کے پاس گزر ہوتی رہی مگر وہاں لگائی بجھائی کرنے والوں کی بھی کچھ کمی نہ تھی۔ انہیں دنوں میں راچیز کو کسی کام پر مسقرہ[۱] جانے کا حکم ہوا تھا۔ مگر یکایک اسکو یہ حکم ملا کہ وہ تلمسان[۲] جاکر

---

[۱] مسقرہ صوبہ الجزائر کا ایک شہر ہے جو پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ یہاں کی آب وہوا اچھی اور زمین نہایت زرخیز ہے کسی زمانہ میں تجارت وصنعت کا بڑا مرکز تھا۔ آجکل کوئی دس ہزار ایکٹر زمین میں انگور کی کاشت ہوتی ہے یہاں کی شراب مشہور ہے آبادی کوئی بیس ہزار ہے۔

[۲] عربوں کی سلطنت کے زمانہ میں تلمسان مغربی الجزائر کا پایۂ تخت تھا۔ ابن بطوطہ نے ساتویں صدی ہجری میں اس کو بہت بارونق شہر پایا تھا۔ اور اپنے سفر نامہ میں اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ کُک صاحب کی کتاب

تعلیم قرآن کی تعمیل کرے۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس پر جاسوس ہونے کا شبہ کیا گیا ہے۔ چار و ناچار اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اور تلمسان پہنچکر ایک کاروانسرائے میں ٹھہرا۔ یہاں حاجی بشیر نامی ایک معلم جس کو غالباً پہلے سے امیر کا حکم پہنچ چکا تھا اس کو تعلیم دینے لگا۔ تلمسان میں اگرچہ راچیز جستجو کرنے والے عربوں کی نظر سے اوجھل تھا مگر جال اس کے گرد تن چکا تھا۔ غرضکہ اسے مایوسی نے گھیرا اور فکر کے مارے بخار آنے لگا۔ چند روز اسی حالت میں گزرے تھے کہ اتفاقاً ایک فرانسیسی مسمی آنڑی ڈور جو کسی وقت اس کے پاس ملازم تھا۔ یہاں آن نکلا یہ شخص عربی کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا مگر لباس عربوں کا سا پہنا کرتا تھا۔ راچیز نے یہ خیال کر کے کہ اس نظر بندی سے عمر بھر نجات نہ ملیگی یہاں سے بھاگنے کا قصد کیا اور یہ گھوڑے پر اور اس کا ملازم خچر پر سوار ہو کر تن بہ تقدیر بھاگ نکلے۔ آخر ایک وحشتناک جنگل کو طے کر کے جس میں شیر گرجتے تھے دم لینے کے لئے یہ ٹھہرے کہ اتنے میں ایک سو سواروں کا دستہ جو ان کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا یہاں آپہنچا اور ان کو گرفتار کر کے واپس لے گیا۔ قریب تھا کہ یہ سوار ان کو مار ہی ڈالتے مگر راچیز کے اوسان نے جان بچادی۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر میری گرفتاری کا کوئی حکم تمہارے پاس ہے تو مجھے دکھاؤ ورنہ مجھے امیر عبدالقادر کے پاس لے چلو چنانچہ انہوں نے اس کو بمقام مدیح عبدالقادر کے پاس پہنچادیا۔ راچیز نے امیر کے سامنے بڑے زور سے قسم کھا کر عرض کیا کہ میں صدق دل سے مسلمان ہوں مگر میرے ساتھ ان لوگوں نے جو محض نام کے مسلمان ہیں ایسا برتاؤ کیا۔ میں نے آپ کی خدمت کے لئے گھر چھوڑا۔ وطن چھوڑا۔ مذہب چھوڑا۔ اور میرے ساتھ آپ ایسا سلوک فرماتے ہیں۔ عبدالقادر نے پشیمان ہو کر معذرت کی اور تلافی کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد راچیز بدستور امیر کے پاس رہنے لگا۔ اس کی تعلیم قرآن ابھی جاری ہی تھی مگر بقول اس کے "اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مذہب عیسوی میں اور پختہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کو مسجد میں مسیحی خدا کی عبادت کرنے میں عجب لطف آتا تھا" یہ موقعہ نہیں ہے

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) "ہینڈ بک فار الجیریا اینڈ ٹیونس" میں لکھا ہے کہ ۱۵۵۳ء تک جب یورپ کی مختلف قومیں خواب خرگوش میں پڑی سو رہی تھیں تلمسان علم و ہنر و تہذیب کا ایک مرکز تھا اُس وقت اس کی آبادی سوا لاکھ تھی۔ ترکوں کی زیر حکومت بھی تلمسان ایک صوبہ کا مستقر رہا۔ تسخیر الجزائر کے سلسلہ میں فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا مگر ۱۸۳۹ء میں عبدالقادر کے حوالہ کرنا پڑا۔ عبدالقادر چاہتا تھا کہ تلمسان کی گزشتہ شان و شوکت پھر واپس آجائے مگر کئی برس کی لڑائیوں کے بعد آخر ۱۸۴۲ء میں اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ کامل طور سے ہوگیا اور اب یہ فرانسیسی مقبوضات الجزائر کا ایک حصہ ہے اس کی آبادی ۴۰ ہزار ہے جن میں ۲۶ ہزار مسلمان باقی یہودی و فرانسیسی ہیں تلمسان کی قدیم عظیم الشان مسجدیں، مقبرے اور زاویئے (فقیروں کے تکیئے) مسلمان بادشاہوں کی گزشتہ عظمت یاد دلا رہے ہیں۔

اسلامی و عیسوی تعلیم کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن تعصب کی کوئی دوا نہیں ہے۔ مقابلہ کے بعد بھی راچیز کی طبیعت والوں کو کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ راچیز کا یہ فقرہ قابل غور ہے کہ مسجد میں مسیحی خدا کی عبادت کرنے میں عجیب لطف آتا تھا۔" تمام توریت جس کو عیسائی مثل انجیل کے واجب العمل مانتے ہیں۔ احکام توحید سے بھری پڑی ہے۔ خود انجیل میں بھی وارد ہے کہ "خدا کو ایک ماننا اور اپنے پڑوسی سے اپنی برابر محبت کرنا تمام حکموں سے بڑے احکام ہیں۔" (انجیل مرقس باب (۱۲) آیت (۳۲)) باوجود اس کے مسیحی خدا کو مسلمانوں کے خدا سے علٰحدہ سمجھنا راچیز صاحب کی خوش اعتقادی کی دلیل ہے۔ البتہ مسجد میں صرف ایک ہی خدا ہے اور بجز باپ کے وہاں بیٹے اور روح القدس کا کوئی وجود نہیں ہے راچیز کو اسی معبود ثلاثہ کی عبادت کرنے میں لطف آیا ہوگا۔

مدیح میں راچیز اپنے باپ سے بھی ملا۔ اس کو اب اپنا بھید چھپانے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ اس نے اپنے باپ سے بھی ڈرتے ڈرتے ہی کہا کہ وہ بظاہر مسلمان اور حقیقت میں عیسائی ہے۔ اس کے باپ نے عبدالقادر سے اپنی ضعیفی و بیکسی کا ذکر کر کے رو رو کر التجا کی کہ وہ راچیز کو اس کے پاس رہنے کی اجازت دیدے عبدالقادر نے جواب دیا کہ اگر یہ قسم کھائے کہ ایک سچے مسلمان کی طرح رہیگا تو البتہ اس کو چھوڑا جا سکتا ہے مگر راچیز نے اپنی مصلحتوں کا خیال کر کے یہ جواب دیدیا کہ میں اپنے باپ کے پاس رہنے سے آپ کے قدموں میں پڑا رہنا زیادہ اچھا سمجھتا ہوں۔ اس بات سے عبدالقادر کے دل میں راچیز کی صداقت کا سکہ بیٹھ گیا۔

عبدالقادر ان دنوں اس ملک پر جو مراکو[1] اور ٹیونس[2] کے درمیان واقع ہے۔ اپنا اقتدار جمانا چاہتا تھا اور ایک

---

[1] مراکو۔ افریقہ کے شمال و مغرب میں واقع ہے۔ ایک طرف اس کے حدود مصر سے دوسری طرف بحر روم سے ملتے ہیں۔ اس کا رقبہ دو لاکھ بیس ہزار مربع میل ہے۔ زمین بہت زرخیز ہے۔ تمام قسم کے میوہ جات اور غلہ پیدا ہوتا ہے یہاں کی پیداوار کی برآمد تخمیناً تین کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ اسی قدر درآمد کی مالیت ہوگی۔ زمانہ ہارون الرشید میں (آٹھویں صدی عیسوی میں) یہ ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا اور ۱۹۰۰ء تک مسلمان اُن کے قبضے میں بلا شرکت غیرے رہا۔ ۱۹۰۵ء میں جرمن نے یہاں کے معاملات میں مداخلت کی۔ پھر اسپین و فرانس باری باری سے اپنے دانت تیز کرتے رہے آخر ۱۹۱۱ء میں فرانس نے یہاں کے سلطان کو اپنے زیر اقتدار لے لیا۔ مراکو کی آبادی کوئی ایک کروڑ ہے۔ تقریباً سب مسلمان ہیں۔ مراکو کا پایہ تخت فیض ہے جس کی آبادی سات لاکھ ہے۔

[2] ٹیونس بھی شمالی افریقہ کا ایک ملک ہے جس کا رقبہ اٹھاون ہزار مربع میل اور آبادی کوئی بیس پچیس لاکھ ہے۔ جو بجز چند یہودیوں اور فرانسیسی وغیرہ کے سب مسلمان عرب ہیں آغاز اسلام سے ہی افریقہ کے اس حصے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور مختلف خاندان یہاں حکمراں رہے ۱۵۷۵ء میں ترکوں کے زیر اثر آیا۔ ۱۶۹۱ء میں ابن علی نامی ترکی گورنر کی اولاد یہاں کی خود مختار حاکم بن گئی جن کی سلطنت برائے نام اب تک چلی آرہی تھی۔ ۱۸۸۱ء میں فرانسیسیوں نے اس پر بھی دست شفقت پھیرا۔ اور اب یہاں فرانسیسی جھنڈا لہرا رہا ہے۔

دشمن سیدی محمد الطجینی کے خلاف چڑھائی کرنے والا تھا۔ طجینی کا قلعہ عین مہدی[1] چونکہ ریگستان میں واقع تھا۔ اس لئے عبد القادر حملے میں پس وپیش کر رہا تھا۔ راچیز نے عرض کیا کہ اگر مجھ کو طجینی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا جائے تو میں امید کرتا ہوں کہ باتیں بنا کر اس کو اطاعت پر رضامند کر دوں گا۔ راچیز عین مہدی کو روانہ ہوا مگر شہر کے اندر اس کو کسی نے داخل نہیں ہونے دیا۔ اور یہ مجبوراً اپنا خط چھوڑ کر واپس ہونے لگا اس وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ واپسی کے وقت فصیل کے اندر سے اس کو فرانسیسی زبان میں یہ آواز سنائی دی "ٹھہرو موسیو۔ میں تمہارے داخلہ کے لئے امیر کی اجازت حاصل کر دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی ایک رسی دیوار پر سے پھینکی گئی۔ راچیز اس کے سہارے سے فصیل پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ یہ ایک فرانسیسی جلاوطن کی آواز تھی اس نے امیر سے راچیز کے داخلہ کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ غرضکہ یہ محل میں پہنچ گیا اور امیر نے اس کے واسطے ایک تسبیح بھیجی جو پناہ دینے کی علامت تھی۔ راچیز امیر کے دربار میں حاضر ہوا اور امیر نے اس سے کہا کہ "تو نے ایک ناشکرے مالک کے واسطے یہ خدمت انجام دی ہے۔ اس نے تجھے مرنے کے لئے یہاں بھیجا ہے اور تیری قضا تجھے یہاں لائی ہے اگر تجھے اپنی جان عزیز ہے تو عبد القادر کی نوکری چھوڑ اور ہمارے پاس رہ جا ورنہ تجھے قتل کر دیا جائیگا۔" اس نے عرض کیا کہ "میں آپ کے لطف وکرم کے بھروسے پر یہاں تک آیا ہوں اور یہ تسبیح بطور پروانۂ جاں بخشی سرکار نے مجھے عنایت فرمائی ہے" طجینی نے اس کو معاف کر دیا اور اس کو شہر کی سیر کرائی مگر صلح سے قطعی انکار کر دیا اور یہ واپس آ گیا۔ عبد القادر نے طجینی پر چڑھائی کی اور کوئی ۵ مہینے کے محاصرے کے بعد ۱۸۳۸ء میں عین مہدی فتح ہو گیا اس محاصرے میں راچیز بھی شریک تھا۔ اس کے ایک زخم بھی آیا تھا مگر وہ بقول اسی مکار کے امیر عبد القادر کی دعا سے جلد اچھا ہو گیا اسی زمانہ میں فرانسیسی فوج نے الجزائر کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ عبد القادر کو راچیز کا عندیہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اپنے اہل وطن کے ساتھ لڑنے سے ناخوش ہے مگر اس کا دل ٹٹولنے کے لئے اس سے کہا جس روز سے

---

[1] عین مہدی کا ہم کو کسی کتاب میں پتہ نہ لگا کہ یہ کیا مقام ہے مگر اس کے نام کی ترکیب سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالباً عبد اللہ مہدی سے جن کا سلسلہ پانچویں پشت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملتا ہے۔ یہ عین مہدی منسوب ہے اور یہاں کوئی تالاب عبد اللہ مہدی کا بنوایا ہوا موجود ہوگا۔ عبد اللہ مہدی کے مقلدین نے طریقہ اسماعیلیہ کی اشاعت شمالی افریقہ میں کی تھی۔ جب عبد اللہ نے مہدویت کا دعویٰ کیا اور وہ شام سے افریقہ تشریف لے گئے تو ۲۹۸ھ میں تمام افریقہ پر ان کا تسلط قایم ہو گیا۔ انہوں نے ۲۴ سال تک نہایت عظمت وشان سے حکومت کی اور ۳۲۲ھ میں ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد میں سے گیارہ سلاطین ہوئے جو خلفائے بنی فاطمہ یا عبیدیہ کہلاتے ہیں الجزائر میں عبد اللہ مہدی کا آباد کیا ہوا ایک شہر مہدیہ بھی ہے۔

تم نے اسلام قبول کیا۔ کفار کے ساتھ تمہارے تمام تعلقات منقطع ہوگئے" جوشِ وطنی سے بے قابو ہوکر اس کے منہ سے نکل گیا کہ " اگر ایسا ہے تو میں مسلمان نہیں ہوں"۔ راچیز سمجھا کہ عبد القادر اس کا جواب تلوار سے دیگا مگر اس نے رحم کو کام فرماکر کہا۔

"میں تجھے خدا کے حوالہ کرتا ہوں وہی تجھکو سزا دیگا۔ جا مجھے اب صورت مت دکھا۔ یاد رکھ آئندہ اگر ایسا کفر کا کلمہ کسی مسلمان کے سامنے نکالیگا تو تیرے سر کے پرزے اُڑا دیئے جائیں گے"۔

اب راچیز اپنے ملازم کے ساتھ یہاں سے بھاگا اور چونکہ یہاں رہتے ہوئے اس کو دو برس ہو گئے تھے اس لئے اہل وطن سے ملنے کا اشتیاق زوروں پر ہوا اور یہ فرانسیسیوں کی تلاش میں چلا۔ اس کو خیال ہوا کہ امیر نے اس کی جرأت سے متاثر ہوکر اس کا تعاقب نہ کرایا۔ مگر یہ محض اس کا خیال تھا اگر امیر چاہتا تو اس کو پکڑوا کر بلا لینا کیا مشکل تھا، جیسے تلمسان کی فراری کے وقت اس کو گرفتار کرایا تھا، اب بھی گرفتار کرا سکتا تھا یا مارنا چاہتا تو ایک ہی ہاتھ میں اس کے دو کر سکتا تھا مگر امیر کو منظور ہی نہ تھا کہ جس کو برسوں تک کھلایا اور غلام کی طرح جو شخص اس کے پاس مدتوں رہا۔ اس کے خون میں ہاتھ رنگے ورنہ جہاں ہزاروں فرانسیسی اس کے اشارہ سے میدانِ جنگ میں قتل ہوئے وہاں راچیز بھی ان کی پائینتی پہنچ سکتا تھا۔ قصہ کوتاہ کئی دن کی مسافت کے بعد راچیز فرانسیسی چھاؤنی میں جا پہنچا۔ اولاً پہرے والے نے اس کی کہانی غلط سمجھی اور اسکو عرب سمجھکر قید کردیا لیکن جلد پہچان کر چھوڑ دیا اور یہ ۱۶ نومبر ۱۸۳۹ء کو الجزائر پہنچ گیا۔ یہاں اس کے باپ کی حالت اب اور بھی بدتر ہوگئی تھی۔ اس کی زمین فروخت ہوچکی تھی اور وہ بہت قرضدار ہوگیا تھا راچیز جنوری ۱۸۴۰ء تک یہاں ٹھہرا رہا اس کے بعد وطن نے کشش کی اور وہ پیرس چلا گیا۔ فرانس میں اسکی شہرت بہت کچھ ہوچکی تھی۔ جب یہ وہاں پہنچا تو اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور یہ بڑا معزز شخص سمجھا گیا۔ اچھے اچھے آدمی امیر عبد القادر کے سکرٹری کو دیکھنے کے لئے آئے۔ یہ وہاں کے ارکان سلطنت سے ملا اور اس کی ایسی ہوا بندھی کہ پیرس میں بڑی سے بڑی کوئی کمیٹی اس کی شرکت کے بغیر طے نہیں ہوتی تھی اسکی خالہ بھی ابھی تک زندہ تھی۔ یہ اس سے ملکر بہت خوش ہوا اس کے بعد حکومت فرانس نے اول درجے کا ترجمان اس کو مقرر کیا۔ اور ۴ اپریل ۱۸۴۲ء کو یہ دوبارہ الجزائر روانہ ہوا مگر وہاں اس کے متعلق بڑی بڑی خبریں اڑنے لگیں۔ یہ نومسلم مشہور ہوگیا اور عبد القادر سے اس کا بگاڑ اس کی حماقت و خفتِ عقل پر محمول کیا گیا اور اس کی حب الوطنی کا کچھ پاس نہ کر کے الجزائر کے گورنر نے اس کو اپنے اسٹاف سے علحدہ کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کو کسی صلاح و مشورہ میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ پیرس میں اس کی نسبت کسی عورت سے قرار پائی تھی وہ بھی ٹوٹ گئی اور اس طرح یہ سب طرف سے مایوس ہوکر ایک بڑی خوفناک مہم پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ

عرب ہمیشہ فرانسیسیوں کی مدافعت کرتے رہتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ کافروں کی مسلمان رعایا خواہ امن و امان کے ساتھ ہی زندگی بسر کیوں نہ کرے مگر کفار کی زیر حکومت ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کی لعنت و عذاب میں گرفتار ہوتی ہے چنانچہ اسی بارہ میں امیر عبد القادر نے آیات قرآنی سے استدلال کر کے عربوں کے دل میں یہی بات اچھی طرح ذہن نشین کر دی تھی۔ راچنیر کو یہ یقین تھا کہ اگر کفار فاتح اپنی مسلمان رعایا کی عزت کریں اور ان کے مذہب میں دخل نہ دیں تو ایسی حالت میں وہ مسلمان مستوجب لعنت نہیں ہو سکتے۔ امیر عبد القادر کے دشمن طنجینی سے بھی جب راچنیر نے اس بارے میں صلاح لی تو اس نے اس رائے سے اتفاق کیا اور محض اس غرض سے کہ عبد القادر کا زور ٹوٹ جائے اور فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کا وعظ کہہ کر جو وہ عربوں کو بھڑکاتا رہتا ہے اس کا اثر باقی نہ رہے اور وہ فرانسیسیوں کو نکال کر تنہا الجزائر کا مالک بن بیٹھے۔ راچنیر کو یہ رائے دی کہ ضعیف الاعتقاد عربوں کو سمجھانے کے لئے اس کے متعلق علماء کا فتویٰ حاصل کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اب راچنیر نے اس فتوے کے حاصل کرنے پر کمر باندھی۔ مسلمان غور کریں کہ خود غرضی و نفسانیت نے اسلام کی جڑ کس کس طرح کاٹی ہے۔

ہر چہ ہست از قامت ناسازی اندام ماست ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست (باقی)

سچ ہے

از جناب حکیم بہبود علی بہاء الدین صاحب صفیؔ اورنگ آبادی

سب کو پیاری یہ جان ہے سچ ہے
جان ہے تو جہان ہے" سچ ہے

آج میری طرف بھی دیکھ لیا
تو بڑا قدر دان ہے، سچ ہے

دوست دشمن یہی بناتی ہے
آدمی کی زبان ہے، سچ ہے

مدعا لاکھ بار کہوا یا
تو بہت بدگمان ہے، سچ ہے

تو یہ توبہ ہے، روٹھنے والے!
تیری مٹھی میں جان ہے، سچ ہے

تم بھلا کیوں کسی پہ ظلم کرو
فتنہ گر آسمان ہے، سچ ہے

نہیں رہتی کسی کی شان مدام
یہ خدا ہی کی شان ہے، سچ ہے

حضرت عشق پیر و مرشد ہیں
ان کی جو داستان ہے، سچ ہے

اے صفیؔ شعر بھی نہیں جھوٹے
جو ہمارا بیان ہے، سچ ہے

کیفِ تغزّل

از حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم

پرستش می نمایم حسنِ آزادانۂ خود را — رسد کہ قیسِ دیوانہ مَن دیوانۂ خود را

گشایم بر رخِ مجنوں درِ ویرانۂ خود را — نمایم وسعتِ ذوقِ دلِ دیوانۂ خود را

زبانے دارم و بیباک، رندِ عافیت سوزم — نہ گویم بر حدیثِ دیگراں افسانۂ خود را

دلِ بریانِ من بردی و می با دیگراں خوردی! — من از خونِ جگر پُر کردہ ام پیمانۂ خود را

بیا بنشیں و در بند و ہم بند قبا بکشا — کہ می دانی نہ دانم خانۂ خود خانۂ خود را

بسوزی و بسوزانی، چرا یا غمے نمی سازی — تو شمعی و ندانی آتشِ پروانۂ خود را!

دلے دارم بہ بازارے نمی یابم خریدارے — کہ ہر کس بازپس گیرد ز من بیعانۂ خود را

بخال و خط و گر مرغِ دلم را صید نتواں کرد — نہ بر جائے دیگر دامِ خود را دانۂ خود را

چہ می پرسی دگر وجہ خرابی ہائے دل از من — نمی دانی فریبِ نرگسِ مستانۂ خود را

بسوئے بیتِ احزانم چو آں پیماں شکن آید — کنم لبریزِ صہبائے طرب پیمانۂ خود را

چہ اندیشم از ظلماتِ پیچاپیچ گیسویش — برافروزم چراغِ ہمتِ مردانۂ خود را

دلت ہم می تپید چوں جاں بعشق میدانم — تو شوخی نام کردی طرزِ بے تابانۂ خود را

ز بزمِ خویش می رانی مرا بیگانہ میدانی؟ — چمن می پرورد ہم سبزۂ بیگانۂ خود را

زہے وقتے کہ در مستی بدوشم رُخ نہادستی — من از آں روز تا ایں دم بہ بوسم شانۂ خود را

دمے چوں آمدی رفتی، مرا شغلے بدست آمد — کہ اندازم بفرقِ خود زمینِ خانۂ خود را

بیادِ حضرتِ پیرِ مغاں کیفیؔ سیہ مستم — شکستم ساغر و بستم درِ میخانۂ خود را

بھکاری

(چیخوف کے ایک افسانے کا ترجمہ)

مترجمہ جناب احمد عارف صاحب

"حضور، مجھ پر رحم کیجئے۔ ایک بے کس بھوکے کی خبر لیجئے۔ برابر تین دن سے میرے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں۔ قسم خدا کی گزارے کے واسطے پانچ کوپک (سکہ) بھی نہیں آٹھ برس تک میں ایک دیہاتی مدرس رہا لیکن بعض لوگوں کی سازش سے میں نے وہ جائداد کھو دی اور بدنامی کا شکار ہو گیا۔ اب مسلسل ایک برس سے بیکار ہوں۔"

وکیل اسکورٹساف نے سائل کو بغور دیکھا۔ اس کے بھورے رنگ کے پھٹے ہوئے کوٹ کو۔ اس کی خمار آلود بے جان آنکھوں کو۔ اور اس کے رخسار کے سرخ دھبوں کو۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس سے پیشتر اس کو کبھی دیکھا ہے۔

سائل نے کہا "صوبہ کالگا میں مجھے ایک خدمت مل رہی ہے لیکن وہاں جانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں۔ براہ کرم میری مدد کیجئے۔ سوال کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے مگر میں اپنی مصیبت سے مجبور ہوں۔

اسکورٹساف کی نظر اس کے جوتے پر پڑی۔ ایک جوتا اچھا تھا اور دوسرا خراب۔ یکایک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے کہا یہ "دیکھو، مجھے خیال ہے، سوڈویا اسٹریٹ میں پرسوں تم مجھ سے ملے ہو مگر اس وقت تم نے کہا کہ میں ایک طالب علم تھا اب نکال دیا گیا ہوں، نہ کہ ایک دیہاتی مدرس۔ تمھیں کچھ یاد ہے؟

گداگر حیرت کے ساتھ بات چبا کر بولا "نہ نہ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایک دیہاتی مدرسہ کا استاد ہوں آپ چاہیں تو میں اپنے کاغذات دکھا سکتا ہوں"۔

تم جھوٹ بولتے ہو! تم نے خود کو طالب علم بتایا تھا اور یہ بھی کہا کہ کس وجہ سے نکالے گئے تمھیں یاد نہیں!

اسکورٹساف کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نفرت کے ایک احساس کے ساتھ بھکاری کی طرف سے پلٹ کر غصہ میں بولا "یہ بے ایمانی ہے، یہ دھوکا بازی ہے۔ تمہارے لئے میں پولیس کو بلاؤں گا بدمعاش کہیں کے اگر تم غریب اور بھوکے بھی ہو تو یہ بے حیائی اور بے شرمی کیوں"؟

گداگر نے دروازے کے دستہ کو پکڑ کر سامنے کے کمرے میں دزدیدہ نظروں دوڑائیں جیسے کوئی چور دیکھتا ہے۔ پھر کہنے لگا "میں — میں جھوٹ نہیں کہتا۔ آپ کو اپنے کاغذات دکھا سکتا ہوں"۔

اسکورٹساف نفرت کے لہجہ میں بولا "تم پر اعتبار کون کریگا؟ اس ہمدردی سے جو لوگوں کو دیہاتی مدرسین اور طلبہ کے ساتھ ہے، فائدہ اٹھانا نہایت کمینہ فریب ہے۔ یہ ایک طرح کی بغاوت ہے"۔

اب اسکورٹساف آپے سے باہر ہوگیا اور گداگر کو بڑی بے رحمی سے ڈانٹنے لگا۔ گداگر کے اس پُرفریب جھوٹ نے اسکورٹساف کی ہمدردی، رحمدلی اور خداترسی کے جذبات کو مسکینوں کی جماعت کے خلاف بھڑکا دیا فائدہ حاصل کرنے کی اس کوشش سے خیرات جیسی چیز اُسے مکروہ و نجس دکھائی دینے لگی جس کو وہ اپنے دل کی انتہائی پاکیزگی کے ساتھ غریبوں میں پھیلانا چاہتا تھا۔ پہلے پہل گداگر اپنی بے گناہی کی مدافعت میں کوشاں رہا۔ مگر بہت جلد وہ خاموش ہورہا اور عالم انتشار میں اس کا سر جھک گیا۔

اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا "حضور! واقعہ یہ ہے کہ میں — جھوٹ بول رہا تھا میں نہ تو طالب علم ہوں اور نہ مدرس۔ یہ سب من گھڑت تھی درحال میں روس کی گرجا کے قوالوں میں سے ہوں جو عید شرابی ہونے کی وجہ سے نکال دیا گیا لیکن میں اس کے سوا کیا کرسکتا ہوں بغیر جھوٹ کے میری گزر نہیں ہوسکتی اگر میں سچ کہوں تو کون ہے جو مجھے کچھ دینے کے لئے تیار ہو۔ سچائی سے آدمی بھوکوں مرتا ہے یا ٹھکانا نہ ہونے کی وجہ سے سردی میں اکڑ اکڑ کر مرجاتا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ لیکن — بتائیے میں کیا کرسکتا ہوں"؟

اسکورٹساف نے قریب آکر کہا "میں کیا کرسکتا ہوں"؟ تم پوچھتے ہو میں کیا کرسکتا ہوں، کام کرو۔ یہی تم کرسکتے ہو۔ تمہیں کام کرنا چاہئے"۔

"کام — ہاں، یہ میں بھی جانتا ہوں مگر کام مجھے ملے کہاں سے؟

سٹرل آدمی! تم جوان ہو، تندرست ہو، ہٹے کٹے ہو اگر چاہو تو ہر وقت تمہیں کام مل سکتا ہے مگر تم کاہل آوارہ اور ریوٹ ہو۔ شراب کی بھٹی کی طرح تمہارے منہ سے بُو آرہی ہے۔ تم لُچّے اور دغاباز ہو۔ تمہیں صرف جھوٹ بولنا آتا ہے آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو سرکاری ملازمت یا گرجا کی قوالی یا بلیرڈ کے شمار کنندہ کی خدمت — ایسی ملازمتیں جن میں بغیر کچھ کئے دھرے روپیہ مل جایا کرے۔ ہاتھ پاؤں سے محنت کرنا تمہیں کیوں پسند ہو؟ کسی کارخانہ کی مزدوری یا حمالی تم کیوں کرنے چلے تھے ع حیلہ جورا بہانہ ہا بسیار۔

فقیر نے ہنسکر جواب دیا۔ "واللہ آپ بڑا سخت انصاف کر رہے ہیں۔ مجھے دستی محنت کا کام کہاں سے مل سکتا ہے تجارت کی اہلکاری میرے لئے بعد از وقت ہے کیونکہ اسے بچپن ہی سے شروع کرنا پڑتا ہے جمالی کے لئے مجھے کوئی پسند نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کے لئے واقفیت کی ضرورت ہے اور میں کچھ نہیں جانتا"۔

بیوقوف کہیں کا، کچھ نہ کچھ عذر ضرور کرے گا۔ میرے واسطے لکڑیاں پھوڑنا منظور ہے"۔؟

"مجھے اس کام میں کچھ عذر نہیں لیکن ان دنوں ہشیار لکڑہارے خود گھر میں بیٹھے روٹیوں کو محتاج ہو رہے ہیں"۔

"ہش! تم پاجی لوگ ایسا ہی بکا کرتے ہیں جیسے ہی کام دیا جائے انکار کر جاتے ہیں کیا میرے پاس لکڑیاں پھوڑنے آؤ گے؟"

"ہاں صاحب، میں تیار ہوں"۔

"بہت خوب، ۔۔۔ ہم ابھی انتظام کریں گے ۔۔۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ کیسے ۔۔۔"

اسکورٹساف نے کچھ عداوت کے خیال سے نہیں بلکہ یونہی اپنے دونوں ہاتھ ملے اور بڑی عجلت سے اپنی ماما کو پکار کر کہا "آلگہ، اس بھلے مانس کو لکڑیوں کے چھپر میں لیجاؤ اور لکڑیاں پھوڑنے دو"۔

گداگر نے اپنے دونوں کندھے سکڑائے جیسے وہ کسی الجھن میں مبتلا ہے اور کشاں کشاں ماما کے پیچھے جانے لگا اس کی رفتار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ لکڑیاں پھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ وہ بھوکا تھا صرف شرم و غیرت نے اسے کام پر آمادہ کیا تھا اسی کے الفاظ نے اسے پھندے میں پھنسایا۔ شراب نے اندر ہی اندر اسکی طاقت زائل کر دی تھی اور خرابی صحت کی وجہ سے اس کا رجحان ذرہ برابر بھی محنت کی طرف نہ تھا۔

اسکورٹساف جلدی جلدی کھانے کے کمرے میں گیا اس کمرے کی کھڑکی سے لکڑیوں کا چھپر اور اسمیں جو کچھ گزر رہا ہو اچھی طرح نظر آتا تھا۔ دریچہ میں کھڑے ہو کر اسکورٹساف نے دیکھا کہ گداگر اور ماما غلیظ برف میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے پچھلے دروازے سے صحن میں چلے آ رہے ہیں۔ آلگہ نے آنے والے ساتھی کو غصہ سے گھور کر دیکھا اپنی کہنی سے دھکا دیکر اسے بازو ہٹایا اور چھپر کا قفل کھول کر دروازہ پر کھٹ کھٹ مارنے لگی۔

اسکورٹساف نے خیال کیا "ہم نے اس عورت کے کافی کے لطف کو کرکرا کر دیا۔ کیسی وحشی اور بدمزاج ہے؟

پھر اس نے دیکھا کہ وہ جو اپنے آپ کو کبھی مدرس اور کبھی طالب علم کہا کرتا ہے، ایک ساگوانی ناٹ پر اپنے دونوں سرخ گالوں کو ہتیلیوں کا سہارا دیئے خیالات میں غرق بیٹھا ہے۔ عورت نے اس کے سامنے کلہاڑی پھینکی اور غصہ سے زمین پر تھوک دیا۔ اس کے ہونٹوں کے حرکات و سکنات سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کی تنبیہ کیئے جا رہی ہے۔

گداگر نے بادل ناخواستہ ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا اور اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رکھکر بڑی طاقت سے کلہاڑی کی ایک ضرب لگائی۔ لکڑی لہراتی ہوئی دور جا گری۔ اس نے پھر لکڑی کو اٹھا لیا اور سردی کے اکڑے ہوئے ہاتھوں کو خوب رگڑ کر اس ڈر سے کہ مبادا کلہاڑی کی زد جوتے یا انگلیوں پر پڑے، نہایت احتیاط سے

لکڑی پر ضرب لگائی، لکڑی اچھل کر پھر زمین پر جا پڑی۔

اسکورٹساف کا غصہ اب فرو ہو کر پشیمانی اور رنج کے احساسات اس پر غالب آنے لگے کہ ایسی سردی میں کیوں میں نے ایک تباہ حال شرابی اور غالباً ایک بیمار کو ذلیل مشقت پر مقرر کیا۔

کھانے کے کمرے سے کتب خانہ میں جاتے ہوئے اس نے خیال کیا "خیر، کچھ مضائقہ نہیں میں نے اسی کی بھلائی کے لئے کیا ہے۔"

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد آلگہ نے آکر اطلاع دی کہ تمام لکڑیاں پھوڑ دی گئیں۔

اسکورٹساف نے کہا "نہایت خوب، اسے نصف روبل دیدو۔ اگر وہ چاہے تو ہر مہینے کی پہلی تاریخ یہاں آکر لکڑیاں پھوڑ سکتا ہے ہم اس کے واسطے ہمیشہ کام نکال سکتے ہیں۔"

مہینے کی پہلی تاریخ کو گد اگر پھر آیا اور اسی طرح نصف روبل اس نے حاصل کیا۔ اب وہ بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا تھا اس کے بعد وہ اکثر اسی صحن میں نظر آتا اور ہر وقت اسے کچھ نہ کچھ مزدوری میسر ہی آجاتی کبھی پھاوڑے سے برف صاف کرتا، کبھی بکھری ہوئی لکڑیوں کو سلیقہ سے جوڑ دیتا اور کبھی کمل اور توشک کی گرد صاف کرتا۔ ہر وقت وہ بیس اور چالیس کے درمیان کوپک (روسی سکہ) حاصل کرتا رہا اور ایک مرتبہ تو اسے پاجامہ کی ایک جوڑی بھی دی گئی ایک مرتبہ جب اسکورٹساف نے اپنا مکان تبدیل کیا تو اس نے اجرت پر اسباب کی منتقلی کا کام انجام دیا۔ لیکن اس وقت وہ بے پئے، اداس اور خاموش نظر آتا تھا وہ بمشکل اسباب کو اٹھا کر گاڑیوں کے پیچھے سر جھکائے چلتا رہا، جیسے کسی کام میں مشغول ہی نہیں وہ سردی سے کانپ رہا تھا اور جب گاڑی بانوں نے اس کی سستی، کمزوری اور خوشنما پھٹے اوورکوٹ کو دیکھا تو اس کا مضحکہ اڑانے لگے نقل و حمل کا کام ختم ہونے کے بعد اسکورٹساف نے اس کو ایک روبل دے کر کہا "یہ لو تمہاری محنت کا صلہ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے کہنے نے تم پر اثر کیا۔ اب تم پرہیز گار ہو گئے ہو اور محنت کے لئے کچھ عذر بھی نہیں۔"

تمہارا نام؟

"لشکوف"

"اچھا لشکوف، میں تمہارے لئے اس سے بہتر مزدوری کا انتظام کرتا ہوں۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

"ہاں، میں لکھ سکتا ہوں۔"

پھر تو یہ خط کل میرے ایک دوست کے پاس لیجاؤ وہ تمہیں کتابت کا کچھ کام دیں گے۔ سخت محنت کرو، پینا چھوڑ دو اور جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھو۔

"اچھا، خدا حافظ"

ایک بھٹکے ہوئے آدمی کو راہِ راست پر لاکر اسکورٹساف خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ بڑی مہربانی سے اس نے لشکوف کی پیٹھ ٹھوکی اور رخصت کرتے وقت اس سے مصافحہ بھی کیا۔ لشکوف نے خط لے لیا اور اس کے بعد وہ پھر کبھی اسکورٹساف کے صحن میں مزدوری کرتے ہوئے نظر نہیں آیا۔

دو برس گذر گئے ایک شب اسکورٹساف کسی تھیٹر میں ٹکٹ خرید رہا تھا کہ اس نے اپنے پیچھے ایک پست قد آدمی کو دیکھا۔ اس کے گلے میں پھیدار پروں کا ایک کوٹ کالر تھا اور سر پر مچھلی کے چمڑے کی ٹوپی۔ اس شخص نے ایک سہمے ہوئے انداز میں گیالری کی ایک ٹکٹ خریدی اور اس کی قیمت تانبے کے سکہ میں ادا کی۔

"لشکوف تم ہو؟" اسکورٹساف نے اپنے سابق لکڑہارے کو پہچان کر کہا "تم کیسے ہو؟ تم کہاں ہو؟ کس طرح بسر ہو رہی ہے؟"

"بڑی عمدگی سے۔ نوٹری کی خدمت پر مامور ہوں پینتیس روبل ماہوار ملتے ہیں۔"

"شکر اللہ کا۔ یہ بہت اچھا ہوا مجھے بڑی خوشی ہوئی، لشکوف! میری مسرت کی کوئی انتہا نہیں تم جانتے ہو، میں نے راہِ راست پر تمھاری رہنمائی کی ہے۔ تمہیں یاد ہے؟ میں نے تمھاری کیسی تنبیہ کی تھی۔ جیسے میں نے اس دن تمھیں زمین میں دھنسا دیا۔ حضرت! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے الفاظ کو نہیں بھلایا۔"

لشکوف نے کہا "آپ کا بھی شکریہ، کیونکہ میں اگر آپ پاس نہ آتا تو اب تک اپنے آپ کو دیہاتی مدرس یا طالبعلم بولتا ہوا پھرتا۔ ہاں، یہ آپ ہی کی عنایت کی بناء تھی جس نے مجھے قعرِ مذلت سے باہر نکالا۔

"بلا شبہ، مجھے بیحد خوشی ہوئی۔"

اپنی مہربانی سے آپ نے میرے لئے جو کچھ کیا یا کہا، میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اُس وقت آپ نے بڑی خوبی سے گفتگو فرمائی تھی۔ میں آپ کا اور آپ کی ماما کا بڑا احسانمند ہوں۔ اللہ اس نیک اور شریف عورت کو خوش و خرم رکھے۔ ہاں مجھ سے آپ نے جو کچھ فرمایا اس کے لئے یوں تو میں ممنون ہوں ہی، لیکن سچ پوچھو تو وہ آپ کی ماما آلگہ تھی جس نے مجھے بچالیا۔"

"یہ کیسے"

"یہ اس طرح، جب میں لکڑیاں پھوڑنے کے لئے آپ کے مکان پر آیا کرتا تھا تو وہ یوں کہا کرتی "ارے شہ باز! افسوس، تیرے واسطے سوائے تباہی کے کچھ بھی نہیں ہے" پھر وہ میرے سامنے رنجیدہ بیٹھ جاتی اور میری صورت دیکھ دیکھ کر روتی۔ "ہائے رے بدقسمت! اس دنیا میں تیرے لئے کوئی خوشی نہیں۔ اور

کوئی بھی اس دنیا میں آنے والا نہیں، ارے شرابی! تو دوزخ میں جلیگا۔ ہائے رے مصیبت کے مارے"! غرض اسی طرح کا راگ الاپتی رہتی۔ میں نہیں کہہ سکتا، اس نے میرے لئے کس قدر رنج و غم برداشت کیا اور کتنے آنسو بہائے۔ مگر کہنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میری خاطر اپنے ہاتھوں سے لکڑیاں پھوڑتی رہی ہے آپ جانتے ہیں، صاحب؟ آپ کے لئے میں نے ایک لکڑی بھی نہیں پھوڑی۔ جو کچھ پھوڑا، اسی لئے پھوڑا۔ میں کیسے بچ گیا، میں کیوں تبدیل ہوگیا، میں نے کس طرح شراب ترک کردی، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کے شریفانہ اقوال و افعال کا اثر تھا کہ میرے دل میں ایک تبدیلی نمایاں ہوگئی۔ اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے میں اس کو کبھی نہیں بھولوں گا اب وقت ہو چکا، یہ دیکھو گھنٹی بج رہی ہے"

لشکوف نے سر جھکا کر سلام کیا اور گیلری میں چلا گیا۔

(چخوف)

دِل

از لسان القوم مولانا سید شاہ ابراہیم عفو مرحوم

کب تک کسی کے ہجر میں یوں ہائے ہائے دل
پتھر ہی کاش پہلو میں ہوتا بجائے دل

دیکھی جھلک جو ان کی تو بس اِن کا ہوگیا
اک عمر کا رفیق مرا دوست، ہائے دل

اللہ رے بیخودی کہ وہ آئے بھی اور گئے
ہم کہنے پائے اُن سے نہ کچھ ماجرائے دل

سوزِ فراق میں نہیں اک لحظہ مجھ کو چین
چولھے میں جائے ایسا جہنم میں جائے دل

اے شیخ ہم سے پوچھ ازل اور ابد کا راز
یہ انتہا ہے دل کی تو وہ ابتدائے دل

رشکِ رقیب و فکرِ وصال و غمِ فراق
اتنی بلاؤں سے کوئی کیونکر بچائے دل

اِس دل کے ہاتھ سے ہے مری عافیت بہ تنگ
دشمن کا بھی الٰہی کسی پر نہ آئے دل

کیسے کٹیں گی ہجر کی راتیں میں کیا کروں
کیا اِس جہاں میں نہیں کوئی دوائے دل

اے عفو زندگی کا یہ اصلی اُصول ہے
ناحق کسی بشر کا نہ کوئی دُکھائے دل

بہارستانِ عشق

یا

لیلیٰ مجنوں نامہ

از جناب مولوی سید محمد صاحب قادری بی۔ اے

دنیائے شعر و شاعری میں معاشقہ لیلیٰ مجنوں عجیب مقبولِ عام داستان ہے۔ ایشیائی شاعروں کے ہاں کسی اور نمایندگان حسن و عشق کی داستان کو اس قدر فروغ نہیں ملا۔ جس طرح صحرائے عرب کے وارفتہ عاشق قیس عامری اور محمل نشین لیلائے شب گوں کی داستانِ عشق و محبت کو حاصل ہوا۔ مصر کے فاضل ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو اس روشن زمانہ میں بقولِ انشاؔ "بڑی دور کی سوجھی کہ وہ اس پیکرِ وفا کے عدم و وجود کے پیچھے پڑ گئے" وہ چاہیں قیس کے وجود سے انکار کریں یا اقرار مگر اس مجنوں نے جریدۂ عالم پر اپنا دوام کچھ اس طرح ثبت کرا دیا ہے کہ مشعلِ علم و حکمت کی عالمگیر روشنی میں بھی "دانا بینا" اس کے افسانۂ عشق و محبت سے اسی طرح لطف اندوز ہوں گے جس طرح زمانہ جہل و تاریکی کے جذبیلے نوجوان ہوا کرتے تھے۔

مشرق اور مغرب میں اور بھی پیکر حسن و عشق موجود ہیں۔ ایران کے شیریں فرہاد، مصر کے یوسف زلیخا، ہندوستان کے ہیر رانجھا ہر ایک وفا و جفا، ناز و نیاز، حسن و عشق کے افسانوں سے ایک عالم کا دل لبھاتے ہیں مگر لیلیٰ مجنوں کے عشق کے آگے یہ سب گرد ہیں۔ اقلیم عشق و عاشقی میں لیلیٰ مجنوں کی "شہنشاہی" اور "مطلق العنانی" مُسلّم ہے۔ کون ہے کہ لیلیٰ کے فصد لینے پر مجنوں کی طرح اپنی رگ سے خون ٹپکانے کا مدعی ہو۔ مرزا غالب، فرہاد کی عمر بھر کی وفا شعاری اور جاں نثاری پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیتے ہیں۔

عشق اور مزدوریِ عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

مگر قیس کی پامردی کے یوں معترف ہیں۔ ع جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار۔ وہ اُس کے فنافی العشق ہونے کا اقرار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

عربی اور فارسی سے گزر کر اردو شاعری میں بھی ان کی داستانِ عشق کے ایک ایک واقعہ اور معاملہ کو

اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ کوئی پہلو نہیں چھٹتا۔ گر ع۔ ہے تازگی وہی پھر اس قصۂ کہن میں۔ عربی زبان کے ادب عالیہ میں مثنوی کا فقدان ہونے کی وجہ سے ان کے حالات پر کوئی ہزار دو ہزار شعر کی طویل نظم نہیں ملیگی۔ فارسی میں باستثنائے چند تقریباً تمام اساتذۂ مثنوی نے اظہار کمال کا موضوع انہی کو قرار دیا اور متعدد مثنویاں ان کی داستانِ عشق میں تحریر کی گئیں۔ اردو میں بھی اس موضوع پر کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ ہم ان میں سے ایک نہایت غیر معروف مگر قدیم مثنوی پر سرسری روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس کا مصنف نامی تخلص کرتا ہے۔ مگر برعکس نہند نام بہت ہی غیر معروف اور گمنام ہے۔ اسی کی مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ہمیں اپنے مکرم دوست مولوی سید امین الدین حسین صاحب بی اے (عثمانیہ) کے ہاں ملا۔ صاحب موصوف نے ہمیں اوقاتِ فرصت میں اس کا مطالعہ کرنے کی رائے دی۔ اور نسخہ ہمارے حوالہ کر دیا۔ مطالعہ سے جو معلومات حاصل ہوئی "نبشتہ بماند سیہ بر سفید" اطلاع عام اور اپنے قومی و ملکی لٹریچر کے ایک پارہ کے تحفظ کے خیال سے پیش کیجاتی ہے۔

اس مثنوی کا نام جیسا کہ مصنف نے اس بیت میں بیان کیا ہے "بہارستانِ عشق" ہے مگر پیش نظر نسخہ کے سرورق پر لیلیٰ مجنوں نامی بھی لکھا ہے ؎

نام اس کا ہے بہارستانِ عشق ہے تر و تازہ و جو یہ بستانِ عشق

تعداد اشعار خود مصنف نے دو ہزار بتائی ہے۔ ؎

میں کیا جب اس کی بیتوں کو شمار پایا گننے میں برابر دو ہزار

مثنوی کی ابتداء مشرق کی تمام قدیم تالیفات کی طرح حمد و نعت سے ہوئی ہے۔ نعت کے ضمن میں معراجِ شریف کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ازاں بعد اپنے مربی و سرپرست نواب عمدۃ الامراء والی کرناٹک (۱۷۹۵-۱۸۰۱) کی مدح میں کئی صفحے رنگین کئے ہیں اس میں رسمی طور پر ممدوح کی شجاعت و سخاوت، دادرسی و معدلت پسندی کی تعریف کر کے اس کی شاعرانہ قابلیت اور کمال خوش خطی کی ستائش میں بڑی دریادلی سے کام لیا ہے اور بالالتزام فارسی اور اردو کے ہر ایک مشہور استادِ سخن کا نام لیکر اپنے ممدوح کو اس سے بہتر و برتر بتایا ہے مثلاً

پر تھا اس کا ایک شاگرد رشید انوری تھا شعر میں گرچہ وحید
آبرو کا شرم سے ہے رنگ زرد اس کے مضموں سُنکے ہے سَودا کو درد

مدح میں مصنف نے بڑی محنت کی ہے اور صنایع لفظی و معنوی کے استعمال کا کمال دکھایا ہے۔ عمدۃ الامر کی سیاست دانی و ذاتی قابلیت کی جو کچھ تعریف کی گئی ہے وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں۔ تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اس کے بعد اپنے دو کمسن بیٹوں کو مخاطب کر کے اعمالِ حسنہ میں مشغول اور رذائل اخلاق سے دور رہنے کی نصیحت کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں "سابق معلم الملکوت" کی ایک حکایت بھی بیان کی ہے۔ پھر وجہ تصنیف میں

بیان کیا ہے کہ اس سے قبل اس نے شیریں خسرو کی داستانِ عشق نظم کی تھی۔ خاص و عام نے اس کو بہت پسند کیا اور بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ایک روز خیال ہوا کہ لیلیٰ مجنوں کے عشق کا فسانہ اپنی آپ نظیر ہے۔ فرصتِ حاصلہ سے فائدہ اُٹھا کر اس کو نظم کر دیا جائے تو ایک یادگار رہے گی۔ اور اس سے اپنا نام بھی برقرار رہیگا۔ اس طویل تمہید کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ مجنوں کی پیدائش سے لیکر وفات کے تمام مشہور واقعات بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں۔ مجنوں کی آوارگی و صحرا نوردی، لیلیٰ کی بے رُخی و بے پروائی، لیلیٰ پر مجنوں کے عشق کا کاری اثر، اس کی پریشانی و بے کلی وغیرہ ایک ایک جزوی کیفیت مناسبِ مضمون الفاظ اور دلچسپ پیرایہ میں پیش کی ہے۔ مثنوی کے اختتام پر چند شعر بطور خاتمۃ الکتاب لکھدئے ہیں جن میں اپنی محنت کا ذکر، غلطیوں کا اعتذار، کچھ فخر و مباہات اور تاریخ تصنیف مندرج ہے۔

اُردو کے قدیم مثنوی نویسوں نے قصصی مثنویوں میں علی العموم یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر نئے مضمون سے پہلے دو تین شعر ساقی نامہ کے لکھدیے جائیں۔ یہ نئے مضمون کے عنوان کا کام دیتے ہیں اور ان میں کوئی نہ کوئی قرینہ ایسا موجود رہتا ہے جو آگے بیان ہونیوالے مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میر و سودا کی اکثر مثنویوں اور زیادہ مشہور میر حسن کی مثنوی سحر البیان میں یہی التزام ہے۔ پیشِ نظر مثنوی میں اس کے برخلاف مطرب نامہ لکھا گیا ہے اور جا بجا موسیقی کے متعلق ابیات بطور عنوان دی گئی ہیں۔ ان میں شاعر نے اہتمام کیا ہے کہ نفسِ مضمون کی طرف قاری کے ذہن کو منتقل کرنے والے قرینوں کے علاوہ موسیقی کی اصطلاحوں اور راگ رنگینوں کے نام نظم کئے جائیں۔ مصنف نے خود اس کو اپنی ایجاد بتایا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے۔

خسرو شیریں کو جب میں نے کہا	ساقی نامہ اس کی سرخی کو کیا
ہے بجائے سرخی مطرب نامہ یاں	دیکھ اس کو خلق ہوگی شادماں
طرز یہ میں نے نکالی ہے نئی	راگ کے بھی نام ہیں اس میں کئی
ساقی نامہ جو کہے ہیں شاعراں	کہہ گئے ہیں آخر ہر داستاں
بعضے شاعر ابتدا میں بھی کہے	شعر کے تئیں زینت و رونق دے
پھر بجائے سرخی کوئی نیں کہا	درمیاں اس کو کسی نے نیں لکھا

ہم اپنی محدود معلومات کی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ یہ مصنف کی جدت ہے اس لئے کہ غالباً اس سے قبل کسی نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا اور نہ اس کے بعد کے مثنوی نویسوں نے اس کو رواج بخشا۔ مطرب نامہ کی دو تین مثالیں یہ ہیں:۔

کہہ سہانا سا شہانا مطربا ۔۔۔ یا کوئی اچھی سی درباری سنا

جلد آ اے مطرب فرحت نشاں　　بول کر ہنڈ دل کر دے شادماں
اب نئی شاہنشاہی بولی سُنا　　نیک اختر ایک جو پیدا ہوا

مصنف نے اس مثنوی کے لکھنے سے قبل اس موضوع پر فارسی کی تقریباً تمام اور ایک آدھ دکھنی مثنویاں کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ مولانا جامی، حضرت امیر خسرو وغیرہ کی مثنویوں پہ مولانا نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں کو فوقیت دیتا ہے اور وہ خاص طور پر اس کے پیش نظر ہے۔ وجہ تصنیف کے ضمن میں مولانا نظامی گنجوی کے کمال کی ستائش کر کے اپنی تصنیف کے لئے انکی مثنوی کو ماخذ بنانے کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

وہ نظامی جو ولی اللہ تھا　　مثنوی گویاں میں شاہنشاہ تھا
اپنے خمسہ میں دیا ہے داد شعر　　خوب قائم اس سے ہے بنیاد شعر
اس لئے میں اسکی کر کے پیروی　　بولتا ہوں گا یہ ہندی مثنوی

مثنوی کی تاریخ تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے۔ خاتمۃ الکتاب میں یہ بیان کی گئی ہے۔

دل میں کر تاریخ کا اسکے خیال　　جب کیا پیر خرد سے میں سوال
یوں کہا ہے کھینچ کر کے آہ سرد　　اس کی اب تاریخ ہیگی داغ درد

اس مثنوی کی زبان اُس عہد کی شمالی ہند کی ترقی یافتہ زبان سے بہت ہی متاثر ۱۲۱۳ھ ہے۔ اس کا مصنف ارتقائے اُردو کے مرکز دلی سے دور دراز علاقہ کرناٹک کا باشندہ ہے۔ اس کی زبان شمالی ہند کے مابعد اثرات سے بالکل خالی ہے۔ دکن اور مدراس میں اُردو زبان رائج ہو کر جس قدرتی طریقہ پہ ترقی کر رہی تھی اس کا اندازہ اس قسم کی کتابوں سے کیا جا سکتا ہے اس کا مصنف کسی متعدی فعل ماضی میں "نے" کا استعمال کرتا ہے اور کہیں نہیں کرتا۔ بیسیوں الفاظ خالص جنوبی ہند کے ہیں جو شمالی ہند کے شاعروں کے کلام میں نہیں پائے جاتے تذکیر و تانیث کے اختلافات بھی بے شمار ہیں۔ اس کے باوجود بھی کتاب قریب الفہم ہے اور بلا کسی دقت کے اس کے مطالب و معانی پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دکن میں اُردو زبان جس طرح تدریجی ترقی کرتی ہوئی صاف ہوتی جا رہی تھی اس کی وجہ سے اس کتاب میں وہ اشکال نہیں جو دسویں اور گیارہویں صدی کی دکنی مصنفات میں پایا جاتا ہے۔ مصنف زباندانی کا مدعی نہیں۔ شمالی ہند کے روزمرہ سے اپنی زبان کے مختلف ہونے کا خود اس کو بھی اعتراف ہے۔

نظم یہ اُردو زباں میں میں کیا　　فکر میں اسکی بہت محنت سہا
روزمرے میں جو ہو اسکے خلل　　یہاں نہیں ایراد کا ہرگز محل
کیونکہ کرناٹک میں ہے میرا مقام　　یہاں کے لوگوں کی زباں دکھنی تمام

مصنف نے اس کتاب میں بعض جگہ اپنے حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ذکر شعرائے کرناٹک کے تذکروں موسوم بہ گلزار اعظم و صبح وطن میں بھی جستہ جستہ ملتا ہے۔ ان دونوں تذکروں کے مولف مولوی محمد غوث خاں اعظم ہیں وہ خود بھی کرناٹک کے باشندے اور وہاں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلا تذکرہ ۱۲۷۲ھ اور دوسرا ۱۲۵۸ھ میں تالیف ہوا ہے۔ یہ دونوں تذکرے کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے اول الذکر قلمی اور ثانی الذکر مطبوعہ مگر نہایت قدیم اور کمیاب ہے۔

مصنف مثنوی کا نام دونوں تذکروں میں غلام اعزالدین بتایا گیا ہے مگر پیش نظر مثنوی کے ایک شعر میں خود اس نے اپنا نام عزیزالدین لکھا ہے۔

ہے عزیزالدین نام کمترین ۔۔۔ رحم کر اے رحمۃ للعالمین

مصنف کے والد کا نام تذکروں میں حامد علی خاں گوپاموی لکھا ہے اور اس نے اپنا مولد چنیا پٹن بتایا ہے۔ تذکروں میں اس کی تاریخ پیدائش ۱۱۸۱ھ لکھی ہے۔

ہند ہے میرے بزرگوں کا وطن ۔۔۔ مولد اس عاصی کا ہے چنیا پٹن

مصنف مقیم جنگ کے خطاب سے سرفراز تھا اور اکثر نامی اور بعض مرتبہ مقیم بھی تخلص کرتا تھا۔ اس مثنوی میں اُس نے ہر موقع پر اپنا تخلص نامی ہی ظاہر کیا ہے۔ اس کا خاندان کرناٹک کے ممتاز گھرانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ صبح وطن میں لکھا ہے کہ وہ کرناٹک کی ایک مشہور و معزز خاتون سلطان النساء عرف بڑی بیگم کا داماد تھا اس نے اُس عہد کے عام شرفا کی طرح فاضل عالموں کے ہاں تعلیم پائی۔ عربی زبان، منطق تا قطبی و میر اور بعض رسائل تعریض کی تحصیل ایک مشہور عالم باعمل حافظ محمد حسین سے کی۔ اس کے علاوہ کرناٹک کے مشہور فاضل مولانا محمد باقر آگاہ کے فیضِ تربیت نے نامی کو اس زمانہ میں نامی بنا دیا تھا۔ آگاہ مدراس کے بڑے عالم، کثیر التصانیف اہل قلم اور شاعر تھے۔ شعرائے کرناٹک و مدراس میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی ان ہی کی تھی۔ نامی کو مولانا آگاہ کے ساتھ ایک خاص خاص اور عقیدت تھی اور وہ بھی ہمیشہ اپنی نظر عنایت رکھتے تھے۔ فارسی زبان کی تحصیل ان ہی سے کی اور شاعری میں بھی ان ہی سے تلمذ حاصل تھا۔ تذکروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ہی کی تربیت نے نامی کو میدانِ شعر و سخن میں نام آوری حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ اور نامی نے اپنے اقران و امثال کے آگے اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے۔

نامی کی ولادت کرناٹک کے مشہور نواب محمد علی کے عہد حکومت میں ہوئی۔ محمد علی نہایت مُسرف، عیش پسند اور کمزور رئیس تھا۔ وہ خاندانی جھگڑوں اور ریاست حاصل کرنے میں انگریزوں سے مدد لیکر ان کا غلام بن چکا تھا۔ کمپنی کے حکام جس طرح چاہتے کٹ پتلی کی طرح اس کو نچاتے تھے۔ غیر مساویانہ معاہدات کر کے اسکو کچھ

اس طرح اپنا پابند اور مطیع کرلیا تھا کہ اس کی ساری قوت انگریزی مفاد کی حفاظت کی نذر ہوتی رہی۔ اس نے ۱۷۹۵ء م ۱۲۱۰ھ میں وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا عمدۃ الامرا تخت نشین ہوا۔ یہ اپنے باپ کے مقابلہ میں زیادہ لائق اور چالاک تھا۔ اس نے باپ کی طرح مسرفانہ زندگی بسر کرنے اور انگریزوں سے قرضہ لیکر ان کا بندۂ بے دام بننے کی بجائے ریاست کے استحکام اور رعایا کی خوشحالی کی طرف توجہ کی۔ کمپنی کے حکام سے اس کے تعلقات بھی کچھ زیادہ دوستانہ نہ تھے۔ یہ رئیس ضرور کسی قدر تعلیم یافتہ تھا وہ شاعر اور اچھا خوشنویس بھی تھا۔ رؤسا کے لائق لڑکوں کی طرح اچھی قابلیت اور تدبر رکھتا تھا۔ جب سلطنتِ میسور سے انگریزوں کی چوتھی جنگ چھڑی تو اس نے انگریزوں کی بے جا حمایت اور فیاضانہ امداد میں اپنے باپ کی طرح زیادہ حصہ نہیں لیا۔ کمپنی کے عہدہ دار اور بالخصوص لارڈ ویلزلی اپنی جوع الارض سے اس کو وظیفہ پر گدی سے علحدہ کرکے اس کا سارا علاقہ چھین لینے کی فکر میں تھے۔ چوتھی جنگِ میسور کے سلسلہ میں اس پر فتح علی عرف ٹیپو سلطان سے ساز باز رکھنے اور اس کو خفیہ امداد دینے کے الزامات لگائے گئے۔ مگر اس نے صفائی کے ساتھ اپنی بے گناہی ثابت کی اور کمپنی کے حکام اعلیٰ کو اس کے تسلیم کرنے پر مجبور کردیا۔ اپنی زندگی تک اس نے اپنی نوابی کا بھرم رکھا۔ اور ۱۸۰۱ء میں وفات پائی۔ اسی سال انگریزوں نے اس کے خاندان میں پھوٹ ڈال کر اپنے سیاسی داؤ پیچ سے کرناٹک کا سارا علاقہ اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا۔

ناؔمی کے عروج و اقبال کا زمانہ اسی رئیس کا عہدِ حکومت ہے۔ عمدۃ الامرا نہ صرف خود شاعر بلکہ شعرا کا قدر داں بھی تھا۔ ناؔمی کو اس کے دربار سے ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا تھا۔ عمدۃ الامرا کی عنایتوں نے ناؔمی کو بہت جلد ممتاز کردیا۔ وہ کئی معزز خدمتوں پر فائز ہوا اور خوب ترقی کی۔ پیشِ نظر مثنوی اسی نواب کے عہد میں لکھی گئی ہے اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، مصنف نے نواب کی تعریف میں حق نمک ادا کیا ہے۔ مدح کے سلسلہ میں شاعر نے ایک جگہ اپنے ممدوح اور انگریزوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ممدوح کی برتری و عظمت عادتی مبالغہ آمیز انداز میں ظاہر کی ہے۔ مگر یہ بیانِ صداقت سے بالکل خالی بھی نہیں۔ عمدۃ الامرا کی ذات اور قابلیت ضرور قابلِ ستایش ہے۔

سب فرنگی روبرو اس کے ذرا — کر نہیں سکتے ہیں کچھ چون و چرا
یہ تو کیا ہیں بلکہ ان کا بادشاہ — حکم میں ہے اس کے ہر شام و پگاہ
بھیجتا ہے جو ولایت سے جہاز — بھیجتا ہے اس کو وہ نذر و نیاز

مولفِ گلزارِ اعظم کا بیان ہے کہ ناؔمی نے عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مشقِ سخن کی۔ مولانا محمد باقر آگاہ کے فیضِ تلمذ نے ناؔمی میں فارسی کی اچھی مہارت پیدا کردی تھی۔ صبحِ وطن و گلزارِ اعظم دونوں تذکروں میں

اس کے فارسی کلام کا کافی نمونہ مندرج ہے شعر بامزہ اور صاف ہیں۔ ان تذکروں میں اُردو اشعار کا نمونہ نہیں دیا گیا۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ اس نے بزرگانِ دین کے حالات و کرامات بھی نظم کئے ہیں۔ پیش نظر مثنوی میں اپنی ایک اور مثنوی "شیرین خسرو" کا ذکر کیا ہے

قصۂ شیرین خسرو جب کہا ایک عالم کے تئیں تو خوش کیا

نامی سنی مذہب اور خوش عقیدہ شخص ہے۔ بزرگانِ دین کی مدح سرائی کا دلدادہ تھا۔ نعت شریف کے سلسلہ میں صحابۂ کرامؓ اور بالخصوص خلفائے راشدینؓ کی بھی خوب مدح کی ہے۔

چار یار اس کے کا بولوں کیا شرف بجگیا ہے جن کا ڈنکا چو طرف
مرتبہ میں ہیں یہ چاروں چار گل ربع مسکوں میں ہے جنکا ذکر غل
سقف ایماں کے ہیں چاروں چار تھام خانۂ دیں کو ہوا جن سے قیام
ایک سے گل صدق کا ہے باغ باغ ایک سے خوش ہے عدالت کا دماغ
ایک سے گھر شرم کا معمور ہے ایک سے شمع کرم پر نور ہے

اس مثنوی کی تصنیف کے وقت نامی کی عمر (۳۳) برس کی تھی وہ صاحب اولاد بھی تھا اور اس وقت اس کے دو لڑکے حیدر حسین و احمد حسین نامی تھے۔ ان میں سے بڑے کی عمر (۷) سال بتائی ہے۔

اے مرے نور البصر حیدر حسین نت تجھے دیوے خدا آرام و چین
ہفت سالہ عمر تیری ہیگی اَب سن لسبع کو تجھے پہنچاوے رب
بھائی تیرا دوسرا احمد حسین جو ہے تجھ سا وہ بھی میرا نور عین

صاحب "صبح وطن" و "گلزارِ اعظم" کا بیان ہے کہ نامی نے (۵۹) سال کی عمر پائی اور ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔ وہ اپنی مملوکہ زمین متصل "خاص باغ" ارکاٹ میں دفن کیا گیا۔ پیش نظر نسخہ تاریخ تصنیف کے (۴۲) برس بعد اور اب سے (۹۱) برس قبل کا لکھا ہوا ہے "تاریخ کتابت بست و ہفتم ماہ رجب المرجب ۱۲۹۵ھ" اور کاتب کا نام "سید پیر" درج ہے۔ ہم نے برٹش میوزیم اور انڈیا کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھیں وہاں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ کتب خانہ آصفیہ بھی اس مثنوی سے خالی ہے۔ لیلیٰ مجنوں پر اُردو کے متعدد شاعروں نے مثنویاں لکھی ہیں۔ بعض سے ہم واقف ہیں مگر صحت کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُردو میں اس موضوع پر کتنی مثنویاں ہیں ؛

جانِ مضطر

از جناب ابوالکلام محمد بدرالدین صاحب بدرؔ متعلم ایم-بی-بی-ایس-کلاس (جامعۂ عثمانیہ)

عشرتِ جاوید کی لا نہ سکا تاب میں ، پانی کے دھارے میں بھی ماہیِ بے آب میں
کیا جو گھڑی بھر کسی ظرف میں گر ڈھل سکا ، رہتا ہوں بیگانہ وار صورتِ سیماب میں

کل نہیں پڑتی مجھے قلب ہے مضطر مرا ، مہر کی گردش سا ایک کب ہے یہ چکر مرا!
ہاں مرے نقشِ قدم چاند ستارے نہیں ، ساری فضا پر محیط رقص کا محور مرا

رُوپ بدلتا رہا روز فسانہ مرا ، جامِ حقیقت نُما آئینہ خانہ مرا
دہر کی نیرنگیاں میرے تلوّن میں ہیں ، برق کے کاندھے پہ شاید ہے ٹھکانا مرا

ڈھائے مرا ہر نفس قید کی تعمیر کو ، ایک ہی جھنکار سے توڑ دوں زنجیر کو
خضر بھی حیران ہے راہ بتائے کسے ، یاں تو بھٹکنے میں کچھ چین ہے رہگیر کو

ذرہ اگر خاک کا لے کو بڑھاتا رہے ، وجد کے گر ذوق میں تان چڑھاتا رہے
سارے ہم آہنگ ہوں آئیگی وہ بھی گھڑی ، تو یہ سبق کائنات کو جو پڑھاتا رہے

لَے سے ملے لَے تو ہو نغمۂ محشر بپا
وصل کے پہلو میں ہے رازِ قیامت چھپا

اردو جھنڈی بولی

از جناب محمد حمید اللہ صاحب

سالار جنگ اعظم نے سرکاری دفتر کو حیدر آباد میں اردو اکر جو بیج بویا تھا اس کی ایک شاخ جامعۂ عثمانیہ بھی اب بڑ کے درخت کی طرح ایک مستقل درخت بن گئی ہے اور اس کی ہر ڈالی اردو بولنے والوں پر سایہ فگن اور آیۂ رحمت ثابت ہو رہی ہے۔

جامعۂ عثمانیہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ اعلیٰ تعلیم کی کتابیں اردو میں مہیا کر دیں۔ اور اس میں ہر علم و فن کی تالیف آسان کر دی۔ بلکہ ایک غیر محسوس تاثر کے زیر اثر ہر جگہ اس سے مختلف کام لئے جانے لگے۔ یہاں ایسی صرف دو باتوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اِن میں سے ایک تو وہی ہے جو عنوان میں ہے اور اس پر نیچے تفصیل سے لکھا جائیگا دوسری چیز یہ ہے کہ قومی نشید (NATIONAL ANTHEM) اور فوجی قواعد بھی اردو میں آچکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل حیدر آباد کی ایک مخصوص علمی نمائش میں "فتح المجاہدین" نامی ایک کتاب پیش کی گئی تھی جس میں ٹیپو سلطان کی فوج کے قواعد و احکام درج تھے۔ اسی ضمن میں پریڈ کے احکام اور فوجی گانے بھی تھے جو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ فوجی گانے تو اردو میں تھے لیکن ڈرل فارسی میں تھی مثلاً "راست بیں" "تیز رو" "گرد" وغیرہ جو علی الترتیب آئز رائٹ، کوئیک مارچ اور ٹرن وغیرہ کے لئے ہیں۔ یہ قواعد ٹیپو سلطان کی فوج میں اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے رائج تھے اور ان سے اب بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب جملۂ معترضہ تھا۔

حیدر آباد میں کشافہ (SCOUTING) رائج ہوئے عرصہ گزر چکا ہے اور لفظ "کشاف" اسکاوٹ کے لئے عام طور سے مستقل ہونے لگا ہے۔ اس کے ابتدائی ضروریات یعنی حلف اور بارہ قانون تو اردو میں فوراً آگئے لیکن اور چیزوں کی جب طلب ہوئی تو رسد ہونے لگی۔

ریاستِ حیدر آباد میں کشافہ تیزی سے پھیل رہا ہے مگر یہی آبادی انگریزی سے بہت کم واقف ہے درجۂ دوم کا کشاف بننے کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ انگریزی جھنڈی بولی کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کیجائے۔ تحریک جامعۂ عثمانیہ کے تحت اردو جھنڈی بولی ایجاد کی گئی۔ اور مذکورہ ضرورت کی بنا پر اسے منظور و مروج کر لیا گیا۔

اشاروں سے گفتگو کرنے کی دو اصولی قسمیں ہیں اور ان میں کی بہت سی ذیلی قسمیں ہو جاتی ہیں انگریزی میں یہ "سما فور" اور "مارس" کہلاتی ہیں جو اس کے موجدوں کے نام ہیں۔

"سمافور" میں اشارچی کے ہاتھ میں دو جھنڈیاں ہوتی ہیں جنھیں مختلف زاویوں پر رکھکر مختلف حروف مراد لئے جاتے ہیں۔ اس کی ایک ذیلی قسم یہ ہے کہ چہرے پر مختلف مقامات پر انگلیاں رکھکر وہی کام لیا جاتا ہے

"مارس" بہت اہم قسم ہے اسی کی ایک شاخ تار کے اشاروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ دو قسم کی علامتوں کے تکرار اور نیچے اوپر دکھانے سے مختلف حروف بن جاتے ہیں وہ علامتیں نقطہ اور خط ہیں (۔ــــ) اگر ایک نقطہ بتایا جائے تو ایک خاص حرف بنتا ہے۔ دو سے دوسرا تین سے ایک اور چار سے کچھ اور اسی طرح خط سے۔ اس کے علاوہ ایک بار نقطہ اور خط دکھانے دو بار نقطہ ایک بار خط دکھانے وغیرہ وغیرہ اور ان کے برعکس سے مختلف ابجدی حروف مراد ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے گفتگو کرنے میں اگر جھنڈا مستقل ہو تو اس کو افقی یا عمودی حرکت دیتے ہیں، تار بھیجنی ہو تو اس کی ڈٹی کام میں آتی ہے جس سے دو ایک دوسرے سے ممتاز آوازیں نکلتی ہیں رات کے وقت روشنی کام میں لائی جاتی ہے اس میں تیز اور ہلکی روشنی کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اسی طرح دھویں سے یا تالی اور چٹکی سے بھی "مارس" بولی بولتے ہیں۔

"سمافور" طریقے میں صرف اٹھائیس زاویے بنتے ہیں:-

ع۱
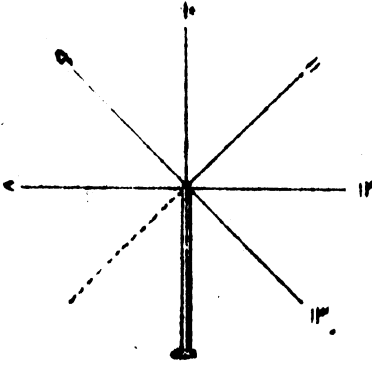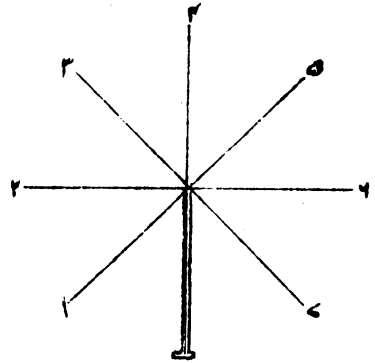
(اس میں ع۱ سے ع۳ تک بایاں ہاتھ قدموں کے سامنے رہے۔ باقی میں دایاں ہاتھ ع۷ تک میں کسی طرح بھی رکھا جا سکتا ہے اور دوسرا ہاتھ کسی ایک نمبر کے زاویے پر رکھے)

ع۲

(اس میں سیدھا ہاتھ لٹکتا چھوڑ کر اتنا اٹھائیے کہ بغل میں ۴۵ درجے کا زاویہ بنے۔ بایاں ہاتھ ع۸ سے ع۱۳ تک کسی جگہ رکھے)
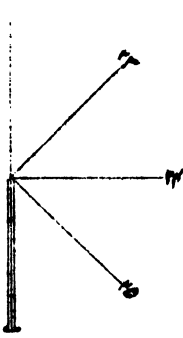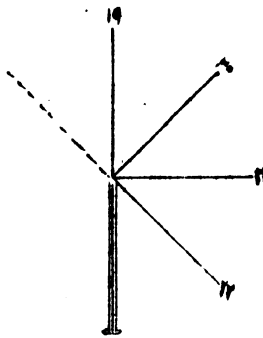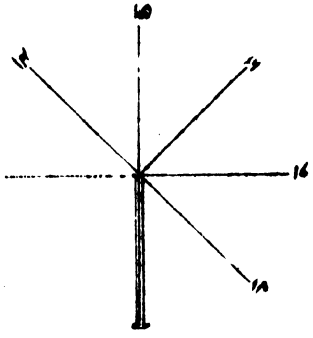
شکل ۳
(اس میں سیدھے ہاتھ اور جسم میں زاویہ قائمہ بنے۔ بایاں ہاتھ کسی ایک نمبر دار زاویے پر رہے)

شکل ۴
(حسب مذکور)

شکل ۵
(حسب مذکور)
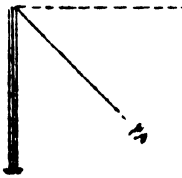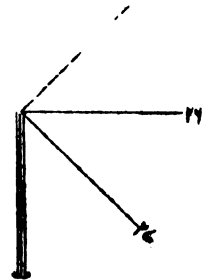
شکل ۶
(اس میں بایاں ہاتھ برکار رہتا ہے اور سیدھا ہاتھ ۲۶ یا ۲۷ پر ہوتا ہے)

(حسب مذکور)

اُردو "مارس" بنانا آسان ہے لیکن "سافور" بہت مشکل کیونکہ صرف ۲۸ طرح کے اشارے مل سکتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ صرف ان زبانوں میں کام آسکتا ہے جن کے حروفِ ابجدی اٹھائیس۔ یا اس سے کم ہوں۔

بہت کچھ آزمایش اور ضروری ترمیم کے بعد حیدر آباد میں نظامتِ کشافہ نے جو صورت منظور کی ہے وہ یہ ہے کہ اُردو میں اگرچہ ۳۵ حرف ہیں۔ لیکن "ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ" میں

۲۸ ہی حروف ہیں۔ پس ان میں سے اسی ترتیب سے الف سے غین تک اٹھائیس زاویوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھائیس حرف بتا دیئے جائیں۔ باقی حروف یہ ہیں۔

پ۔ چ۔ ژ۔ گ۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ یہ علی الترتیب ب۔ ج۔ ز۔ ک۔ ت۔ د۔ ر۔ میں ضم کر دیئے گئے ہیں اور ان کے بتانے کی یہ صورت قرار دی ہے کہ عربی حرف بتا کر تین دفعہ تیزی سے الف دکھا دیں تو وہ حرف بن جاتا ہے جو اس عربی حرف میں ضم تھا۔ مثلاً ب + ۱۳ = پ یا ت + ۱۳ = ٹ وغیرہ۔

اعداد کے لئے "ابجد ہوز حطی" نو حروف نو عددوں کے قائم مقام ہیں اور ی صفر کا۔ کئی ہندسوں کا عدد بتانا ہو تو دائیں ہاتھ سے ترتیب شروع ہوتی ہے۔ ق تقسیم کے لئے ہے یعنی ۳/۴ کو ج ق د بتایا جاتا ہے۔ ع اعشاریہ کے لئے ہے۔

خالص علامتوں میں ایستادہ رکھ کر تین مرتبہ تیزی سے الف بتانا حرف نما (ALPHABETICAL SIGN.) ہے اور تین دفعہ ز بتانا عدد نما (NUMERICAL SIGN.) ہے۔ بوقت واحد دو ہاتھ متحرک رکھ کر الف اور ز بتانا غلط نما (ANNUL) ہے۔ یہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں میں سے بعض کی ایجاد تھی۔ اس کے سکھانے کے لئے نظامت کشافہ ایک باتصویر رسالہ شائع کر رہی ہے جس سے بغیر معلم کے ہر شخص چند منٹوں میں اس سے واقف ہو جاتا ہے ——— امر دیں "مارس" اب سرکاری طور سے زیر آزمایش ہے۔ پنجاب اور صوبہ جات متحدہ کی اس جانب توجہ منعطف کرائی جاتی ہے ؏

(+)

رُباعیات

از جناب محمد علی صاحب قتیل حیدرآبادی

خوش شیوہ و رسم دلربائی داری
با دشمن و دوست آشنائی داری
حسنت بہزار پردہ پنہاں ماند
لیکن ہمہ جا جلوہ نمائی داری

از شانِ جمال دلربائے ہمہ
بیگانہ و لیک آشنائے ہمہ
چشمے نہ کند دعوی دیدار ترا
ہرچند کہ تو جلوہ نمائے ہمہ

اللہ نہ گوئیم کہ گلشن چون است
ذات و صفتِ او ز خرد بیرون است
او واجب وحی و لاشریک است قتیل
زیں حد چو کسے بگزرد او مجنون است

بادۂ دکن

شبیر محمد خاں ایمان

(۳)

جلوس آصفی والا قصیدہ ملاحظہ سے گزر چکا ہے۔ قصائد کی پوٹ کی پوٹ ہے، نعت میں ہے، منقبت میں ہے، مدح میں سلطنت کے ساتھ امرائے دولت بھی ہیں۔ حضرت آصفجاہ ثانی کی مدح میں کئی قصائد ہیں اور ان میں پوری قصیدہ گوئی کی شان موجود ہے۔ مسلسل قصیدہ خوانی سے ممکن ہے کہ طبیعت اکتا جائے اس لئے تبدیل ذائقہ کے طور پر اس نمبر میں "رباعیاں" دی جاتی ہیں، رباعی شاعر کے لئے ایک کٹھن صنف ہے فارسی میں صرف دو چار شاعر اس خصوص میں مشہور ہیں، متقدمین اُردو میں تو سرے ہی سے برکت ہے۔ متاخرین میں میر انیس و دبیر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ایمان کی رباعیوں کو میر و میرزا کے زمانی اعتبار سے دیکھنا چاہیے، ان کی رُباعیاں منقبت، مدح، اخلاق، ادب، استقامت، یاد ایام عیش و طرب، وصل و ہجر، اور رندی کے مضامین پر حاوی ہیں۔

(عمر یافعی)

ماتم میں شہیدِ کربلا کے واللہ
پہنا ہے لباس آسماں نے بھی سیاہ
تشریف وہ لائے کلبۂ احزاں ہیں
رونا جسے منظور ہو، اور نالہ و آہ

اس بزم میں جوں شمع فقط رونا ہے
اور نامۂ اعمالِ سیہ دھونا ہے
تشریف اگر لائیے تداج امام
ضائع یہ نہیں اجر کہیں ہونا ہے

ماتم میں حسین کے جو روئیں احباب
ہر قطرۂ اشک ہے بہ از گوہرِ ناب
رووے کہ رُلاوے جو کوئی آج محب
واجب ہے بہشت اُس پہ از روئے کتاب

اب غم میں حُسین کے جگر پانی ہے
جو چشم ہے سو وہ ابرِ نیسانی ہے

لاناتشریف آج شب کو کہ یہاں ماتم ہے، بُکا ہے، مرثیہ خوانی ہے

(۲)

دنیا کے نہ مال و زر سے ہو تو مانوس شمع کافور یا بلوریں فانوس
قاروں کی طرح سوائے گنجِ حسرت کچھ اپنے نہ ساتھ لے گیا دقیانوس

کل پائے گا تو یوں ہی جہاں میں ظالم! کل پائے گا تو یوں ہی جہاں میں ظالم!
بے چین کسی کو جب رکھا تو کیو نکر کل پائے گا تو یوں ہی جہاں میں ظالم!

(۳)

ہو عاشقِ صادق نہ خبر کا محتاج بس دل کی تپش نہ بال و پر کا محتاج
جس کو کہ نہیں عشق ہے کامل حاصل فریاد و فغاں کے ہے اثر کا محتاج

ہو عشق کے ہم سر نہ کبھو حرص و ہوس پروانے کے منصب کو نہ پہنچے ہے مگس
معشوق کا در اصل تغافل ہے محک ہو جس سے کہ دریافت ہر اک ناکس و کس

(۴)

نے ہم وہ رہے ہیں اب نہ وہ یار رہا بلبل ہی نہ وہ۔ نہ اب وہ گلزار رہا
گا ہے ماہے کہیں جو مل جاتے ہیں خالی باتوں کا ٹک سروکار رہا

(۵)

غیروں کی سنو مزے سے ساری باتیں اور تلخ لگیں تمہیں ہماری باتیں
اُڑتے ہو یہ کس سے باز آؤ صاحب! ہم خوب سمجھتے ہیں تمھاری باتیں

(۶)

گر جان تجھے عزیز ہووے پیارے! قرآن، تجھے عزیز ہووے پیارے!
سوگندِ دروغ تو نہ کھایا کر اگر ایمان، تجھے عزیز ہووے پیارے!

ہے تجھ کو جوانی کی ترقی اے یار! ہے نور مہِ نو کی طرح لیل و نہار
ازبس کہ ترا حسن ہے ہر آن فزوں تصویر مصور سے ہے کھینچنا دشوار

جھوٹے اخلاص یہ زبانی کب تک ؟ پیغام و سلام و شعر خوانی کب تک ؟
ہو وصل کہ فصل خیر اتنا کہہ دو آخر ہووے گی یہ کہانی کب تک ؟

ہے حسن کا اوروں کے بھی گرچہ چرچا دل اپنا نہ تجھ سوا کسو سے پرچا
تیرے سودے میں یہ تو گزری ہم پر کیا مال ہے دل کہ نقد جاں بھی خرچا

درکار ہے مجھ کو تجھ سے ملنا لیکن دشوار ہے، مجھ کو تجھ سے ملنا لیکن
بے تاب ہے دل نہ مل تو مجھ سے ہر چند اک بار ہے، مجھ کو تجھ سے ملنا لیکن

آنے کی جو گلبدن کے پائی آہٹ نرگس کی گئی چمن میں جھٹ نیند اُچٹ
شمشاد نے سرو قد عرض دی تعظیم غنچے لینے لگے بلائیں چٹ چٹ

(۷)

جس دم کہ ہوائے برشکالی ہووے شیشہ میں شراب پُرتگالی ہووے
اللہ ہی اللہ ہے اُس وقت اگر آغوش میں یار لاابالی ہووے

گھر میرے جو وہ پری کل آئی شب کو بے چین گئی۔ مجھے کل آئی شب کو
پھر جنبش شاخ گل نہ بھائی زنہار مُڑتے دیکھی جو وہ کلائی شب کو

کیوں کر ہو کسی کے اب موذن دل خواہ؟ کرتا ہے جو تلخ خواب شیریں ناگاہ
وہ "حیّ علی الصلواۃ" بولے۔ اور میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ

(۸)

اپنی ہی طرف سے کی جدائی تو نے ٹک بھی نہ نبھائی آشنائی تو نے
عالم ہے تری وضع کا ظالم شاکی اک مجھ سے ہی کی نہ بیوفائی تو نے

جوں گل یہ چاک سینا ہے عبث خون دل کا برنگ غنچہ پینا ہے عبث

حاصل نہیں تدبیر سے کچھ اے ناصح! مرنا ہی بھلا ہے اب تو جینا ہے عبث

سو بار اگر روٹھ گیا ہے ہم سے پھر آپ سے ہی آن ملا ہے ہم سے
ہیں ناز کے انداز ہزاروں اس میں کہتا ہے یہ کون؟ "وہ خفا ہے ہم سے"!

ٹک آنکھ لگی ہے شب کو روتے روتے دیکھا سپنے میں تجھ کو سوتے سوتے
پھر آنکھ جو کھل گئی یکایک جوں شمع جاں آئی لبوں پہ صبح ہوتے ہوتے

آنا کہ ہے وقت مہربانی جانی یا بھیجدے کچھ اپنی نشانی جانی
کہیو قاصد کہ ہے جو عاشق تیرا دیتا ہے وہ جان کہہ کے "جانی جانی"

مجلس میں تو ہم سے بے حجابی معلوم! خلوت میں بھی آہ باریابی معلوم!
احوال ہمارا جو کبھو عرض کرے ایسا تو کوئی یار ثوابی معلوم!

از بسکہ رقیب سے نپٹ ڈرتا ہوں کوچہ میں ترے قدم نہیں دھرتا ہوں
ناچار کیا ہوں ضبط دل کا اپنے ہر چند کہ ملنے کے لئے مرتا ہوں

(۹)

مطلوب ہے وہ شراب لے اہلِ شعور درکار نہ صندل کی نہ قندی منظور
کیفیت نشہ میں ہو ایسی لذت ہو جس سے کہ آب آب۔ آبِ انگور

وعدہ جو کیا ہے سو شتابی بھیجو! پر شرط ہے یہ۔ کہ انتخابی بھیجو
دیکھے سے ہو نشۂ و مسرت جس کے اک ایسی شراب کی گلابی بھیجو

پھر ویسا ہی بھیجو ایک مُل کا شیشہ جوں غنچۂ گل۔ بہارِ گُل کا شیشہ
منظور ہے یہ مثل جام جمشید رکھے احوال، جزو کُل کا شیشہ

تنقید و تبصرہ

بہشتی جوہر یا اسباق النسواں

ضخامت (۲۰) صفحات۔ تقطیع ۲۴ × ۳۶/۱۶۔ از محمد مرزا خاں صاحب دہلوی، مطبوعہ حمایت دکن پریس بازار عیسیٰ میاں حیدرآباد دکن قیمت ۰ ار ملنے کا پتہ درج نہیں غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ سے مل سکیگی۔

لکھائی چھپائی بھی صاف ہے البتہ طباعت میں کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتابت و طباعت کی غلطیاں لیتھو پریس کے گلے کا ہار سمجھی جانے لگی ہیں۔ کتاب کا موضوع قریب قریب وہی ہے جو مولانا اشرف علیصاحب تھانوی کی بہشتی زیور کا ہے چنانچہ جس مقصد کے پیش نظر اس سلسلہ کی ابتدا کی گئی ہے"۔ اس کے متعلق دیباجہ میں عورتوں میں اعلیٰ مذاق کی ترقی اور پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ:۔

> "اب ضرورت ہے کہ بجائے قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں اخلاقی درس دینے کے اپنی بہنوں کی اخلاقی کمزوریوں پر سنجیدگی سے بحث کی جائے اور ان کمزوریوں سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کو فلسفیانہ طرز میں اُجاگر کرکے دکھایا جائے تاکہ وہ اس آئینہ میں اپنے معائب خود دیکھ لیں اور چُپ کے ہی چُپکے آپ اپنی اصلاح کرتے رہیں"۔

کتاب کس حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی ہے؟ اس کا ٹھیک ٹھیک جواب تو اس وقت ملیگا جبکہ زمانہ کے ہاتھوں صنف نازک کی قدردانی اور پبلک کی ہمت افزائی کی مہر ثبت ہو جائے گی۔ لیکن یہاں قدرتی طور پر ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاقی سبق پڑھانے اور اصلاح رسوم و عادات کا یہ براہ راست طریقہ چاہے کیسا ہی فلسفیانہ اور خوش آئند کیوں نہ ہو کہاں تک قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں اخلاقی درس دینے پر فوقیت رکھتا ہے علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہماری صنف لطیف کی عام علمی سطح نہایت پست، غیر عقلی اور اوہام و خرافات سے پُر ہے؟ اور موجودہ حالات میں ہم کہاں تک عورتوں کی اصلاح کے اس کامیاب طریقہ سے دست بردار ہو سکتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر ہماری زبان کے بعض باکمال اور مشہور مصنفین اس طبقہ کی عدیم المثال خدمت بجالا چکے ہیں؟ حالی، نذیر احمد اور راشد الخیری کی

تمام اصلاحی تحریکات بھی، قصے کہانیوں کا لباس پہنکر نمودار ہوتی اور اپنی کامیابی کا لوہا منواتی ہیں۔

لیکن اس سے یہ ہرگز سمجھنا چاہیئے کہ ہم کتاب کے موجودہ طرز اور مضامین و مطالب سے مایوس ہیں۔ جناب مرزا اسد خاں صاحب نے اس رسالہ میں نہایت عمدگی کے ساتھ مختلف اسباق میں عورتوں کی عام کمزوریوں پر بحث کر کے حتی المقدور ان کے اسباب اور وجہ کی تدابیر بتلانے کی کوشش کی ہے، زود اعتمادی، غیر مستقل مزاجی، اخلاقی حس ہمیشہ متاثر رہتی ہے فرائض اور مسرت میں فرق تمیز کرنا، طعن و طرز درشتی، غیبت اور نکتہ چینی، نفسیات عورت کے عنوانات پر ایک (۲۷) صفحہ کے رسالے کی گنجایش کا لحاظ کرتے ہوئے سیر حاصل بحث کی ہے جو امید ہے کہ ہماری عام پڑھی لکھی بہنوں کے لئے کار آمد ثابت ہوگی۔ ہم جناب مرزا خاں صاحب سے امید کرتے ہیں کہ وہ اس مضمون کی دوسری قسط بھی بہت جلد پریس کو بھیجدیں گے۔ اور اس طرح ہماری بہنوں کی ترقی اور اصلاح میں مدد پہنچائیں گے۔

کتاب کی زبان فصیح اور شستہ ہے البتہ کہیں کہیں کسی قدر زبان میں گرانی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ ان کو کتاب میں اکثر جگہ اخلاقیات اور عمرانیات کے بعض دقیق مسائل سے دست و گریباں ہونا پڑا ہے ایک آدھ جگہ ایسے نئے محاورے نظر آتے ہیں جو ہم حیدرآبادیوں کے کانوں کے لئے نئے ہیں۔ بچوں میں عمدہ اوصاف بھرنے چاہئیں (صفحہ ۲۳)۔ ان فروگزاشتوں سے قطع نظر کتاب دلچسپ اور مفید ہے اس لئے ہم ہر ادب دوست سے عموماً اور عورتوں کی اصلاح سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے خصوصاً مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں (ا ع م)

گدگدی
حصۂ اول
ہنسی کی کہانیاں

ضخامت (۲۷) صفحات تقطیع $\frac{27 \times 16}{8}$ ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور قیمت ۲ار ہے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ۲۳ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے جس کو دار الاشاعت پنجاب (لاہور) نے شایع کیا ہے۔ اُردو ادب کے لئے پنجاب جو خدمات انجام دے رہا ہے اسکے مفید (اور مضر) اثرات صاحبانِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور کا مطمح نظر ہمیشہ قوم کی ان کمسن ہستیوں کیلئے ادبی اور علمی ذخیرہ فراہم کرنا رہا ہے۔ جن کی ضروریات کی طرف ہم نے ابھی تک سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ قدم نہیں بڑھایا۔ چنانچہ بیسیوں کتابیں کمسنوں کی ضیافتِ طبع کی سرمایہ دار بن کر، اس اشاعت خانہ سے نکل چکی ہیں۔ ہنسی کی کہانیوں کے خود نام سے انکا حال روشن ہو رہا ہے کہ ہنسنے اور ہنسانے کے سوائے انکا کوئی کام نہیں۔ کم علمی میں اگر جدید ترین حالات سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے تو وہ صرف قصہ اور کہانیوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے جنہیں تاریخی، تمدنی اور علمی حالات اور اصلاحات نہایت نظر فریب طریقہ سے پیش کیجا سکتی ہیں۔ اس طرح محنت کے بعد ہنسی مذاق میں حصہ لینا ننھی ہستیوں کے وجود میں لانے کا ضامن ہے اسلئے ایسے طالبعلم (بلکہ انکے سرپرست) اس امر کا ضرور لحاظ رکھیں کہ بچوں کی میز چند مذاقی کتابوں سے خالی نہ رہے۔ اس کیلئے "ہنسی کی کہانیاں" مفید ہیں۔ اس مجموعے کے تمام قصے دلچسپ ہیں۔ لیکن آخری قصہ بیحد دلچسپ اور سبق آموز ہے ؛ (س)

معلومات

حساب کرنیوالی مشین

وسٹن کے میسا نسچو وٹس انسٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ایک ریاضی داں نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے۔ جس کے ذریعہ سے مشکل سوال باتوں باتوں میں حل ہو جاتے ہیں۔ اس مشین کے ذریعہ ایسے سوالات کا جن کے حل کرنے میں آدمیوں کو ہفتوں اور مہینوں لگ جاتے ہیں، بجلی کا بٹن دبانے اور موٹر چلانے سے صرف ۸ منٹ میں ٹھیک ٹھیک جواب نکل آتا ہے۔

ٹیلیفون یا چلتا پھرتا آدمی

یہ چلتا پھرتا آدمی کل کا بنا ہوا ہے سنتا سمجھتا ہے پر بول نہیں سکتا۔ اس کو ٹیلیفون کے ذریعہ جو حکم دیا جائے اس کو پورا کر دیتا ہے اور تعمیل کی بھی اطلاع دے دیتا ہے۔ باہر جاتے ہوئے اس کو گھر میں رکھ چھوڑیئے، وہ آپ کے ایک وفادار اور اطاعت گزار نوکر کی طرح کام کریگا۔ اس اعجوبہ چیز کو ویسٹنگ ہوس الیکٹرک اینڈ مینو فیکچرنگ کمپنی کے آر جے، ونسلے نامی ایک انجینئر نے ایجاد کیا ہے۔

کتابیں بیچنے کی مشین

اس مشین میں کتابیں شیشے کی الماری میں سجی رہتی ہیں۔ ہر ایک کتاب پر نمبر اور اس کی قیمت درج رہتی ہے جو باہر سے نظر آتی ہے مشین کو ایک ہینڈل لگا رہتا ہے آپ کو جس نمبر کی کتاب درکار ہو۔ ہینڈل کو گھما کر اس نمبر پر کر دیجئے۔ ایک سوراخ میں کتاب کی قیمت ڈال دیجئے اور دوسرے ہینڈل کو پکڑ کر کھینچئے تو کتاب باہر نکل آویگی۔

عجیب پنسلیں

یہ پنسل حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے جو جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم ٹھیک ٹھیک کر دیا کرتی ہے۔ یہ پنسل بنک والوں، حساب کرنے والوں اور طالب علموں کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔

ایک دوسری پنسل ہے، جس سے اندھیرے میں لکھا جا سکتا ہے اس کی نوک کے قریب بجلی کا ایک چھوٹا سا بلب لگا رہتا ہے جو روشن ہو کر اس جگہ جہاں لکھنا ہوتا ہے روشنی ڈالتا ہے۔ بلب کی حفاظت کے لئے فونٹین پن جیسا ایک ڈھکنا بنا ہوا ہے۔ یہ پنسل جیب میں رہ سکتی ہے۔

تیسری پنسل ایسی بنی ہوئی ہے جو انگوٹھی میں آ جا سکتی ہے انگلی میں انگوٹھی کے مانند رہ سکتی ہے ضرورت کے وقت انگوٹھی سے پنسل نکال کر لکھا اور پھر انگوٹھی میں ڈال دیا۔ پنسل کے کھو جانے کا جو ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے، وہ اس سے دور ہو جاتا ہے۔ (غ۔ ر)

جدید و تازہ کتب اور رسالے

وہ کتابیں جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع یا مکتبہ میں آئی ہوئی ہیں اس قسم کی کتابوں کی فہرست ماہانہ مجلہ میں شائع ہوگی

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
عالم خیال مع مقدمہ بیگم صغرا علی مولفہ شوق قدوائی	۱/	سفرنامہ امام شافعی از شرر	۵/
انقلاب فرانس ناول مترجمہ عبدالرزاق صاحب	۸؍	قانون وراثت اسلام از "	۵/
سائنس و فلسفہ مصنفہ مولوی عبدالمتین صاحب	عہ۸	رفع النقاب از "	۱۰/
فلسفہ کی تعلیم از عبدالماجد صاحب بی اے	۵/	معتزلہ از "	۱۵/
مرغیوں کا رکھ رکھاؤ از لسئے کے فاکس	۱۰/	نیکی کا پھل از "	عہ۸
ابلیس کا خطبۂ صدارت	۱۰/	پنجاب میں اردو از پروفیسر محمود شیرانی	۴ہے
حقیقت حال از نظامی	۱۰/	ترانۂ قوم مولفہ نرائن دت سہگل	عہ۸
اردو لشکر از سید شاہ علی حسن	۵/	تاریخ الامت حصہ ششم از اسلم جیراجپوری	۸؍
ہیبت ناک افسانے از سید امتیاز علی تاج	عہ۸	عبرت از خواجہ عبدالحی فاروقی	عہ۸
حسن کی قیمت از احمد شجاع	۸؍	ذکری از "	عہ۸
گلزار عشرت (نایاب) از عبدالصمد صاحب صفی	عہ	مبادی معاشیات از ذاکر حسین خاں	عہ۸
نظم شہید (") از میر نادر علی رعد	عہ	قول فیصل از ابوالکلام آزاد	عہ۸
قرآن شریف بقلم اورنگ زیب عالمگیر	۸ہے	چمن (مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب)	۵/
اسلامی تعلیم از محمود صاحب زیدی	۱۲ہے	کلام شبیر از شبیر حسین قدوائی	عہ۸
جوہر عصمت از راشد الخیری	عہ۱۲	نالۂ شبیر "	۱۵/
قلب حزیں از "	۱۰/	نامۂ شبیر "	۶/۸
گیری بالڈی از لالہ راجپت رائے	عہ۸	دنیا کے بسنے والے از سید شبیر حسین زیدی	۶/۸
سیواجی از "	۸؍	زیدی	
محلہ دکم توارن از موہن لعل بی اے	۱۰/	ان ہیپی انڈیا (انگریزی) جواب مدر انڈیا لالہ لاجپت رائے	لہ

حسب ذیل ماہانہ و ہفتہ وار رسالے اور اخبار مکتبہ ابراہیمیہ سے خریدے جا سکتے ہیں۔

نیرنگ خیال ۵ کلدار معاون ۵ زنانہ عثمانیہ	نگار ۸/ " ۹/۸ عثمانیہ	مخزن ۶/ " ۸/ "	نظام گزٹ (ہفتہ وار) ۴/۸ عثمانیہ
عالمگیر ۵/ " ۵ زنانہ	معارف ۸/ " ۹/۸ "	مجلہ مکتبہ ۶/ "	(رعیت) " ۴/۸
عصمت ۵/ " ۵ زنانہ	ہمایوں ۸/ " ۹/۸	تجلی (ششماہی) ۱۲ "	عالمگیر خاص نمبر عہ کلدار عہ۸
بنات ۲/ " ۲/۸	زمانہ ۸/ " ۹/۸	مجلہ عثمانیہ "	نیرنگ خیال عید نمبر عہ ک عہ۸

ہمایوں سالگرہ نمبر عہ ک عہ۸ مخزن سالگرہ نمبر عہ ک عہ۸ عثمانیہ

نیرنگ کا میر نمبر!

غالب پرستی کے عروج نے ہندوستان کو کسی دوسرے شاعر کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ نہیں دیا حالانکہ اردو کا بہترین شاعر اس وقت میر تقی ہے جس کی شاعری اور خوشگوئی کو برابر اساتذہ فن تسلیم کرتے چلے آئے ہیں غالب کہتے ہیں "آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں" مگر کیا یہ افسوس نہیں کہ میر کے دیوان کا کوئی بہتر اور صحیح ایڈیشن اس وقت تک ہندوستان میں شائع نہ ہوسکا۔ نول کشور پریس کا احسان ہے کہ اس کی بدولت دیوان ردی سی حالت میں ہو دستیاب ہو جاتا ہے مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے ایک انتخاب شائع کیا مگر وہ بھی باعتبار اختلاف طباع کلم تشنہ ہے۔ لکھنؤ میں مجھے لسان الہند حضرت عزیز سے مل کر مسرت ہوئی کہ ان کو یہ خیال ہے کہ اگر میر کے دیوان کے مختلف صحیح نسخے دستیاب ہو جائیں تو کلیات کو مکمل طور پر مرتب فرمائیں جس کا سلسلہ موصوف نے شروع بھی کر دیا ہے اس وقت اکثر نصاب تعلیم میں میر کا کلام داخل ہے میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میر نمبر نہایت اہتمام سے شائع کردوں اور مختلف یونیورسٹیوں میں کوشش کیجائے کہ میر نمبر کسی نصاب میں داخل کردیا جائے میری سعی کو کامیاب بنانا مشاہیر ارباب ادب کا کام ہے میں اپنی امکانی کوشش میں دریغ نہیں کرونگا امید ہے کہ ملک کے انشا پرداز شیدائیان میر خاص توجہ سے کام لیں گے اور مندرجہ ذیل عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر خامہ فرسائی فرما کر میر نمبر کو کامیاب بنانے میں میری امداد فرمائیں گے۔ مشاہیر اہل قلم کی ایک سبرل کمیٹی مضامین کا انتخاب کریگی سب سے بہتر مضمون پر ایک اشرفی پیش کیجائیگی تمام مضامین دسمبر ۱۹۲۳ء تک دفتر نیرنگ میں آ جانا چاہئیں **عنوانات** (۱) میر کے حالات زندگی (۲) میر کے خصوصیات شاعری (۳) انتخاب کلام میر (۴) تبصرہ (۵) میر کا موازنہ ان کے معاصرین سے (۶) میر اور سودا کے قصاید (۷) میر کی مثنویاں (۸) میر کا فارسی کلام (تمام مضامین کاغذ کے ایک رُخ پر خوشخط معہ مفصل پتہ کے تحریر ہوں)۔

نیرنگ کا خاص نمبر (۱۰۰) صفحات میں نہایت آب و تاب کے ساتھ متعدد تصاویر و مشاہیر اہل قلم کی عکسی تحریروں سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکا ہے یہ نمبر جنوری ۱۹۲۵ء کا رسالہ نیرنگ کے چوتھے سال کا پہلا نمبر ہے قیمت فی جلد عہ

نیرنگ کی سالانہ قیمت ہے ششماہی عہ ہے۔

محمد عزیز احمد خاں - مدیر نیرنگ

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں۔

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں (برص تشریح یعنے کوڑھ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے حکیم مولوی محمد عبدالقادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دار التشخیص انجمن اطبا یونانی حیدر آباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولے رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مرضا برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور [illegible] کامیاب ہوئے۔ میں نے بچشم خود مرضا برص کا معائنہ کیا ہے بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت [illegible] حب موصوف کی بہترین قابلیت اور معجز دوا کا اثر ہے۔ میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے [illegible] ب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص [illegible] کیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ

دستخط افتخار الحکما حاذق جنگ،
صدر مہتمم طبابت یونانی سرکار عالی

مطبوعات مکتبہ

علمی و ادبی کتابیں

دکن میں اردو مولفہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ اس کتاب میں جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ اور قطب شاہی اور عادل شاہی۔ اور آصف جاہی دور میں اردو نظم و نثر کی کیفیت اور ہر دور کے شعراء کے جستہ جستہ حالات کے ساتھ ان کا نمونہ کلام پیش کر کے اردو زبان کا ارتقاء دکھلایا گیا ہے ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

خیابان اردو مرتبہ جناب احمد عارف صاحب حیدرآبادی۔ یہ ہندوستان کے ماضی و حال کے ممتاز اردو انشاپردازوں اور نامی گرامی شعراء کے چیدہ نظم و نثر کے جواہر ریزوں کا مجموعہ ہے اردو ادب میں بہترین انتخاب ہے۔ شرستان ادب کیلئے پرکیف تحفہ ہے یہ کتاب مدارس کی تعلیمی ضروریات کو بھی کما حقہ پورا کرسکتی ہے۔ ضخامت تقریباً ۲۵۴ صفحہ سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20 \times 30}{16}$ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

روح تنقید اس کتاب کو ملک کے فاضل انشاپرداز مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے نے تصنیف کر کے اردو ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اردو دنیا کو علماء یورپ کے فن تنقید سے روشناس کرایا جائے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے زور صاحب نے اس کتاب میں یورپ میں دور حاضرہ کے علاوہ دور ماضی، دور متوسط اور عہد بیداری میں جس قدر نقد و نظر کے اصول جاری و ساری تھے ان سب کو بیان کیا ہے اور پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید کر کے ان کا استعمال دکھلایا ہے ضخامت (۳۰۵) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20 \times 30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ طبع دوم عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبان کے مشہور اہل قلم کی قلم کاریوں پر تنقید کر کے تنقیدی اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نثر اردو، میر انیس کی شاعری، میر حسن کی سحر البیان، فارسی نثر کا آغاز اور ابو علی بلعمی، ہوریس، اسمتھ، کیفی حیدرآبادی کی سرخیوں کے تحت ہر ایک کے کلام، طرز تحریر اور اسلوب بیان پر تنقید کی گئی ہے اور متعلقہ مضمون کے خاتمہ پر اس کی ببلیوگرافی (Bibliography) کا بھی اضافہ کیا گیا ہے تاکہ مزید تحقیق کرنے والوں کے لئے سہولت ہو ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحہ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ ہے

اردو کے اسالیب بیان مصنفہ زور صاحب ہر زبان کے ادب میں اسلوب بیان کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اردو ادب میں نظم کے اسالیب بیان کا ابتداء سے لیکر آج تک کا حال اردو تذکروں سے معلوم ہوسکتا ہے لیکن نثر کے طرز تحریر کے متعلق اردو کے تذکرے اور تاریخیں ساکت ہیں اس کتاب سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اردو نثر نگاری کی ابتدا کب ہوئی اور مختلف دوروں میں اس کا کیا رنگ رہا اور موجودہ زمانہ میں خاص طرز تحریر کے کون کون انشاپرداز ہیں ضخامت ۲۴۴ صفحے پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا اور لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب غزنوی سلطنت [illegible] حالات سلطان محمود غزنوی سے پہلے کے فارسی علم ادب کی حالت سلطان محمود کی معارف نوازی دربار غزنین کے ارباب علم و فضل کے حالات اور سلطان محمود اور غزنوی دور کے علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ہے ترتیب کتاب کے وقت ادبیات ایران مصنفہ پروفیسر ادورڈ براؤن کے زیر مطالعہ رہی ہے ضخامت ۲۰۰ صفحہ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲

طلسم تقدیر مصنفہ زور صاحب یہ ایک نیم تاریخی فسانہ ہے جس میں دکن کی تاریخ اور اس کے باشندوں کی تمدنی حالت

پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نیز اس میں تقدیر و تدبیر کے اہم
مسئلہ کو بڑی خوبی سے سلجھایا گیا ہے ضخامت ۱۵۰ صفحے کاغذ
لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۸/

دنیائے افسانہ اب تک اردو میں ادب لطیف سے متعلق
کوئی اصول قلم بند نہیں ہوئے تھے مولوی عبدالقادر سروری
ایم اے ایل ایل بی کا اردو دنیا پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب
کی ایک بڑی کمی کو پورا کر کے دنیائے اردو ادب کو رہین منت کیا
ہے اس کتاب میں افسانہ و ناول نگاری کی تاریخ اور اس کے
اصول و مبادیات پر بحث کی گئی ہے افسانہ نگاری کے اصولوں
کی روشنی میں اردو افسانوں اور ناولوں کو بھی جانچا ہے اخیر میں
مصنف نے اردو افسانہ نگاری کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے
اردو افسانہ نگاروں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے ضخامت
۱۸۰ صفحے پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا سید غلام مصطفی
ذہین و علامۃ الدہر مولانا سید مختار احمد۔ ہندوستان کے مشہور
نیچرل شاعر نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی ادبی نصیحت آموز
ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا
گیا ہے جو ہر مرد و عورت اور طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہے ضخامت
۲۰۰ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی خاصی پاکٹ ایڈیشن قیمت عہ

قاموس الاغلاط مصنفہ علامۃ الدہر سید مختار احمد و مولانا
ذہین اس کتاب میں پانچ ہزار کے قریب الفاظ کی تحقیق و تدقیق
ادبی اغلاط کی تصحیح و تنقیح ہے اور ممتاز ادیبوں اور نامی گرامی
شاعروں کے کلام کے حوالوں سے استناد کیا گیا ہے تحقیق ادب
میں یہ پہلی کتاب ہے جو اہل ادب کے لئے مفید و کارآمد علمی تحفہ ہے

زیر طبع
مبادی فلسفہ از مولوی میر حسن الدین بی اے ایل ایل
بی عثمانیہ مولف نے ڈاکٹر اے ایس راپوپورٹ پی ایچ
ڈی کی کتاب پرائمر آف دی فلاسفی کو عام فہم سلیس اور
بامحاورہ اردو میں اس خوبی سے منتقل کیا ہے کہ فلسفہ جیسا

دقیق مضمون بالکل سہل ہو گیا ہے ضخامت ۱۳۶ صفحہ
کاغذ چکنا، لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲/

اسوۂ حسنہ مصنفہ احمد عبداللہ المسدوسی بی اے اس میں
بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی
زندگی پیش کی تھی ہر مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے
پاکٹ ایڈیشن ضخامت ۸۰ صفحہ قیمت ۸/

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم
سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس سلسلہ مشاہیر اسلام و
سرپرستان علوم و فنون میں مسلمان حکمرانوں کے علمی کارناموں
سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ایک محققانہ
دیباچہ ہے جس میں سلاطین اسلام کے علمی کارناموں سے متعلق
مورخین کی غلطیوں کا انکشاف کیا گیا ہے یہ مصنف کے
سالہا سال کے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تدقیق واقعات کا
بے بہا علمی سرمایہ ہے۔ ہر تعلیم یافتہ مسلمان زیر مطالعہ رکھے
تاکہ اس کو اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کی حقیقت منکشف
ہو ضخامت ۴۴۴ صفحے کاغذ چکنا سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ لکھائی
چھپائی خاصی قیمت عہ

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبۂ مولوی
محمد عبدالغفور عابدی اس کتاب میں ایک رفیع الشان
ماجد ل صوفی عالم کے دلچسپ اور مفصل سوانح حیات
ہیں جن کا وجود مبارک آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ
بہادر کے زمانہ میں ظہور پذیر تھا ابتدائے کتاب میں فن
تذکرہ نویسی کی نسبت مولوی مرزا حسینی بیگ شاذلی
کا مقدمہ درج ہے۔ ضخامت ۲۸۴ صفحہ کاغذ چکنا لکھائی
چھپائی بہترین۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۸/

سیرت خیر البشر ناظم الاخلاق مولانا ذہین صاحب کا
طبع زاد منظوم رسالہ ہے جس میں آنحضرت صلعم کے اخلاق
حمیدہ کو عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے یہ
بچوں کے لئے نہایت مفید رسالہ ہے قیمت ۱/

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ پریس باہتمام رام کشن منیجر مطبع

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ام۔ اے۔ ال ال۔ بی

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلشیہ (۰۰۰۰۰)

مجلہ مکتبہ

جلد (۱) بابتہ ماہ شہریور ۱۳۳۷ف م جولائی ۱۹۲۸ء شمارہ (۴)

فہرست

۱ یہ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے جو ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کریگا

۲ یہ علمی وادبی رسالہ ہے جسمیں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے
حجم کم سے کم چار جز و ہوگا۔

۳ بنظر احتیاط پرچہ بذریعۂ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو
ہر فصلی مہینے کی ۲۰ ہر تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عا۲) فی پرچہ ۶ ؍

۵ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی
کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے
۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلّہ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی
عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت
جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی
و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت
حاضر ہوگا یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات
کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دی جائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج
ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ جس وقت حسب صراحت بالا
رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُن کے نام جاری کردیا جائیگا
یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے
استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن ہونی چاہئے۔

شذرات

. . . رائی کا پہلا ہفتہ انجمن ہائے امداد باہمی حیدرآباد دکن (جس کا ایک جز انجمن ہذا بھی ہے) کے سالانہ جشن کا ہفتہ تھا۔ جلسہ ۶؍ جولائی کو ریڈی ودیالیہ بورڈنگ میں مسٹر کالنس صدر ناظم و معتمد صنعت و تجارت و انجمن ہائے امداد باہمی کی صدارت میں منعقد ہوا، اردو، تلنگی، مرہٹی کے افتتاحی ترانے حقیقی امداد باہمی کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہز اکسلنسی مہاراجہ سر صدر اعظم بہادر (جن کو اس خاص تحریک کے ساتھ بڑی گہری دلچسپی ہے اور جس کا اظہار آپ جامعہ عثمانیہ کے جلسہ تقسیم اسناد کے صدارتی خطبہ میں پُر زور الفاظ میں کر چکے ہیں) کی جانب سے مسٹر وینکٹ رامارڈی کوتوال بلدہ نے ادائے تبریک کا فرض ادا کیا۔ اور صدر اعظم بہادر ہی کی طرف سے سو روپیہ کے عطیہ کا اعلان فرمایا۔

اس جلسہ کا اہم جز مسٹر کالنس کا صدارتی خطبہ تھا جو اردو میں ادا کیا گیا اس کے بعد معتمد باب حکومت مولوی سید محمد مہدی صاحب، رائے بہادر سیں وینکٹ ریڈی اور مولوی سید فضل اللہ صاحب مددگار ناظم انجمن ہائے امداد باہمی نے بھی تقریریں کیں۔ آخری تقریر ڈاکٹر سر حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام فینانس کی تھی۔ جس کے بعد جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔

اتفاق سے یہی مہینا حیدرآباد دکن کی ایک تعلیمی تحریک یعنی حیدرآباد دکن کے اساتذہ کی دوسری سالانہ کانفرس کے انعقاد کا بھی تھا ۱۲ اور ۱۳ جولائی کو انٹرمیڈیٹ کالج بلدہ کی وسیع عمارت میں چار مسلسل اجلاس منعقد ہوئے۔ مہاراجہ سر صدر اعظم بہادر نے نمائش کا افتتاح فرمایا یہی کانفرس کا افتتاحی باب تھا۔ صدر نشین جلسہ نواب مہدی یار جنگ بہادر معتمد سیاسیات تھے۔

اس کانفرس کی منجملہ کئی تحریکات کے دو اہم تھیں جناب سید محمد اعظم صاحب صدر انٹرمیڈیٹ کالج بلدہ نے عثمانیہ میٹرک اور اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے امتحانات میں یکسانیت پیدا کرنے اور تفریق کو دور کرنے کی تحریک کی جو منظور کر لی گئی۔ دوسری اہم تحریک مدارس کے اوقات تعلیم میں سرما کے سوا سال کے باقی حصے میں بجائے دس سے چار تک کے نو سے تین بجے تک تبدیلی کرنے کی تھی جو کچھ بحث کے بعد منظور کر لی گئی۔

لالہ سری رام ایم اے رئیس دہلی مولف خمخانہ جاوید نے حال ہی میں اپنی پانچ لاکھ روپیہ کی جائداد بنارس ہندو یونیورسٹی کو دان دی۔ اس سے پہلے آپ نے اپنا گراں قدر کتب خانہ بھی اس یونیورسٹی کے نذر کیا تھا۔ لالہ صاحب کی مثال ہمارے ارباب دولت کے لئے نمونۂ تقلید ہے۔

مسٹر ٹی بجے ٹاسکر منصرم صدر المہام مال حیدر آباد دکن نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کی توسط سے ایک سو پچاس روپیہ اسی مہینے میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کو دئے اردو زبان کی یہ خدمت ایک غیر ہندی کے ہاتھ سے یقیناً وقعت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

دس سال پہلے جس زمانے میں یہاں جامعہ عثمانیہ کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں۔ پونہ میں پروفیسر کاروے کی بلند ہمت، خواتین ہند کے لئے ایک اعلیٰ قومی تعلیمی درسگاہ کی بنیادیں استوار کرنے میں مصروف تھی۔ اسی زمانے میں پروفیسر موصوف کی بہن اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کرکے اپنے ملک کی اس افتادہ صنف کی خدمت گزاری پر اپنے آپ کو تیار کرنے کی غرض سے ولایت گئی ہوئی تھیں جو بجا طور پر گہوارۂ تمدن کہلانے کا فخر رکھتی ہے۔ آج یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہوا کہ اس ادارے سے خوش نصیب خواتین اعلیٰ تعلیم کا طرۂ امتیاز لگا کر نکل رہی ہیں۔

گزشتہ ماہ میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر نواب مسعود جنگ بہادر (سید راس مسعود) ناظم تعلیمات ریاست حیدر آباد دکن نے جو افتتاحی تقریر کی وہ نہ صرف جامعہ خواتین ہند تک محدود ہے بلکہ اس کا مخاطب سارا ہندوستان ہے اس تقریر کا بڑا حصہ اُن "مغرب مرعوب" معترضین کا دنداں شکن جواب ہے جو غیر زبانوں کے بغیر تعلیم کے ادھورے رہنے کے خیال خام میں مبتلا ہیں۔ نواب صاحب نے حیات خانہ داری میں ناخوشگوار تعلقات کی پیدائش کی ذمہ دار وہ ناعاقبت اندیشی تبلائی ہے جو ایک صنف کو دوسرے سے متغائر اصول پر تعلیم دینے میں کوشاں ہے، آپ زور دیتے ہیں کہ ایک مشترک زبان ایک سے زیادہ فرقوں میں لازماً الفت نہیں پیدا کر سکتی۔ آفریقہ اس کی اچھی مثال ہے لیکن ممکن ہے کہ دو مختلف زبانیں ہوں مگر پھر بھی ان کے آپس میں تنازع نہ ہو جیسے بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کی حالت ہے۔ گزشتہ ۱۰۰ سال میں ہندوستان کی مغربی تعلیم نے ایک بھی ایسا نمایاں ہندوستانی نہیں پیدا کیا جیسا کہ ایک سر سید احمد خاں یا ایک راجہ رام موہن رائے پھر ہم کس پر دھوکہ کھائیں۔

آخری حصے میں نواب صاحب نے نہایت موثر پیرایہ میں تلقین کی ہے کہ ہماری ترقی کا انحصار ہمارے اصنام خیالی کی شکست وریخت اور آپس کی یک جہتی پر ہے۔ جو صرف ایک قومی تعلیم کے اصول پر کاربند ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ابر کی زبان سے

(از جناب ابوالافتخار سید عبدالغفار صاحب قمر)

اس نظم میں سید صاحب نے انگریزی کی ایک نظم "کلوڈس" (ابر) کے خیالات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں رازِ حیاتِ عالم ہوں　ہر چیز ہے زندہ دم سے مرے　میں جانِ نباتِ عالم ہوں　سرسبز ہے مجھ سے باغِ جہاں
ہے خلق کی خدمت کام مرا　میں فرض یہ اپنے مرتا ہوں　ہے شاہِ سلیماں نام مرا　ہے دوشِ ہوا پر تخت مرا
دنیا کی سیاحت کرتا ہوں　عالم کے عجائب دیکھتا ہوں　ہر آن سپاٹے بھرتا ہوں　نچلا نہ کبھی میں بیٹھتا ہوں

دامن کا میں سایہ کرتا ہوں　گرمی جو ستاتی ہے اُن کو　میں ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوں　غنچے جو فسردہ ہوتے ہیں
پانی لے کر آتا ہوں　دریاؤں اور تالابوں سے　میں پیاس بجھاتا جاتا ہوں　اِن تشنہ دہاں پھولوں کی بھی
میں پیرِ فلک کی دولت ہوں　زرخیز زمیں کے حاصل وہ　"میں چرخِ بریں کی زینت ہوں　"گلزارِ زمیں کی رونق ہیں

میں نورِ نظر ہوں پانی کا　میں لختِ جگر ہوں مٹی کا　دایہ ہے مری یہ بادِ صبا　آغوشِ فلک ہے گہوارہ
بجلی کی چمک ہنسنا ہے مرا　بارش کی جھڑی رونا ہے مرا　تاریک سماں پہ وہ ہی مرا　یہ گھور گرج غصہ ہے مرا

کہساروں پہ پھیلاتا ہوں　پھر برف روئی کی صورت میں　میں فرش بچھاتا جاتا ہوں　سرسبز فضا پہ اولوں کا
اک ہالہ سا دکھلاتا ہوں　اور گردِ قمر کے بھی اکثر　اک حلقہ باندھتا جاتا ہوں　خورشید کے میں اطراف میں بھی

ہو جاتا ہے ان کا رنگ دگر　جو شعلہ فشاں ہیں کوہ و جبل　خورشید پہ چھا جاتا ہے خطر　جب میرا پھریرا کھلتا ہے
گنگا ہو کہ جمنا یا ہو اٹک　چھا جاتا ہوں ان پر پل کے بیچ　اس ساحل سے اُس ساحل تک　اک چشم زدن کے عرصے میں

پیغامِ وفورِ راحت کے　پہنچاتا ہے سورج ساحل کو　ہر گوشۂ بحرِ زریں سے　جس وقت غروبِ مہرِ فلک
اس وقت ہے میرا شغل عجب　یہ سین دکھائی دیتا ہے　پھر چرخِ زمیں کو خلعتِ شب　اور قرمزی پہنا دیتا ہے

چپ چاپ بسیرا لیتا ہوں　میں اپنے ہوائی گھونسلے پہ
جس طرح کہ قمری انڈوں پر　بیٹھی ہو سمیٹے اپنے پر

اردو شاعری اور جدید عروض

(از جناب محمد سراج الدین صاحب طالب)

"عثمانیہ یونیورسٹی کی بدولت اُردو زبان نے جو پلٹا کھایا ہی اس کی مثال شاید کسی اور جگہ مل سکے۔ آئے دن جو جو الفاظ تراشے جا کر ان کو "اپنا لیا" جا رہا ہی آج میر و میرزا، ناسخ و آتش ہوتے تو بات بات پر ناک بھوں چڑھاتے اور سند پیش کرنے پر مجبور کرتے! اُردو زبان اور اس کی ترقی کا دارومدار اس کی شاعری کی بنیاد پر ہی جہاں اس نے اپنی ترقی کے نئے نئے اسباب نئی روشنی سے ڈھونڈھ کر پیدا کرلئے ہیں وہاں اپنی شاعری کی تعمیر بھی نئی طرز پر کرنے کو ہے، ملک میں اب اس مذاق کے بہت لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو شاعری کو عروض سے اور عروض کو شاعری سے آزاد کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ان سب میں ہمارے محترم کرم فرما جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم جدت پسند شاعر پیش پیش تھے، ان کے مضامین رسالہ اُردو میں نکلے اور ہمارے کرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب سے اس مسئلے میں بڑی گفت و شنید رہی، یافعی صاحب نے اپنے ایک دوست (جناب طالب) سے تبادلۂ خیالات کیا تو انھوں نے اپنے خیالات قلم بند ہی کر ڈالے، مولوی سراج الدین صاحب طالب نے عروض پر ایک رسالہ بھی لکھا ہی جس میں انگریزی اُردو شاعری پر نہایت بسیط مقدمہ ہے ہمارے نئے جدت پسند شاعر جن کے کانوں کو عروض کی دقیانوسی آواز ناگوار ہوتی ہی شاعری کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ کریں گے کہ جس طرح انھوں نے شاعری کو "اپنا لیا" ہی ایسا نہیں بلکہ "قابل و معقول" کرکے عروض کو بھی "اپنا لیں" تو میدان صاف ہو جاتا ہی! مکتبہ

اُردو دانایانِ ہند جہاں اور علوم و فنون میں ترقی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہیں اردو شاعری اور عروض کی ترقی یا بہ الفاظ صحیح اس کے جنم بدلنے کی ضرورت کو بھی محسوس کر رہے ہیں اب تک اس عنوان پر کئی آرا پیش کی گئیں مگر ابھی کوئی رائے پیش رفت نہیں ہوئی اور یہ ادھیڑ بن برابر جاری ہی کہ بہر صورت ایک نئی روشنی کا علم عروض اردو کے لئے تیار کیا جائے جس کی میزانوں میں اردو کے اشعار آسانی کے ساتھ تولے جا سکیں اور نئی طرز پر شاعری کی جائے۔ علم عروض کے عنوان پر سب سے پہلی تحریک مولوی نوازش علی صاحب لمعہ مرحوم (نبیرہ سلطان الشعرا حضرت شہید) نے کی جو حیدر آباد دکن کے رسالہ صحیفہ جلد ۳ نمبر ۲ بابتہ ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی تھی اس کے بعد حال میں ہماری نظر سے (رسالہ اُردو جلد ۴ و ۵ حصہ سیزدہم و چہاردہم و ہفدہم میں) مولوی عظمت اللہ خاں صاحب (مرحوم) اور مولوی عبدالرحمن خاں صاحب کے مضامین گزرے اور ایک مستقل رسالہ گلزار اعظم مولفہ حکیم سید الطاف حسین صاحب فرید آبادی بھی ہمارے دیکھنے میں آیا۔ یہاں ہم ان مضامین سے بحث کرتے ہوئے تبدیل عروض کی واقعیت اور حقیقی اصلاح طلب امور پر روشنی ڈالیں گے پہلے ہم ان وجوہ کو جن سے اردو شاعری اور اس کا عروض اصلاح طلب تصور کئے جاتے ہیں بتا دینا"

ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

ا۔ "سب سے بڑا عیب جو ہماری شاعری کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے وہ ریزہ خیالی ہے مسلسل نظم کا لکھنا ایک ایسی بات ہی جو ہمارے شعرا کے لئے ایک سخت کٹھن کام ہے" (رسالہ اردو جلد ۴ حصہ ۱۳ صفحہ ۸۹)

۲۔ "غزل کی دنیا میں تو تسلسل ایک طرح کا جرم ہے ردیف اور قافیہ کی یکسانیت کے سوا بہ لحاظ معنی ایک شعر کو دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہوتا" (اردو جلد ۴ حصہ ۱۳ صفحہ ۹۰)

۳۔ "اردو شاعری کے مروجہ اوزان اور بحریں مسلسل گوئی کے لئے رکاوٹ ہیں" (اردو جلد ۴ حصہ ۱۳ صفحہ ۹۴)

۴۔ "ہماری عروض عربی عروض ہی اور اس میں سے بھی فارسی میں جو چھٹ چھٹا کر چند بحریں رہ گئی ہیں ان پر ہماری شاعری کے ترنم کا انحصار ہی جس طرح شاعری کے مواد کو محدود کر دیا گیا ہی اسی طرح عروض کی بحریں بھی معین کر دی گئی ہیں گویا ترنم کی ان بحروں کے سوائے اور صورتیں ہی نہیں ہو سکیں اول تو اس عروض پر ایک بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس کی بحریں ہندوستان کی آب ہوا اور اردو کی ہندوستانی آریائی بو باس کے مطابق نہیں۔ ہندی عروض سے جو اردو کے فطری ترنم کے مطابق ہے بری طرح چشم پوشی کی گئی اور جو ایک آدھ چھند اردو میں اختیار بھی کیا گیا تو اس کو عربی عروض کے مطابق ایک سخت سانچے کی صورت دیدی گئی" (اردو جلد ۴ حصہ ۱۳ صفحہ ۹۶)

۵۔ "اردو میں یہ نقص ہی کہ اس میں تجزیہ کے لئے اجزائے اولیہ استعمال نہیں کئے گئے کیونکہ اس میں لگھ کا قائم مقام کوئی جزنہ تھا" (اردو جلد ۵ حصہ ۱۷ صفحہ ۱۰۷)

۶۔ "اردو میں بحور کا انفکاک دوائر کے ذریعہ کیا گیا ہی جو نہایت پیچیدہ ہی" (رسالہ اردو جلد ۵ حصہ ۱۷ صفحہ ۱۱۴)

۷۔ "عروض مروجہ میں" "ارکان ہشت گانہ کی ساخت ایسی بے ڈھنگی تھی کہ ان کے ذریعہ تمام بحور کی تقطیع ہونی ممکن نہ تھی اس لئے مجبوراً دوسرے الفاظ استعمال کرنے پڑے ممکن تھا کہ ان نئے الفاظ کو بھی سالم رکن مان لیا جاتا لیکن جماعت بندی کا خیال مانع ہوا۔ مجبوراً انھوں نے نہایت کاوش و جانکاہی سے ان نئے الفاظ کا رشتہ ارکان ہشتگانہ ہی سے جا ملایا۔ اور تمام بحور کو جن میں باہمی مناسبت یا مشابہت نام کو نہ تھی اور بنیاوٹی تعلقات کی بنا پر اپنی مفروضہ انیس بحروں کی ذریات میں داخل کر لیا" (اردو جلد ۵ حصہ ۱۷ صفحہ ۱۱۴)۔

گلزار عروض صفحہ (۶) سے۔ ۸۔ "ارکان بحر کلام کے اجزاے اولیہ نہیں مرکب در مرکب ہیں"۔

۹۔ "اجزاء اولیہ سے ارکان مجوزہ کے علاوہ اور مرکب بھی بن سکتے ہیں۔ جن سے نسبتاً زیادہ سہولت بھی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً فعول فعلن فی مصرعہ آٹھ بار کی جگہ مفاعلن چار بار کافی ہو جاتا ہے مگر یہ اصل ارکان میں اور اشکال مزاحف میں کوئی رکن نہیں ہی اس لئے غیر مانوس قرار دیکر نا جائز رکھا ہی جو سراسر زبردستی ہی"

۱۰۔ بحر ہزج مثمن مکفوف مقصور میں مفاعیل فی مصرعہ چار بار بحر رجز مطوی میں مفتعلن بحر رمل مجنون میں فعلاتن

بحر متدارک مخبون میں فعلن بکسر عین اور مقطوع میں فعْلن بسکون عین سے بحر منفردہ کی طرح وزن پورا ہو جاتا ہے تاہم ان سب کو اشکال مزاحف میں رکھا ہے ارکان میں نہیں جس کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی"۔

۱۱۔ "تمام مزاحف بحروں کو جن میں عموماً پہلا رکن منفرد و مزدوجہ انیس بحروں میں سے کسی کا نظر آیا ہے اُسی بحر کے تحت میں رکھا ہے حالانکہ لے یا روانی میں وہ متحد مشترک نہیں ہیں اس سے یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ خواہ کیسی ہی کاٹ چھانٹ کرنی پڑی ہے اُسی بحر کے ارکان سے کام نکالا ہے"۔

۱۲۔ "۱۔ بحر ہزج مسدس۔ اخرب مقبوض مسبغ۔ ۲۔ بحر ہزج مسدس۔ اخرم اشتر مقصور۔ ۳۔ بحر ہزج مسدس۔ اخرم مقبوض مقصور۔ ۴۔ بحر ہزج مسدس۔ اخرم اشتر محذوف۔ ۵۔ بحر ہزج مسدس۔ اخرب مقبوض محذوف۔ ان پانچوں بحروں کے ارکان وزن علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن ایک بحر میں ایک مصرعہ اور دوسرا مصرعہ دوسری بحر میں لکھنا جائز و موزوں سمجھا جاتا ہے یہ آزادی شعرا کے لئے جس قدر سہولت پیدا کرتی ہے اُس سے کہیں زیادہ اس علم کے طالبوں کو دقت میں ڈالتی ہے وجہ یہ کہ وزن و روانی کی کوئی کامل اور یقینی معیار نہیں رہتی"۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل اصلاحیں پیش کی گئی ہیں:-

۱۔ "سب سے پہلی اصلاح اب یہ ہونی چاہئے کہ شاعری کو قافیہ کی استبداد سے نجات دلوائی جائے۔........ اب وقت آ گیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے اور اسکی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان مار دی جائے"۔ (رسالہ اردو جلد ۴ حصہ ۱۳ صفحہ ۹۱)

۲۔ "غزل اور غزل کے ساتھ موجودہ شعر و سخن کے اور سانچے اس قابل ہیں کہ ان کو بے دردی کے ساتھ اردو شاعری سے نکال دیا جائے اردو شعرا بھی ہر اپنی نظم کے لئے انگریزی شعرا کی طرح اپنا اپنا سانچہ اپنے خیالات کی ضرورت اور رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے تراشا کریں"۔ (اردو جلد ۴ حصہ ۱۳ صفحہ ۹۳)

۳۔ "اردو عروض کی بنیاد ہندی پنگل پر رکھی جائے"۔

۴۔ "ہندی عروض میں بھی قدامت پسندی اور سانچے معین کر دینے کے رجحان نے ٹھیراؤ پیدا کر دیا ہے اور جس نہج پر پنگل مدون کی گئی ہے وہ نہایت فرسودہ اور غیر سائنٹی فک ہے۔ ہندی عروض کے اصول سائنٹی فک مطالعہ اور تجربہ کے بعد اردو کی نئی عروض کی نیو قرار دئے جائیں۔ عربی عروض کی جو بحریں ان اصول کے مطابق ثابت ہوں وہ رکھی جائیں"۔

۵۔ "انگریزی عروض کے ایسے اصول جو آزادی کی جان ہیں اور اس کی وسعت رکھتے ہیں کہ ہر زبان کے لئے کام دے سکیں ان پر اس نئی عروض کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا جائے"۔

۶۔ "اردو میں یہ نقص ہے کہ اس میں تجزیہ کے لئے اجزا اولیہ استعمال نہیں کئے گئے کیونکہ اس میں گلہ کا قائم مقام کوئی جزنہ تھا ہندی میں یہ کمی ہے کہ اس میں سبب متوسط کے مقابل کوئی تفعیل نہیں ہم نے اپنی کتاب عروض جدید میں

اس کی اصلاح اس طرح کی ہے کہ مرکب اجزا یہ سبب ثقیل و وتد مجموع کو چھوڑ کر ایک جزلگم کا قائم مقام زیادہ کر دیا ہے اس طرح صرف تین اجزائے اولیہ سے تمام بحور کا تجزیہ ہو جاتا ہے"۔ (اردو جلد ۵ حصہ ۱، صفحہ ۱۰۱)

۷۔ "ہمارے نزدیک کسی زبان کے عروض کی تدوین و تکمیل کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ اول ارکان بحور وہ الفاظ ہوں جو کلام کے اجزائے اولیہ کہے جاسکیں۔ پھر بہ قاعدۂ حصر عقلی اُن کی ترکیب و ترتیب سے جس قدر صورتیں پیدا ہوں انہیں سے جن میں صاف طور سے روانی پائی جائے ان کو بحریں قرار دیا جائے لامحالہ یہ وہ تعداد ہو گی جس میں تمام مروجہ بحریں آجائینگی اور آیندہ بھی اس سے زاید کوئی بحر ایجاد نہ ہوسکے گی"۔

ہماری شاعری اور عروض کے اُن نقایص اور ان اصلاحات کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے شاعری سے متعلق دو نقص بیان کئے ہیں۔

۱۔ ہماری شاعری میں ریزہ خیالی ہے مسلسل نظم کا لکھنا ہمارے شعرا کے پاس ایک سخت کٹھن کام ہے۔

۲۔ غزل میں تو تسلسل ایک طرح کا جرم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ خانصاحب نے محض ریزہ خیالی اور غزل گوئی پر جو ہماری شاعری کا انحصار کیا ہے ایسی غلطی ہوئی ہے۔ ہماری شاعری غزل گوئی پر محدود نہیں ہے بلکہ اسکے اصناف بھی ہیں۔ قصیدہ۔ مثلث۔ مخمس۔ مسدس۔ بیت۔ فرد۔ قطعہ۔ مثنوی۔ رُباعی۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ مستزاد۔ یہ سب ہماری نظم و شاعری کی مختلف قسمیں ہیں جنہیں ہمارے شعرا نے دماغ سوزی و جگر کاوی کی ہے ہر شاعر کے کلام میں غزلیات کی البتہ بہتات ہے اس کی بھی وجہ ہے تمام زبانوں میں جس طرح مضمون نویسی کی تعلیم دی جاتی ہے اسی طرح فارسی اور اردو زبانوں میں نظم لکھنے کی بھی تعلیم دیجاتی ہے اور اسکی ابتدا ہوتی ہے غزل گوئی سے مبتدی کو شعر لکھنا سیکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور صنف نہیں ایک شعر لکھا تو گویا ایک پورا مضمون لکھدیا ہر شعر بجائے خود مکمل۔ اور قافیہ کا التزام اس وجہ سے قابل نظر انداز ہے کہ استاد نظم کرنے کے لئے مضامین منتخب نہیں کر دیتا۔ عام اجازت یہ ہوتی ہے کہ قافیہ کے لحاظ سے جو مضمون ذہن میں آئے نظم کیا جائے اس کی کافی مشق کر چکنے کے بعد مبتدی شاعری کے اور اصناف سخن میں قدم دھرنے کے قابل بن جاتا ہے پھر شاعر کا رجحان طبع جس صنف پر ہو اُسی میں وہ کمال بہم پہنچاتا ہے اسی وجہ سے ذوق کے قصیدے۔ مومن کی مثنویاں۔ مصحفی کے قطعے۔ سودا کی ہجویں۔ میر کی غزلیں انیس کے مرثیے مشہور ہیں۔ یہ امر کہ مسلسل نظم کا لکھنا ہمارے شعرا کے لئے ایک سخت کٹھن کام ہے۔ کم صداقت رکھتا ہے۔ مسائل فقہ نظم کئے گئے ہیں۔ علم طب کو نظم کیا گیا ہے قصے کے قصے نظم کر ڈالے گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مسلسل گوئی ہمارے شعرا کے پاس کٹھن نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اکثر شعرا کو ابتدائی مشق میں غزل گوئی سے

لے اردو شاعری کے ابتدائی نظمی نمونے اب تک جتنے دستیاب ہوئے ہیں وہ تقریباً سب کے سب مسلسل کوئی نہ کوئی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ سلسلہ گیارھویں صدی ہجری تک برابر چلا آتا ہے اس کے لئے "دکھنیات" کے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مکتبہ

کچھ ایسی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ کہنہ مشقی کے بعد بھی اس زمین سے ہٹنا انھیں بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ دراصل اگر دیکھا جائے تو یہ مذاق عام کا قصور ہے کہ مسلسل نظمیں اتنی پسند نہیں کیجاتیں اور اتنے شوق سے پڑھی نہیں جاتیں جتنے شوق سے کہ غزلیں دیکھی جاتی ہیں اس امر پہ غور کرنا بھی شاعر کا فرض ہوتا ہے کہ مذاق عام کس صنف سخن پر مائل ہے۔ خلاف مذاق عام اگر شاعر کہا کریں تو اُن کے کلام کی قدر نہ ہو اور کوئی توجہ نہ کرے۔ یہ بالکل قرین عقل ہے کہ مذاق عام جب غزل گوئی سے اُٹھ کر مسلسل گوئی یا بہ الفاظ دیگر داستان گوئی کو پسند کرنے لگے گا تو ہماری اسی پرانی شاعری اور عروض کے تابع شاعروں کو ملاحظہ فرمائینگے کہ مسلسل گوئی پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اب تک چند شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جو اپنی پرانی شاعری اور پُرانے عروض پر اپنا وہ نیا نغمہ سنا گئے جن کے سننے اور سمجھنے والے اب بھی مزے لیتے اور یاد کرتے ہیں۔ یہ خیال کہ غزل گوئی میں تو تسلسل ایک طرح کا جُرم ہے، بالکل صحیح ہے لیکن ہم یہ کہیں گے کہ کسی کا ارادہ اگر مسلسل گوئی کا ہو تو غزل ہی کیوں۔ مثنوی کہئے۔ قطعہ کہئے۔ رباعی کہئے۔ ترکیب بند کہئے۔ مسدس کہئے۔ ایک ایسی صنف میں جو مسلسل گوئی کے لئے موضوع نہیں ہوئی ہے مسلسل گوئی کا ارادہ کیوں کرو اور پھر اُس پر یہ الزام کیوں دھرو کہ اس صنف میں تسلسل تو گویا جرم ہے؎۔ اُردو شاعری کے مروجہ اوزان اور بحریں مسلسل گوئی کے لئے رکاوٹ ہیں یہ ہمارے عروض کے متعلق محض سوء ظن ہے جو نہیں معلوم کس بناء پر پیدا ہو گیا ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ جو شخص فطری شاعر ہو اُس کے لئے کوئی وزن نظم کرنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ وزن کا معیار خواہ کچھ بھی رکھا جائے اس امر کا البتہ علم حاصل کرنا ضروری ہے کہ کلام موزوں کا معیار وزن کیا ہے آیا کلام کا ہر ایک پارہ اُس معیار پر پورا اُترتا ہے یا نہیں یوں تو ہمارے عروض کا ہر وزن اس قابل ہے کہ اس میں بڑی سے بڑی مسلسل نظم لکھی جا سکے لیکن بالعموم حسب ذیل اوزان میں سیکڑوں چھوٹی بڑی مثنویاں اور مسلسل نظمیں ہمارے دیکھنے میں آئی ہیں۔

۱۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔ ۲۔ فعولن فعولن فعولن فعل ۳۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ۴۔ مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن۔ ۵۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن ۶۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ۷۔ مفتعلن مفتعلن فاعلات ۸۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ۹۔ مفعول مفاعلن فعولن ۱۰۔ فعلن فعلن فعول فعلن ۱۱۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

عروض کے جتنے اوزان موجود ہیں اور جتنے اور اوزان کا استخراج اُن سے ممکن ہے وہ سب ہر ممکنہ ترنم پر محتوی

؎ اگر مسلسل گوئی کو اپنے موضوع کے خلاف محض غزل گوئی سے بھی متعلق کر دیا جائے تو اس میں بھی ابتدائی نمونے بہت کچھ مل سکتے ہیں ولی دکھنی کو جو بعض محقق نظم اردو کا موسس اول سمجھتے ہیں اُن کی ایک مسلسل غزل نمونتاً درج کی جاتی ہے:۔

شوخ نکلا جب قدم کو تیز کر　ناز کے شبدیز کو مہمیز کر　یک بیک آیا اوسے مجھ طرف　ہر پلک کو دشنۂ خونریز کر
میں کیا یوں عرض از روئے نیاز　مہربانی اُس کی دستاویز کر　کہہ اپس کی نرگس بیمار کو　عاشقوں کے خون سے پرہیز کر
اے ولی آتا ہے وہ مقصود دل　خانۂ دل خون سے آمیز کر۔　(دیوان ولی مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ص ۵۵، مکتبہ)

ہیں شاعر ہر ایک وزن پر مسلسل نظم لکھ سکتا ہے اگر کوئی کسی وزن کو استعمال نہ کرے تو اُس کا الزام علم پر نہیں دھرا جا سکتا۔ ہمارے عروضی اوزان میں اگر شعر کہنا (خواہ مسلسل ہوں یا غیر مسلسل) پسند نہ ہو تو اس کا کوئی جواب نہیں ورنہ محض اوزان تو اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ مسلسل گوئی یا شعر گوئی میں کسی قسم کی رُکاوٹ پیدا کریں۔

یہ امر ضرور قابلِ تسلیم ہے کہ "ہماری عروض عربی عروض ہے" خاص اردو عروض مدون نہیں کی گئی ہے جن صاحبوں نے اردو میں عروض لکھنے کی کوشش کی ہے وہ صرف اتنا کر گئے ہیں کہ فارسی یا عربی زبان کے قواعد زبان اُردو میں بیان کر دئیے کسی قدر زیادہ تفصیل قدر بلگرامی نے کی ہے لیکن انھوں نے محض اُردو عروض لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کمی کو مان لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ امر بھی مان لیا جائے کہ عربی انگریزی اور ہندی زبانوں کے عروض سے ہٹ کر ایک نیا اعجوبۂ روزگار علم عروض اُردو زبان کے لئے اختراع کیا جائے۔ جیسا کہ اب تک بعض اصحاب نے اس کی بیجا کوشش بھی کی ہے۔

یہ ایک وہمی اعتراض ہے کہ ہمارے عروض کی بحریں ہندوستان کی آب وہوا اور اردو کی ہندوستانی آریائی بو باس کے مطابق نہیں، اس واسطے کہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی چار پانچ سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے اس زبان میں اور انھیں بحور و اوزان میں شاعری ہوتی چلی آ رہی ہے اور وہی لوگ اس میں شاعری نہیں کر رہے ہیں جو ہندوستان میں اتر آئے ہیں بلکہ خاص ہندنژاد بھی اس میں شعر گوئی کرتے ہیں اور وہ کوئی کمزوری ان اوزان میں محسوس نہیں کرتے اب ہم یہ سمجھیں تو کیسے کہ اس کی بحریں ہندوستانی آب وہوا اور آریائی بو باس کے مطابق نہیں اگر آج کے دن ہم اپنے عروض کو ہندوستان میں باہر سے آیا ہوا تصور کریں تو بھی اس کے متعلق یہ سمجھ لینا ممکن نہیں کہ اسکی "بحریں ہندوستان کی آب وہوا اور اُردو کی ہندوستانی اور آریائی بو باس کے مطابق نہیں" اس واسطے کہ کسی شخص کو بارہ سال کی مسلسل بود و باش سے حقوق وطنیت قانوناً حاصل ہو جاتے ہیں تو ہمارے عروض کو تو قرن تو کجا کئی صدیاں گزر گئیں اس کے بعد بھی کیا اس کو ہندوستان میں حقوق وطنیت حاصل نہیں ہوئے۔ ہمارا عروض زبان اُردو کے ساتھ جزو لاینفک ہو گیا ہے البتہ یہ بلحاظ ارتقاء زمانہ اس کو اس طرح مدون کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے وہ مشکلات رفع ہو جائیں جو عوام کو اس کے حاصل کرنے میں عاید ہوتی ہیں۔

"ہندی عروض سے جو اُردو کے فطری ترنم کے مطابق ہے بُری طرح چشم پوشی کی گئی" میں اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں اول تو یہ کہ اردو کو جس کی ترکیب و وجود میں غالب حصہ فارسی عربی کا ہے محض ہندی عروض عطا کرنا بے انصافی ہے اور دوسرے یہ کہ کسی زبان کی شاعری اُسی ترنم میں ہوا کرتی ہے جو اُس کا اصلی اور فطری ہو یہ مُسلم ہے کہ اردو شاعری عربی عروض کے اوزان پر ہوتی آئی ہے اور اب تک بھی بکثرت انھیں اوزان میں ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ زبان اردو کا فطری ترنم عروض عربی کے اوزان میں ہے ولو بالفرض اگر نہ بھی ہو تو ایک عرصہ مدید کی

کی مداومت و مزاولت سے عربی عروض اُردو کا عروض ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ہندی عروض سے چشم پوشی مطلق تو نہیں کی گئی اس واسطے کہ اکثر شعرا کے ایسے کلام ہماری نظر سے گزرے ہیں اور اور اصحاب بھی سنے ہونگے جن کی زبان اردو ہے لیکن وزن و ترنم ہندی ہے ایسا مذاق طبیعت رکھنے والوں کے لئے اب بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

"اردو میں یہ نقص ہے کہ اس میں تجزیہ کے لئے اجزائے اولیہ استعمال نہیں کئے گئے کیونکہ اس میں لگھ کا قائم مقام کوئی جز نہ تھا" اس میں یہ امر صحیح ہے کہ ہمارے عروض میں لگھ کا قائم مقام کوئی علیحدہ جز نہیں لیکن یہ امر غلط ہے کہ اس میں تجزیہ کے لئے اجزائے اولیہ استعمال نہیں کئے گئے۔ لگھ کا قائم مقام کوئی علیحدہ جز ہمارے عروض میں اس لئے نہیں رکھا گیا کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کوئی مثال ایسی نہیں پیش کی جا سکے گی جس میں محض ایک حرف کا تجزیہ کیا جائے اور دوسری صورت غیر ممکن ہو (یہاں تجزیہ سے ہماری غرض تجزیہ بغرض تقطیع شعر ہے کیونکہ عروض میں غرض اسی سے ہوتی ہے) علم عروض میں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محض ایک حرف کسی شمار میں نہیں تاوقتیکہ وہ کسی اور حرف سے مل نہ جائے ہمارے عروضیین نے حرف مجرد کو اس لئے شمار میں نہیں لیا ہے کہ اوزان شعر میں کبھی کوئی حرف تقطیع میں اکیلا نہیں آتا حرف متحرک لگھ یا تو کسی حرف متحرک کے ساتھ ہوگا یا کسی ساکن کے پہلے یا بعد یہ دونوں تینوں صورتیں اجزا وتد مجموع و مفروق میں آجاتی ہیں چنانچہ مَفَا اور فَاعِ ان دونوں کے علاوہ تیسری صورت سبب ثقیل ہے جیسے مُتَ ان تینوں اشکال کے ہوتے کوئی اور شکل ایسی نہیں مل سکتی جس میں ایک حرف متحرک کے بالکل الگ تجزیہ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ انگریزی میں بھی الفاظ کی تقسیم تجزیہ کی غرض سے جو کی گئی ہے اس میں بھی حرف مفرد کو کوئی درجہ نہیں دیا گیا ہے:-

TROCHE,[1] IAMBUS,[2] AMPHIBRACH,[3] DIABRACH,[4] HEMI-SPONDEE,[5]

SPONDEE[6] PYRRHIC, DACTYL, ANAPÆST,

ان میں سے کوئی ایک حرف متحرک کا قائم مقام سلیبل نہیں، ہندی میں ایک حرف کو شمار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ متحرک الآخر ہوتے ہیں اسی سبب سے ان کو بعض اوقات ایسے حرف آخر کو الگ شمار کرنا پڑتا ہے۔ عربی میں چونکہ قاعدہ اشباع موجود ہے وہ حرکت کو اشباع کر کے حرف متحرک کو سبب خفیف بنا لیتے ہیں۔ انگریزی میں بعض جگہ حرف مفرد کو خارج از اجزائے تقطیع کر دیتے ہیں اور بعض جگہ دوسرے لفظ کے ساتھ مدغم کر دیتے ہیں اسلئے انگریزی میں حرف مفرد متحرک الگ شمار نہیں ہوتا انھیں اجزائے اولیہ کی بحث میں صاحب گلزار عروض پر اعتراض کر کے مولوی عبدالرحمن خاں صاحب[1] نے یہ کہتے ہوئے غلطی کی ہے کہ "اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کوئی لفظ ایسا نہ سوچ سکے جو لگھ کا قائم مقام ہوتا حالانکہ عربی فارسی اور اردو

---

[1] رسالہ اردو جلد پنجم نمبر ۱۸ صفحہ ۴ پر مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے زبان اردو میں تین قسم کے اجزاء اولیہ (حرف۔ سبب خفیف۔ سبب متوسط) بتلاتے ہیں اس سے پیشتر بحر کو آواز کی ایک مسلسل زنجیر فرض کرتے ہیں اور حرف کو اس کی کڑی اور اس زنجیر کی ہر کڑی کو جزو اول قرار دیتے ہیں، جزو کو کڑی اور کڑی کو حرف ماننے میں غلطی یہ ہوگی کہ سبب خفیف اور سبب متوسط پر بھی (جنکو پہلے اجزائے اولیہ تسلیم کر لیا ہے) حرف کا اطلاق ہوگا جو خلاف مقصد ہے

" تینوں زبانوں میں واو عطف ایک ایسا لفظ ہی جو ایک حرف سے بنا ہے اور نہ، کہ، چہ، وغیرہ بہت سے ایسے الفاظ اردو و فارسی میں موجود ہیں جن میں ہائے مختفی محض اظہار حرکت کے لئے آتی ہی اور وہ بخوبی لگھ کا قائم مقام ہو سکتے ہیں۔"

یہ مسلم ہے کہ محض ایک حرف لفظ نہیں۔ واو عطف پر لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا اسی طرح نہ۔ کہ۔ چہ وغیرہ بھی الفاظ نہیں کہے جاتے بلکہ یہ سب حروف ہیں چنانچہ واو عطف کو حرف عطف نہ کو حرف نفی کہ کو حرف بیانیہ یا حرف صلہ یا حرف استفہام (جیسی صورت ہو) کہتے ہیں تقطیع اشعار میں یہ حرف بالکل الگ کبھی نہیں آتے شعر میں جب کبھی آتے ہیں تو اپنے قبل یا بعد کے الفاظ یا ان کے اجزا کے ساتھ پیوست ہو کر تقطیع میں اپنے ہم وزن رکن کے حرف متحرک یا ساکن کے مقابل آتے ہیں جہاں ان کو الگ شمار میں لانے کی ضرورت نہیں رہتی مثلاً تم نہ آئے اس کا تجزیہ یہ ہوگا۔ تم = فا۔ نہ = ع۔ آ = لا۔ ئے = تن پس تم نہ آئے تقطیع میں فاعلاتن کے مساوی ہے اور نہ کا قائم مقام تقطیع میں علا کا عین متحرک ہے۔ اس کے خلاف اگر نہ حرف نفی کو مقدم کرکے تجزیہ کیا جائے تو بھی ایک حرف الگ نہیں ہوگا چنانچہ نہ آئے تم کا تجزیہ ہوگا۔ نہ آ۔ مفا۔ ئے = عی۔ تم = لن پس نہ آئے تم تقطیع میں مفاعیلن کے مساوی ہوا اور نہ کا قائم مقام حرف مفا کا میم ہوا۔ ایک حرف متحرک کو البتہ اس وقت بالکل الگ شمار کرنا چاہئے جبکہ تقطیع محض ان تین اجزا سے فَ۔ فعْ۔ فَعَ کیجا یا کرے۔ اور اوسطے کہ ان اجزا سے کوئی رکن نہیں بنتا یہ اجزا بجائے خود ارکان ہیں ایسی صورت میں تم نہ آئے، یا نہ آئے تم، کا تجزیہ فعْ فَ فَعَ فعْ یا فَ فعْ فَعَ فعْ سے ہو سکتا ہے رہا یہ امر کہ تقطیع کرنا اس کی تقطیع فاعلاتن اور مفاعیلن سے کرنا ٹھیک ہی یا فع ف فع فع اور ف فع فع فع سے تو اسکے متعلق ہم اپنے مضمون کے اس حصہ میں بحث کریں گے جس میں اصطلاحات عروض پر نظر ڈالی جائے گی۔

یہ اعتراض کہ ہمارے عروض میں "تجزیہ کے لئے اجزائے اولیہ استعمال نہیں کئے گئے" اس لئے صحیح نہیں کہ ہمارے پاس علانیہ طور پر اجزاء اولیہ موجود ہیں جن سے ارکان بنتے ہیں مبتدی کو ارکان معلوم کرانے سے پیشتر ہی یہ اجزا سبب وتد فاصلہ کے ناموں سے بتا دئے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہی کہ ان اجزا کی مختلف ترکیبوں سے کون کون ارکان بنتے ہیں اگر یہاں تجزیہ سے تقطیع مراد ہو اور غرض یہ ہو کہ انھیں اجزائے اولیہ سے تقطیع کیوں نہیں کی جانی چاہیے تو ہم اصطلاحات عروض سے بحث کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالیں گے جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا۔

صاحب گلزار عروض کا خیال ہی کہ " ارکان بحر کلام کے اجزائے اولیہ نہیں مرکب در مرکب ہیں" اہل عروض نے حسب ذیل چار ابتدائی اجزا قرار دئے ہیں (۱) سبب خفیف (۲) سبب ثقیل (۳) وتد مجموع (۴) وتد مفروق۔ ان چاروں اجزائے اولیہ کی ترکیب و ترتیب سے جتنی شکلیں ممکن تھیں پیدا کرکے ان پر ارکان کو قائم کیا۔ جب کئی ارکان اس طرح حاصل ہوئے تو انھوں نے مختلف اوزان اشعار پر سے اس امر پر غور کی کہ کونسا رکن کس رکن سے قریبی تعلق رکھتا ہی اس طرح ایک رکن کو دوسرے میں داخل کرکے معدودے چند ارکان جو باقی رہے ان کو اصول عروض

قرار دیا۔ اگر انھیں اجزاء اولیہ سے تقطیع کا کام لیا جائے تو یقین ہے کہ علم بہت پھیل جائے گا۔ اس واسطے کہ اجزائے اولیہ کو ترتیب دیکر ارکان بنا لینے سے کئی کئی اجزا سمٹ کر ایک رکن کے تحت آجاتے ہیں جس سے قواعد ترتیب کے ذہن نشین کرنے میں سہولت ہوتی ہے چنانچہ بحر رجز سالم کا وزن لیجئے۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن اس کو اس کے اجزائے اولیہ میں پھیلا دیجئے تو سبب خفیف۔ سبب خفیف۔ وتد مجموع۔ سبب خفیف سبب خفیف۔ وتد مجموع۔ سبب خفیف۔ سبب خفیف وتد مجموع۔ سبب خفیف۔ سبب خفیف۔ وتد مجموع کل بارہ اجزا ہوئے۔ اس کی ترتیب کو یاد رکھنے کے لئے یہ سبق یاد کرنا پڑا کہ پہلا دوسرا چوتھا پانچواں۔ ساتواں۔ آٹھواں۔ دسواں۔ گیارھواں جزو اس بحر میں سبب خفیف آئیگا اور تیسرا۔ چھٹا۔ نواں۔ بارھواں وتد مجموع۔ اس ترتیب کو جانچنے کے لئے اگر سبب خفیف کے عوض فع اور وتد مجموع کے لئے فعل رکھیں۔ جیسا کہ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے کیا ہے اور رٹیں :۔

فع فع فعل۔ فع فع فعل۔ فع فع فعل۔ فع فع فعل یا "گل" سبب خفیف کے لئے اور "صبا" وتد مجموع کے لئے لیں جیسا کہ صاحب گلزار عروض نے کیا ہے اور دھرائیں تو :۔ گل گل صبا۔ گل گل صبا۔ گل گل صبا۔ گل گل صبا یا سبب خفیف کے لئے مل اور وتد مجموع کے لئے مرکب نہ اور مل کا یعنے "نہ مل" لیں۔ جیسا کہ صاحب عروض نے کیا ہے اور دھرائیں :۔

مل مل نہ مل۔ مل مل نہ مل۔ مل مل نہ مل۔ مل مل نہ مل۔ تو یقیناً وہ آسانی نہ ہوگی جو ایک مستفعلن کے چار بار دھرانے میں تھی۔ اس واسطے کہ ترتیب قواعد میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہا کرتا ہے کہ دھرانے کے الفاظ اس قابل ہونے چاہئیں کہ اُن کی ترتیب و تکرار مضحکہ نہ ہو اور مرکب ہونے کے بعد اس پر ضابطہ کا اطلاق ہو سکے اس وجہ سے بےجا اختراعین مناسبِ علم نہیں معلوم ہوتیں ان مخترعہ الفاظ کی ترتیب سے جو ارکان بنائے جاتے ہیں اُن کے عوض اگر ہماری عروض ہی کے ارکان رکھے جائیں تو کوئی برائی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ پس سہولت اسی میں زیادہ ہے کہ وزن کا معیار اجزائے اولیہ کے عوض ایسے الفاظ پر رکھا جائے جن میں کئی کئی اجزائے اولیہ یکجا ہوں اور وہ خود اس قابل ہوں کہ اُن پر ضابطہ کا اطلاق ہو سکے۔

صاحب گلزار عروض فرماتے ہیں " اجزائے اولیہ سے ارکان مجوزہ کے علاوہ اور مرکب بھی بن سکتے ہیں جن سے نسبتاً زیادہ سہولت بھی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً فعول فعلن فی مصرعہ آٹھ بار کی جگہ مفاعلاتن چار بار کافی ہے یہ اصل ارکان میں اور اشکال مزاحف میں کوئی رکن نہیں ہے اس لئے غیر مانوس قرار دیکر ناجائز رکھا ہے جو سراسر زبردستی ہے" یہ اعتراض دور و بیسا ہے اس واسطے کہ جو رکن کہ تجویز کیا گیا ہے اس کے عوض اگر دوسرا رکن رکھا جاتا تو پھر بھی یہ اعتراض ہو سکتا کہ اس کے عوض اور مرکب رکھا جا سکتا تھا جیسا کہ مفاعلاتن کو ایک رکن فرض کر لیا جائے تو یہ

اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس کے عوض مفاعلن فع یا فعول فعلن کے ارکان لائے جاسکتے تھے اس مرکب رکن کو کیوں رکھا گیا۔ عروض میں یہ امر جب بتا دیا گیا ہے کہ مفاعلن رکن اصلی نہیں اور مفاعلن کو مفاعلاتن بناتے نہیں تو پھر کوئی ذی فہم عروضی یہ غلطی نہیں کرسکے گا کہ فعول فعلن چار بار والی بحر کی تقطیع مفاعلاتن چار بار سے کرے۔ یوں اگر اس میں مغالطہ کا اندیشہ بھی ہے تو یہ ممکن ہے کہ یہ قرار دیا جائے کہ اس وزن کی تقطیع یوں بھی درست اور اس صورت میں اس بحر کا نام ہزج مثمن مقبوض مرفل ہوگا۔ یہ تو اس طریقہ سے زیادہ مستحسن ہے جو مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے بتایا ہے جس میں ایک جزئی دو اجزائی اور سہ اجزائی سب قسم کی تقطیع درست قرار دی گئی ہے ان میں سے ہر ایک کی صحت کو جانچنے کے لئے دو دو تین تین ضابطے یا اوزان یاد رکھنے پڑتے ہیں۔" اردو میں بحور کا انفکاک دوائر کے ذریعے کیا گیا ہے جو نہایت پیچیدہ ہے"۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ بیان کرنے میں وسعت نظر سے کام نہیں لیا گیا کیونکہ استخراج بحور کا تعلق دوائر سے نہیں ہے عروض میں دوائر جو بتلائے جاتے ہیں اُس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی ایک بحر کے وزن کو یاد رکھ لینے سے متعدد بحور کے اصلی سالم اوزان یاد رہ جائیں اور اس غرض کے لئے اس سے بہتر طریقہ ہو بھی نہیں سکتا یہ جو تصور کیا جا رہا ہے کہ انفکاک بحور محض دوائر کے علم سے ہی ممکن ہے صحیح نہیں ہے صرف فعولن اور مفاعیلن دو ارکان یاد رکھ لیجئے اور ان کو بہ طریق دائرہ دہرائیے تو آپ کو پانچ بحور کے پانچ اوزان حاصل ہوتے ہیں اور دو ارکان سے ملکر بننے والی بحروں میں سے کسی ایک کا وزن یاد رکھئے اور دائرے کے دور میں لائیے تو اس ایک وزن سے آپ کو نو بحور کے اوزان حاصل ہوتے ہیں جس طریقہ سے یہ سب اوزان حاصل ہوسکتے ہیں اس کو ایک مختصر سے دائرہ کی شکل میں بتایا جاتا ہے بس یہی ہے اس دائرہ کی حقیقت جس کو نہایت پیچیدہ تصور کیا گیا ہے ان دوائر کو اگر خارج بھی کر دیا جائے تو اصل عروض میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

عروض مروجہ کے" ارکان ہشتگانہ کی ساخت ایسی بے ڈھنگی تھی کہ اُن کے ذریعہ تمام بحور کی تقطیع ہوتی ممکن نہ تھی اس لئے مجبوراً دوسرے الفاظ استعمال کرنے پڑے ممکن تھا کہ ان نئے الفاظ کو بھی سالم رکن مان لیا جاتا لیکن جماعت بندی کا خیال مانع ہوا مجبوراً انھوں نے نہایت کاوش و جانکاہی سے ان نئے الفاظ کا رشتہ ارکان ہشتگانہ ہی سے جا ملایا اور تمام بحور کو جن میں باہمی مناسبت یا مشابہت نام کو نہ تھی مصنوعی اور بناوٹی تعلقات کی بنا پر اپنی مفروضہ انیس بحروں کی ذریات میں داخل کر لیا" اس کے جواب سے پیشتر یہ معلوم کرنا چاہئے کہ علم عروض اشعار پر سے مدون کیا گیا ہے ایک قصیدہ کے اشعار مطلع سے لیکر مقطع تک پڑھے گئے تو اُن کو معلوم ہوا کہ بسم اللہ سے والسّلام تک اس کا ترنم ایک ہی ہے لیکن بعض جگہ حرکات و سکون کا توافق قائم نہیں ہے اس توافق و عدم توافق کو معلوم کرنے کے لئے انھوں نے چند الفاظ اجزائے اولیہ سے مرکب کئے اور انکو

قصیدے کے ہر مصرع کے الفاظ کے مقابل رکھا اخیر شعر تک یہ عمل کرنے سے معلوم ہوا کہ چند ارکان ایسے ہیں جو شروع سے آخر تک بجنسہٖ آتے ہیں اور بعض مقامات پر وہ ارکان نہیں آتے بلکہ اور کوئی متغائر حرکت و سکون کے الفاظ ہیں ان الفاظ پر اور اُن کے تغیر پر غور کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ کس رکن سے ان متغیر ارکان کو قریبی تعلق ہے پس جس رکن سے ان کا تعلق پایا گیا یہ مان لیا گیا کہ اُس رکن کی مزاحف صورتیں ہیں یہ ممکن تھا کہ وہی متغیر شکل کسی اور رکن سے بھی حاصل ہوجاتی لیکن نظم کے ترنم پر غور کرکے یہ معلوم کر لیا گیا کہ اس ترنم میں وہ رکن نہیں آئیگا لہذا یہ شکل اس رکن سے متخرج نہیں مانی جاتی مثال کے طور پر اسکو یوں سمجھئے کہ ایک وزن "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" ہے اس وزن میں ایک جگہ تیسرا رکن مفاعلن آتا ہے اور ایک موقع پر یہی تیسرا رکن فعولن آتا ہے اور ایک جگہ یہی تیسرا رکن مفاعیل آتا ہے ان ارکان کے آنے سے وزن کے ترنم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی پس ایسی صورت میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ فعولن اصلی ہے یا مفاعلن مستفعلن سے بنایا ہوا رکن ہے۔

کیونکہ ہمیں یہ بتایا جاچکا ہے کہ بحر ہزج مسدس کا وزن۔ "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" ہے اس میں کوئی اور رکن نہیں آتا۔ "ارکان ہشتگانہ کی ساخت،" اصول کے بالکل مطابق ہے اور وہ ارکان بھی جو انکی صور مزاحفہ میں شمار کئے جاتے ہیں بالکل ایک ہی اصول کے تحت ہیں۔ اگر ارکان کو ایک اصول کے تحت اس طرح ترتیب نہ دیا جاتا تو اوزان کی ہزارہا شکلیں گنتی کے ان چند ارکان اور معدودے چند بحور میں داخل نہ ہو سکتیں۔

اپنے پرانے عروض کے علم پر ہم اس امر کا زعم کر سکتے ہیں کہ دنیا بھر کے اوزان کی تقطیع ہم اپنے علم عروض کی رو سے کر سکتے ہیں۔ ہمارے عروض کی عمدگی یہی ہے کہ اس میں معدودے چند بحور رکھی گئی ہیں اور انھیں چند بحور کے اوزان پر ہم ہزارہا اوزان دریافت کر سکتے ہیں اور بھر طرہ یہ کہ وہ اوزان ان چند بحور کے اوزان سے خارج بھی نہیں ہو سکتے اس بات کی البتہ سخت ضرورت ہے کہ ہمارے عروض کے ساتھ عقیدہ درست ہوجائے۔

"بحر ہزج مثمن مکفوف مقصور میں مفاعیل فی مصرعہ چار بار، بحر رجز مطوی میں مفتعلن، بحر رمل مخبون میں فعلاتن بحر متدارک مخبون میں فعلن بکسر عین اور مقطوع میں فعلن بسکون عین سے بحور منفردہ کی طرح وزن پورا ہوجاتا ہے تاہم ان سب کو اشکال مزاحف میں رکھا ہے ارکان میں"۔ ظاہر میں تو اس سے یہی منشا معلوم ہوتا ہے کہ مفاعیل مفتعلن فعلاتن فعلن اور فعلن جو ارکان مزاحف سمجھے جاتے ہیں ان کو بھی اصل ارکان سالم میں کیوں شمار نہیں کیا جاتا ان کو اگر سالم ارکان میں شمار کیا جاتا تو یہ لازم ہوتا کہ ان سے جو بحریں منفرد بنتیں ان کے متعلق یہ بتایا جائے کہ یہ بحر فلاں فلاں ارکان سے بھی حاصل ہو سکتی ہے ان دونوں صورتوں میں اوزان اپنے اپنے مرکز پر قائم نہیں رہ سکتے اور ان میں نہ وہ اختصار او معقولیت ہوتی جو اب ہے۔

"تمام مزاحف بحروں کو جن میں عموماً پہلا رکن منفرد و مزدوجہ انیس بحروں میں سے کسی کا نظر آیا ہے اُسی

بحر کے تحت رکھا ہی حالانکہ لے یا روانی ہیں وہ متحد و مشترک نہیں ہیں اس سے یہ خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ خواہ کسی ہی کانٹ چھانٹ کرنی پڑی ہے اُسی بحر کے ارکان سے کام نکالا ہے " یہ خیال اصلیت نہیں رکھتا اگر شعر کے پہلے رکن پر بحر کا نام رکھا جاتا تو بحور مزاحفہ کے نام نہاد میں بڑی مشکلیں پڑ جاتیں چنانچہ رباعی کا ایک وزن مفعولن فاعلن مفاعیلن فع لیجئے اس کا پہلا رکن ارکان سالم میں سے نہیں ہے اور مفعولن رکن مزاحف مفاعیلن سے بھی حاصل ہوسکتا ہے اور مستفعلن سے بھی اور مفعولات سے بھی اور فاعلاتن سے بھی اور اگر اس کو مستفعلن کا مقطوع تصور کیا جائے تو اس کو مفصلۂ ذیل بحور میں سے کسی ایک میں شامل کرنے میں حجت پڑتی اس واسطے کہ ان سب بحور کا رکن صدر مستفعلن آتا ہے۔

(۱) رجز (۲) سریع (۳) منسرح (۴) مجتث؟

اور اگر اس کو مفعولات کا مکشوف تصور کیا جاتا تو اس کے بحر مقتضب میں ہونے کا گمان ہوتا اور اگر اس کو فاعلاتن کا مشعث سمجھا جاتا تو اس کو بحر رمل میں شمار کیا جاتا۔ ہر زحاف کی تعریف کے ساتھ اس امر کا علم بھی عروض میں ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کا عمل آیا ارکان صدر و ابتدا کیلئے مخصوص ہے یا عروض و ضرب میں یا ہر مقام پر درست ہے۔ اس سے واقف ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ صدر کے رکن مفعولن کو مفاعیلن کے اخرم ہونے کے علاوہ اور کسی رکن کی صورت مزاحف قرار دیں اس کے بعد بھی اگر مفعولن کو مفاعیلن کا اخرم تصور کر کے پہلے رکن پر نام بحر کا لحاظ رکھا جائے تو اس وزن کو علاوہ ہزج کے بحر مضارع میں بھی شمار کیا جا سکے گا۔ ان سب امور سے قطع نظر کر کے رباعی کے اس وزن کو بحر ہزج کا وزن کیوں مانا جاتا ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ اس کا ترنم ہزج کے ترنم و نغمے سے متخرج ہے اسی بنا پر یہ دریافت کرنا پڑا کہ بحر ہزج میں مفاعیلن کس تغیر سے مفعولن بن سکتا ہے۔

ہزج مدس کے چند مختلف اوزان میں امتزاج کرنا جو جائز قرار دیا گیا ہے اس کے متعلق یہ اعتراض ہے کہ یہ آزادی شعرا کے لئے جس قدر سہولت پیدا کرتی ہے اس سے کئی حصہ اس علم کے طالبوں کو دقت میں ڈالتی ہے وجہ یہ کہ وزن اور روانی کی کوئی کامل اور یقینی معیار نہیں رہتی"۔ جہاں شعرا کو اوزان کے متعلق آزادی نہیں ہی وہاں یہ اعتراض ہے کہ شاعر مقید و پابند ہے اور جہاں آزادی ہے وہاں یہ اعتراض ہے بہر حال کسی پہلو چین نہیں اس طرح کا اعتراض رباعی کے مختلف اوزان کے امتزاج پر بھی کیا جا سکتا ہے یہ اعتراض اُن اشخاص کو نہایت معلوم ہوگا جنکو عروضیت سے واقفیت نہیں یا اشعار اور اُن کے اوزان کا فطری مذاق نہ ہو اس علم پر عبور حاصل ہونے کے بعد یہ اعتراض کوئی اہمیت اور وزن نہیں رکھتا۔ (باقی)

حجاز کے فرنگی سیّاح

حاجی عمر عرف لیون راچیز

(۲)

(از جناب الحاج سید علی شبیر صاحب مشیر دار الانتظامی ہائیکورٹ سرکار عالی حیدرآباد دکن)

سنہ ۱۸۴۱ء میں جنرل ویلس کی بجائے الجزائر میں فرانسیسی مقبوضات کا گورنر جنرل بوگاؤ مقرر ہوا تھا اس کے آنے کے بعد سے راچیز کی نسبت مخالفت کے خیالات دب گئے تھے چنانچہ اس نے راچز کی تجویز پسند کر کے روپیے سے دل کھول کر اس کی مدد کی اور اس کے باپ کو محکمہ صفائی کی کسی خدمت پر مامور کر دیا۔ راچز نے اپنی خدمت ترجمانی کی ماہوار اپنے باپ کے قرضہ میں باندھ دی اور خفیہ طور پر اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہوا وہ طنجینی کے ایک نمایندہ کے ساتھ جس کا نام مقدم تھا قیروان[1] روانہ ہوا اور طنجینی کی جانب سے وہاں کے مشہور دار العلوم مدرسہ سیدی عقبہ[2] کے علما کے نام سفارشی خطوط لے گیا ادھر تو ان خطوں سے مطلب نکلا ادھر اس کا روپیہ کام کر رہا تھا جس کی بدولت بعض علمار کا خیال اگرچہ پوری طرح نہ بدلا تاہم روپیے کی مار نے ان کا لہجہ معتدل کر دیا۔ غرضکہ قیروان کے علما نے فتویٰ دیدیا جس کے آخری فقرے یہ تھے :-

"کسی ملک کے مسلمانوں کو حملہ آور کفار کے ساتھ اُس وقت تک جنگ برابر جاری رکھنی چاہیئے جب تک اُن کو اپنے ملک سے کافروں کو نکالدینے کی قوی امید ہو اور جب یہ یقین

---

[1] قیروان شمالی آفریقہ کا مکہ مشہور ہے مسلمانوں کی بڑی زیارت گاہ ہے اس کی بنیاد عقبہ بن نافع صحابی نے ڈالی تھی۔ قیروان کے متعلق بہت سے معجزات مشہور ہیں۔ افریقہ والوں کا عقیدہ ہے کہ قیروان کی سات مرتبہ زیارت ایک حج کا ثواب رکھتی ہے۔ شہر میں (۲۳) مسجدیں (۹۰) زاوئے یعنے فقیروں کے تکئے (۳) بڑے تالاب اور حمام وغیرہ ہیں۔ مسجدوں میں سیدی عقبہ کی مسجد نہایت عظیم الشان خوشنما ہے اس کی موجودہ تعمیر و ترمیم اغلبی خاندان کے حکمران زیادۃ اللہ نے سنہ ۸۲۱ء میں کرائی تھی اسی مسجد میں ایک بڑا مدرسہ ہے جو مدرسہ سیدی عقبہ کہلاتا ہے قیروان میں حضرت عبد القادر جیلانی کا زاویہ بھی بہت مشہور ہے یہاں کی آبادی (۲۲) ہزار ہے جو سب مسلمان عرب ہیں اور ان پر صرف تین سو فرانسیسی حکومت کرتے ہیں۔

[2] عقبہ بن نافع صحابی کا نام افریقہ میں سیدی عقبہ مشہور ہے یہ اُس چھوٹی سی فوج کے سپہ سالار تھے جو امیر معاویہ کے حکم سے افریقہ روانہ ہوئی تھی اور جس نے مصر سے تنجیر تک فتح کر لیا تھا۔ سیدی عقبہ کے نام سے الجزائر میں ایک گاؤں بھی موسوم ہے جو ضلع زیبان کا مذہبی پایہ تخت سمجھا جاتا ہے اس گاؤں میں سب سے زیادہ قابل دید چیز سیدی عقبہ کی مسجد ہے جو آفریقہ بھر میں سب سے زیادہ قدیم خیال کیجاتی ہے اور جو سنہ ہجری کی تعمیر کردہ ہے اسی مسجد میں ایک طرف سیدی عقبہ کا مزار ہے جو بڑی زیارتگاہ ہے

ہو جائے کہ مسلسل لڑائی سے مسلمانوں کے لئے بجز بربادی و تباہی و اتلاف جان کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہے تو وہ اس شرط کے ساتھ کفار کی عملداری میں سکونت رکھ سکتے ہیں کہ ان کو مذہبی آزادی کامل طور سے حاصل رہے گی اور ان کی عزت و ناموس کا پورا پورا لحاظ کیا جائے گا تاہم مسلمان ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا تو وہ کفار کی حکومت کا جوا اپنے کندھے سے اتار کر پھینکدیں گے۔"

راچز کو یہ بھی امید دلائی گئی تھی کہ اگر ممالک اسلامی کے بڑے بڑے مدرسوں کے علمانے اس فتوی کی تائید کی تو اس کا اثر دس گنا بڑھ جائے گا چنانچہ قیروان سے وہ مالٹا[1] روانہ ہوا اور یہاں سے مسٹر فرینل فرانسیسی کونسل جدہ کے نام کسی سے تعارفی خط حاصل کر کے قاہرہ پہنچا۔ کونسل موصوف کی شریف مکہ سے بڑی دوستی تھی۔ قاہرہ میں راچز نے یہ فتوی جامع ازہر[2] کے علما کے سامنے پیش کیا اور ایک دن چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس پر بحث ہوتی رہی بہت سی کتابیں دیکھی گئیں بڑی رد و قدح ہوئی مگر جمعیت علماء کے دو ممبروں نے سب کارروائی الٹ دی اور راچز کو یہ مشورہ دیا کہ زمانۂ حج میں مکہ معظمہ میں مدینہ و بغداد و دمشق کے بڑے بڑے علما اکھٹے ہونگے اس فتوی پر ان کی مہریں لینی چاہئیں۔ اس وقت راچز کے روپیے نے شیخ تونسی کے برادر نسبتی سید الحاج حسن بن ابراہیم کو جو پہلے بھی حج کر آیا تھا۔ کہیں مفتی بھی رہ چکا تھا اور اب پھر حج کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ گانٹھا۔ یہ شخص اپنی بیوی اور چار لونڈی غلاموں کے ساتھ مکے جا رہا تھا اس کے نصف اخراجات راچز کے ذمے لگائے گئے۔

---

[1] جزیرۂ مالٹا بحر روم میں اٹلی سے ملحق انگریزوں کا مشہور بندرگاہ ہے جہاں بحر روم کا انگریزی بیڑا رہتا ہے۔ اس جزیرہ پر رومیوں یونانیوں اور عربوں کی حکومت رہ چکی ہے۔ یہاں کی زبان بگڑی ہوئی عربی ہے رقبہ (۱۱۹) مربع میل اور آبادی کوئی دو ڈھائی لاکھ ہے۔ موقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے انگریزوں کی نو ہزار فوج یہاں رہتی ہے۔

[2] قاہرہ کی مشہور جامع مسجد ازہر کی بنیاد خلیفۃ المعز لدین اللہ فاطمی خلیفہ مصر کے سپہ سالار ابو الحسن جوہر بن عبد اللہ کاتب الرومی نے جو سسلی کا رہنے والا تھا اور بڑا فیاض تھا ۳۵۹ھ ہجری میں ڈالی تھی ۳۶۱ھ میں یہ بنکر تیار ہوئی اس کے بعد ہر زمانہ میں سلاطین مصر نے اس مسجد اور یہاں کے طلبہ کے لئے جائدادیں وقف کیں۔ دنیا بھر میں یہ سب سے زیادہ قدیم یونیورسٹی ہے اور یہ وہی جامع مسجد ہے جو قاہرہ میں سب سے پہلے تعمیر ہوئی زمانہ قدیم میں بھی یہاں تمام اسلامی ممالک سے طلبہ بغرض تعلیم آیا کرتے تھے اس زمانہ میں جامع ازہر کے مصارف چار پانچ لاکھ روپیہ سالانہ ہیں اور مختلف ممالک کے دس بارہ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ مولوی شبلی مرحوم نے یہاں کے مدرسین کی تعداد تین چالیس لکھی ہے مگر کپتان برٹن جس نے ۱۸۵۳ء میں مصر کی سیر کی وہ اساتذہ کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ لکھتا ہے اور کہتا ہے جس شخص کو مدرسی کی سند حاصل کرنی ہوتی ہے وہ چند روز تک ازہر میں اعزازی طور سے تعلیم دیتا ہے ہر ملک کے طالب علموں کے لئے ازہر میں جدا جدا رواق بنے ہوئے ہیں جنہیں وہ بطور بورڈ کے رہتے ہیں ہر ملک والوں کا اس میں ایک ایک کتب خانہ بھی علیحدہ ہے طلبہ کو مسجد کی طرف سے روٹیاں تقسیم ہوتی ہیں تعلیم چند سال قبل تک وہی پرانے طریق کی تھی اب کچھ اصلاح ہو گئی ہے۔ ۱۲

حسن بن ابراہیم چاہتا تھا کہ مدینے ہوتا ہوا حج سے پہلے مکے پہنچ جائے اس لئے مصری قافلہ کے ساتھ روانہ ہونے کے بجائے اس نے ایک شخص سے نو سو ساٹھ روپیے میں ینبوع تک پہنچانے کے لئے بارہ اونٹ کرایہ کئے۔

بتاریخ ۲ نومبر ۱۸۴۱ء راچیز طنجینی کے نمائندے مقدم کے ساتھ مع حسن اس کی بیوی و ملازمین کے حج کو روانہ ہوا راچیز اور اس کے دین فروش ہمراہیوں نے اس فتوی کے حاصل کرنے کی غرض یہ ظاہر کی تھی کہ تاریخی حیثیت سے ایک بڑی اہم چیز ہوگی اور اگر کوئی مسلمان غازی کفار کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو اس کی ہمت افزائی اور مجاہدین میں جوش پھیلانے کا یہ ایک زبردست ذریعہ ہوگا۔ اور اس کے بھروسہ پر جہاد کے شائق مسلمان ہمیشہ اس امید میں رہا کریں گے کہ ؎

شہر خالی است ز عشاق مگر کز طرفے　　　مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

راچیز کے ساتھی زر پرست مسلمانوں کا تو کیا ذکر ہے افسوس ان ناعاقبت اندیش علما پر ہے جنہوں نے یہ نہ سوچا کہ جو مسلمان عبد القادر کے جھنڈے تلے اسلام کے نام پر جانیں قربان کر رہے ہیں انکی کمر توڑنے کے لئے یہ فتوے ایک کاری ضرب ہوگی اور ان مسلمانوں کی جو غیر مسلموں کی زیر حکومت زندگی بسر کرتے ہیں یہ فتوے اس خیال سے ہمت پست کرتا ہے گا کہ مذہبی و رسمی آزادی تو ہم کو حاصل ہی ہے اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالتے ہو ؎

جو کچھ کہ ہے سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت　　　تقدیر کا شکوہ ہے نہ قسمت کا گلہ ہے

ینبوع پہنچکر راچیز نے ایک دوسرے ٹھیکہ دار سے مدینہ و مکہ جانے کے لئے (۷۰۰) روپئے میں معاملہ کیا۔ جب دور سے مدینہ نظر آنے لگا[1] تو اس نے بھی اپنے ہمراہیوں کی طرح صلوٰۃ و سلام پڑھنا شروع کیا اور اسی حالت سے مسجد نبوی میں داخل ہوا۔ راچیز نے مسجد کی آرایش کی بہت تعریف کی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ "مدینہ کے زائرین میں جوش کم ہوتا ہے"۔ راچیز کے اس بیان کو ہم بالکل غلط بھی نہیں کہہ سکتے ہر شخص اپنے اوپر یا اپنے ساتھیوں پر کسی بات کا قیاس کرتا ہے۔ راچیز کے ساتھی وہ اسلام کے بدنام کرنے والے تھے جو روپئے کے

---

[1] مدینہ منورہ سے ڈیڑھ دو کوس کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جسے بیر علی کہتے ہیں یہاں ایک کنواں۔ کچھ کھیت اور کھجور کے درختوں کا جھنڈ ہے یہاں سے روضۂ مقدس نظر آنے لگتا ہے اس جگہ اکثر حجاج پیدل ہو جاتے ہیں بعض انتہائے شوق سے حالت وجد میں اونٹوں پر سے کود پڑتے ہیں اس فقیر نے اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان "حاجیوں کا داخلہ مدینے میں" ہے اس واقعہ کو اس طرح عرض کیا ہے ؎ قافلے والو اٹھو وقت سحر ہونے لگا۔ اب ہوائے باغ یثرب کا اثر ہونے لگا۔
اب یہ وقت آیا کہ اونٹوں پر سوار رہنا حرام ؎ حاجیو اترو کہ روضہ جلوہ گر ہونے لگا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس فقیر نے مدینے جاتے آتے وقت اس مقام کی زیارت کی ہے اس وقت یہاں خربوزے تربوزوں کے کھیت تھے۔ ہر سہ ہادی موٹر کے پاس پانی اور تربوز بیچنے لائے تھے

لالچ میں مسلمانوں کو ہمیشہ کے واسطے قید فرنگ میں گرفتار کرانے کے لئے تیار تھے اور ایک عیسائی کو اسکی حسب خواہش فتوے دلانے کے واسطے گھر سے نکلے تھے جوش و خروش دکھانا تو کہاں اگر انھیں غیرت ہوتی تو رسول اللہ کو یہ اپنی صورت بھی نہ دکھاتے مدینے کے زایروں کا اگر کسی شخص کو جوش دیکھنا ہو تو کسی مسلمان حاجی کا سفرنامہ دیکھیے یا کم سے کم برٹن کا سفرنامہ ہی ملاحظہ فرمائیے جس میں وہ لکھتا ہے۔

"جب مدینہ نظر آنے لگا تو میرے تمام ساتھیوں نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ صلوٰۃ و سلام اور دعائیں پڑھنا شروع کیں اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ انتہائی جذبہ و جوش مذہبی کی حالت میں عربوں کی زبان پر تخیلات و تصورات کا کیسا زبردست رنگ چڑھ جاتا ہے یہ ناممکن تھا کہ میرے ساتھیوں کے جوش و خروش کا اثر مجھ پر نہ پڑتا۔ اور یقین مانو فی الحقیقت کئی منٹ تک میرا بھی جوش مسرت اسی درجے تک پہنچ گیا تھا جتنا کہ اُن کا"

راچیز تین دن مدینہ منورہ میں قیام کرنے کے بعد مکّے روانہ ہوا اور ۲۲ دسمبر ۱۸۷۵ء کو احرام باندھے بیت اللہ میں داخل ہو گیا اس نے مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے مشرقی جانب ایک مکان بارہ روپیہ روز پر کرایہ سے لے لیا تھا اور اس کی دوسری منزل پر مقیم تھا اس مکان کی کھڑکیوں میں سے بیت اللہ سامنے دکھائی دیتا تھا۔ یہاں کے رات کے منظر کے متعلق وہ کہتا ہے۔

"اگر سینکڑوں مردوں۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں اور قہقہے اور آوازیں جو دالانوں میں جمع ہو کر جوا کھیل رہے تھے مارج نہ ہوتیں تو چراغوں کی روشنی میں رات کے وقت حاجیوں کا طواف اور انکی دعائیں دل پر بہت گہرا اثر کرتیں بہت سی عورتیں دالانوں میں کھانا پکا رہی تھیں۔ روٹی اور کھجوریں اور قہوہ فروخت ہوتا تھا حجام وہیں حجامتیں بناتے تھے۔"

راچیز کے مذکورۂ بالا بیان کی تائید کسی مسلمان کے سفرنامے سے نہیں ہوتی البتہ برکھارٹ نے بھی ۱۸۱۴ء میں یہی کیفیت لکھی ہے اور اس پر راچیز نے دو باتوں کا اور اضافہ کر دیا ہے ایک جوا کھیلنا دوسرے دالانوں میں کھانا پکانا برکھارٹ کہتا ہے "پکانے کی یہاں اجازت نہیں ہے" راچیز کے حالات میں اس موقعہ پر رالی صاحب مولف کتاب کرسچنیز ایٹ مکہ (مکہ میں پیروانِ مسیح) تحریر کرتے ہیں کہ "یہ یاد رکھنا چاہیے کہ برکھارٹ نے مدینہ کی مسجد کی نسبت بھی یہی رائے دی ہے" افسوس ہے کہ رالی صاحب دوسروں کو یاد رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں مگر خود بھول گئے۔ برکھارٹ نے بیت اللہ ہی کی نسبت یہ رائے دی ہے کہ وہاں کھیل کود ہوتا

وغیرہ وغیرہ مسجد نبوی کے متعلق اس نے ہرگز یہ نہیں کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد نبوی میں مسلمان انتہا درجے کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں اور جیسا کہ آنحضرت کے روبرو حالت حیات میں کوئی شخص اونچا بلند آواز سے گفتگو نہیں کرتا تھا اسی طرح اس وقت بھی وہاں نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ زائرین صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں کوئی دنیوی گفت گو یا کھیل کود وہاں ہرگز نہیں ہونے پاتا۔ مسلمانوں کا عام عقیدہ آنحضرت کی جناب میں یہ ہے کہ

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں جب یہ گنہگار حج کے لئے گیا تھا تو اس نے بیت اللہ یا بیت الرسول میں کوئی بات لہو و لعب کے قسم سے نہیں دیکھی۔ بیت اللہ کے ذکر میں مسلمانوں کی بدنظمی کی نسبت راچیز لکھتا ہے۔

"مسیحی مقامات مقدسہ کے تمول و شان کا مقابلہ ان مقامات سے کرنے میں جو اسلامی دنیا میں مقدس ترین سمجھے جاتے ہیں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کے انتظامات کی ہر شاخ میں بھی گڑبڑ نظر آتی ہے اس میں شک نہیں کہ ان کا مذہب بھی ویسا ہی مستحکم ہے جیسا کہ عیسائیوں کا لیکن یہ مذہب بغیر عمل کے ہے۔"

مسلمانوں کی بدانتظامی کی نسبت راچیز کی رائے ایک حد تک درست ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مسلمان انتظام و بندوبست کر کے اپنی مسجدوں کو دنیوی مجالس اور دفاتر سے مشابہ نہیں بناتے ان کے ہاں وہ حالت دیکھنے میں نہیں آتی کہ ولایت زرا انگریز لیڈیاں تو گرجے کے وسط میں کرسیوں پر جلوہ افروز ہیں اور دیسی عیسائی عورتیں گیلری میں زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھی ہیں یہ انتظام خاص عیسائی اقوام کا حصہ ہے۔ اب رہی یہ بات کہ مذہب اسلام میں عمل نہیں ہے۔ راچیز کا یہ ریمارک تعصب پر مبنی ہے۔ مذہب پر عمل نہ کرنے والے ہر مذہب میں موجود ہیں مگر دین اسلام کی تعلیم ایسی نہیں ہے جس پر عمل نہ ہو سکے۔ یہ موقع نہیں ہے ورنہ مذہب اسلام و دین عیسوی کی تعلیم کا اچھی طرح مقابلہ کر کے یہ فقیر ثابت کرتا کہ موجودہ انجیل سے یہ ظاہر ہے کہ اول تو بانی مذہب مسیحی خود اپنے قول پر عامل نہیں دوسرے عیسوی تعلیم بھی ناقابل عمل ہے تاہم لگے ہاتھوں دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ انجیل شریف میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے بیان کیا گیا ہے "یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے آیا ہوں میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان و زمین نہ ٹل جائیں توریت کا ایک نقطہ ایک شوشہ ہرگز نہ ٹلے گا۔" (انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷-۱۸) اس کے بعد فرماتے ہیں "تم سن چکے ہو (یعنی توریت میں) کہ کہا گیا ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اگر کوئی تیری قبا لے کر تا بھی اُسے لینے دے۔ (متی باب ۵ آیت ۳۸

ابھی تو یہ ارشاد ہوا تھا کہ توریت کا ایک نقطہ نہ ٹلے گا ابھی پورا حکم منسوخ کر دیا۔ جب استاد خود اپنے قول پر عمل نہیں کرتا تو اُس کے شاگردوں سے عمل کی کیا اُمید ہو سکتی ہے ؟

۲۔ تمام توریت احکام توحید سے بھری پڑی ہے انجیل میں بھی وارد ہوا ہے کہ "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُس اکیلے کی بندگی کر (متی باب ۴ آیت ۱۱)

عیسائی غور کریں کہ اس آیت پر وہ کیا عمل کر رہے ہیں کیا اکیلے خدا کی یہی تعریف ہے کہ وہ باپ بیٹا اور روح القدس تین اجسام یا تین ارواح مل کر ایک خدا ہوتا ہے۔

۳۔ ابوالانبیاء یعنی حضرت ابراہیم سے خدا کا سب سے بڑا عہد ختنہ کے متعلق تھا جیسا کہ توریت کی کتاب پیدائش میں ہے چنانچہ تمام نبی اس عہد کو پورا کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عیسٰی کے بھی پیدا ہونے کے آٹھویں دن ختنہ ہوئے (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۲۱) مگر عیسائیوں کو خدا کا یہ معاہدہ پورا کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی کہنے کو یہ دعوےٰ ہے "توریت کا ایک نقطہ نہ ٹلے گا" اسی کا نام عمل ہے۔

۴۔ توریت شریف اور دوسرے صحیفے قربانی کے احکام سے بھرے پڑے ہیں اور بلا مبالغہ اگر اُن تمام احکام کو جو توریت میں قربانی کے متعلق وارد ہیں ایک جگہ جمع کر لیں تو پچاس ساٹھ صفحے کی اچھی خاصی کتاب بن جائے مگر عیسائیوں کو اب قربانی کی ضرورت نہیں رہی۔

اُستاد یہ فرما رہا ہے "میں تم سے سچ کہتا ہوں جب تک آسمان و زمین نہ ٹل جائیں توریت کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ ہرگز نہ ٹلے گا۔" مگر شاگردوں نے صفحے کے صفحے ٹال دئے۔ حضرت عیسیٰ نے سچ فرمایا تھا "چرواہا مارا جائیگا اور بھیڑیں تتر بتر ہو جائیں گی" بعد صلیب حضرت مسیح واقعی عیسائی بالکل بھٹک گئے۔

۵۔ انجیل شریف میں وارد ہے "اپنے پڑوسی کو اپنے برابر پیار کر اس سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں ہے"

(انجیل مرقس باب ۱۲ آیت ۳۲)

ایک دوسری جگہ یہ بھی ارشاد ہوتا ہے "اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا آپ کو" (انجیل متی باب ۱۹ آیت ۱۹) پڑوسی کے ساتھ محبت کرنے کا اندازہ یورپ کی جنگ عظیم پر کر لیجئے۔ دول یورپ نے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ امن پسند باشندوں، مقدس پادریوں، مظلوم بیواؤں اور معصوم یتیموں کی تواضع بم کے گولوں سے کی گئی۔

راچیز صاحب کے ہم خیال اشخاص کو انجیل شریف کی ایک آیت یاد دلا کر ہم اس ناگوار بحث کو ختم کرتے ہیں۔

"تو اُس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے پر اُس شہتیر پر جو تیری آنکھ میں ہے نظر نہیں کرتا" (انجیل متی باب ۷ آیت ۴)

راچیز نے داخلی کعبہ کی فیس پر بھی بہت سختی سے ریمارک کیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ کعبہ کا دروازہ ایام

حج میں روزانہ صبح و شام کھول دیتے ہیں اور فی کس ڈھائی روپیہ لے کر داخل کرتے ہیں۔ بعض تاریخوں میں مفت بھی داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ عورتوں مردوں کے لئے علیحدہ علیحدہ تاریخیں مقرر ہیں لیکن اس عام داخلے میں سخت کوشش و ہجوم ہوتا ہے اور بعض لوگوں کے کچل کر مر جانے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے فیس داخلی ادا کر کے اکثر حاجی داخل کعبہ ہوتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اس حرکت پر بہت سے مسلمانوں کو بہت سخت اعتراض ہے اور اسی وجہ سے بہت سے محتاط حاجی رشوت دیکر کعبہ میں داخل ہونا پسند بھی نہیں کرتے کہ اس سے غریب حاجیوں پر ایک قسم کا ظلم ہوتا ہے اور خدام کعبہ کو رشوت لینے کا اور چسکہ پڑتا ہے۔ کعبے کے اندر داخل ہو کر صرف دو رکعت نماز نفل ادا کرنی پڑتی ہے بعض حاجی ہر کونے میں دو دو رکعت نماز پڑھتے ہیں حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ کعبے کے متصل نصف دائرہ کی شکل کی جو ایک دیوار ہے جس کو حطیم کہتے ہیں اس کے قریب نماز پڑھنے کا ثواب بھی مثل داخلی کعبہ کے ہے اس لئے بہت سے حاجی اس چپقلش سے بچنے کے لئے حطیم میں ہی نماز پڑھ لیتے ہیں سنہ ۱۳۴۵ ہجری میں جب یہ گنہگار حج سے مشرف ہوا تھا اس وقت جلالت الملک سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے حصول فیس داخلی کا طریقہ اخلاقاً قریب قریب موقوف کر دیا تھا تاہم چپقلش و ہجوم نہ ہونے کے متعلق ابھی بعض امور اصلاح طلب ہیں جن کی نسبت یقین ہے کہ حکومت نجد جلد توجہ کرے گی۔

راچیز نے آب زمزم کی قیمت پر بھی اعتراض کیا ہے حقیقت میں مکے والوں کی اس قسم کی حرکتیں اعتراض کے قابل ہیں وہابیوں کے پہلے حملے یعنی سنہ ۱۸۰۲ء سے قبل چاہ زمزم شریف مکہ کی ملکیت تھا اس کے پانی کا ٹھیکہ دیدیا جاتا تھا اور ٹھیکہ دار بڑی بڑی قیمتوں پر پانی فروخت کرتا تھا امیر نجد سعود نے مکے میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ یہ ناجائز تجارت موقوف کر دی جائے چنانچہ برکھارٹ نے سنہ ۱۸۱۴ء میں جب سفر حجاز کیا ہے تو اس وقت آب زمزم مفت ملتا تھا اس کے بعد حجاز سے وہابیوں کا قبضہ اٹھ گیا اور ترکوں کا تسلط ہوا اور رفتہ رفتہ شریفی حکومت واپس آ گئی تو پھر وہی تجارت شروع ہو گئی اب ہمارے زمانہ میں مکہ معظمہ پھر اہل نجد کے قبضہ میں آ گیا ہے اور سنہ ۱۳۴۵ھ میں اس فقیر نے دیکھا کہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے اپنے جد اعلیٰ سعود کی پیروی کی ہے اور آب زمزم کا ٹکس اٹھا دیا ہے لیکن زمزم سے پانی کا کھینچنا حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے بڑا مشکل کام ہے ہر وقت اس کنوئیں پر سقوں اور دوسرے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے جو ڈول سے پانی کھینچکر قیمت سے بیچتے ہیں۔ مکے میں راچیز کو پندرہ دن گزر گئے تھے اس نے مسٹر فریل کا خط شریف[۱] مکہ کے نام جو اس وقت طائف[۲] میں تھا

---

[۱] اس زمانہ میں شریف مکہ محمد بن عون تھا جو سنہ ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۵۶ھ تک شریف مکہ رہا۔ اگرچہ اس وقت حجاز پر عبدالحمید خاں سلطان ٹرکی کی برائے نام حکومت تھی مگر اصل اقتدار خدیو محمد علی پاشا والی مصر کو حاصل تھا۔

[۲] طائف مکہ معظمہ سے کوئی تین کوس ہے حجاز میں اس سے بڑھ کر شاداب و زرخیز کوئی مقام نہیں۔ یہ نہایت سرسبز خطہ ہے میوہ جات کے درخت بکثرت ہیں مکے کے شریف اور اکثر آسودہ آدمی گرمی کے دنوں میں وہاں چلے جاتے ہیں اور موسم

بھیجدیا تھا اور جواب کا منتظر تھا آخر ۱۸ جنوری ۱۸۶۲ء کو شریف کا جواب آیا اور راچینر معہ اپنے دوست مقدم کے شریف سے ملنے کے لیے طائف گیا شریف نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی راچینر نے اپنے تئیں سچا اور بڑا واقف کار مسلمان ظاہر کرنے کے لئے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا :-

"ایک زمانہ وہ تھا جب بڑے بڑے امرا و سلاطین حج کے لئے آیا کرتے تھے بغداد کا آخری خلیفہ[1] ایک لاکھ تیرہ ہزار اونٹ لے کر حج کو آیا تھا اب یہ حالت ہے کہ صرف شام و مصر و یمن کے تین قافلے آئے ہیں اور کل چالیس پچاس ہزار حاجی ہونگے"

شریف نے افسوس کے ساتھ اسلام کے ضعف کا اقرار کیا اور کہا کہ مسلمانوں کی عیش پسندی و حرص نے وہابیوں کو ان پر مسلط کیا تھا جن کے مقابلہ کے لئے ترکوں کو بلایا گیا وہ اور بھی ظالم ثابت ہوئے[2]۔

طائف میں اب مدینہ و بغداد و دمشق کے علما جمع ہو چکے تھے اور فتویٰ کا سوال درمیان میں آیا صرف ایک مولوی نے اس قسم کا فتویٰ دینے سے مخالفت کی مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے دوسروں نے اُسے دبا لیا اور بالآخر فتویٰ پر مہریں اور دستخط کر کے مقدم کے حوالے کیا اس کے بعد راچینر مکے واپس ہو گیا۔

اس وقت یہاں ہزارہا حاجی احرام میں نظر آرہے تھے انکی روانگی عرفات[3] کی نسبت راچینر کہتا ہے۔

"حاجی بہ آواز بلند آیات قرآنی[4] پڑھتے ہوئے عرفات روانہ ہوئے ہزارہا خیموں کا نصب ہونا جا بجا آگ کا روشن نظر آنا۔ خوشی کے گیت۔ قہوے والے کی کرخت آوازیں۔ بیس ہزار اونٹوں کا ڈکرانا۔ گھوڑوں کا ہنہنانا۔ گدھوں کا رنگنا ایک عجیب تماشہ تھا"

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) گرما طائف کے باغوں میں بسر کر کے واپس آتے ہیں یہاں کے انار و انگور بہت اچھے ہوتے ہیں اور طائف کا چمڑا اور نعلین قدیم سے مشہور ہیں ملا جامی فرماتے ہیں۔ ادیم طائفی نعلین پا کن ؛ شراک از رشتۂ جانہاے ما کن۔

[1] تاریخ عقد ثمین میں لکھا ہے کہ آخری خلیفہ عباسیہ بغداد مستعصم باللہ کی ماں نے جب ۶۳۱ھ میں حج کیا تھا تو اُس کے قافلہ میں ایک لاکھ بیس ہزار اونٹ تھے راچینر نے اسی روایت کو کانٹ چھانٹ کر بیان کیا ہے

[2] شریف صاحب مسلمانوں کے ضعف کے مقر ہیں مگر جس طریقہ سے انھوں نے ایک فرانسیسی مکار کی مدد کی ہے اس سے اُنکی قوت ایمانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے اسکی صراحت ہم آئندہ کریں گے۔

[3] عرفات مکہ معظمہ سے جانب مشرق نو کوس ہے یہاں ایک بہت بڑا میدان ہے جسکے اطراف پہاڑ ہیں انھیں کی دو چوٹیوں کو جبل عرفات اور کوہ رحمت کہتے ہیں۔ قیام عرفات حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ نویں ذی حجہ کو تمام حاجی یہاں جمع ہوتے ہیں کوہ رحمت کے نزدیک ایک مسجد ہے جسے مسجد ابراہیمی کہتے ہیں یہاں ممبر کے پاس کھڑا ہو کر امام خطبہ پڑھتا ہے جو تین بجے شروع ہو کر بعد مغرب ختم ہوتا ہے اسکے بعد ہر شخص حاجی کے لقب سے پکارا جانے لگتا ہے۔ میدان عرفات میں دوپہر سے شام تک حاجی توبہ و استغفار اور دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ قہوہ وغیرہ بکتا ہے مگر حاجیوں میں ایسا نالائق و ناخدا ترس کوئی دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا جو عرفات میں جا کھیلے یہ راچینر کی من گھڑت ہے۔

[4] اس موقع پر آیات قرآنی نہیں پڑھی جاتیں بلکہ تلبیہ یعنے حاضری پڑھی جاتی ہے جسکے الفاظ یہ ہیں لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمت لک والملک لاشریک لک لبیک مطلب یہ ہے کہ میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی

۱۴ر جنوری ۱۸۶۲ء یوم عرفات کو یکایک راچیز کی مڈبھیڑ الجزائر کے دو عربوں سے ہوگئی جن کو ترجمانی کے زمانہ میں یہ ایک سال کی سزائے قید دلانے کا باعث ہوا تھا ان کو دیکھ کر یہ سناٹے میں آگیا۔ اس نے ابھی تک باقاعدہ طور پر ترک مذہب عیسوی و قبول اسلام نہیں کیا تھا اس لئے اس کو کھٹکا ہوا کہ اب یہ لوگ مخبری کرکے اسکو کہیں گرفتار نہ کرادیں عرفات پر خطبہ کا وقت آیا خطیب کے پیچھے شریف مکہ ایک اونٹ پر بیٹھا تھا اس کے چاروں طرف حبشی حلقہ باندھے کھڑے تھے اور سنہری روپہلی جھالر کا ایک بنر چتر اس کے سر پر لئے ہوئے تھے۔ حاجیوں کی بڑی تعداد حالت وجد میں کھڑی تھی بہت سے رو رہے تھے بہت سے غمگین تھے بہت سے اپنے گناہوں پر پشیمان تھے مگر بے ہودہ لوگوں کی بھی کمی نہ تھی بعض حقہ پی رہے تھے بعض بقول راچیز جوا کھیل رہے تھے۔ بعض قہوہ خانوں میں جھگڑ رہے تھے قہوہ فروش حاجیوں کے بیچ میں قہوہ بیچتے پھر رہے تھے خطبہ ختم ہونے کو تھا اندیشہ ہوتا جارہا تھا کہ راچیز کا خطرہ سامنے آگیا۔ یکایک غل مچا عیسائی عیسائی عیسائی پکڑو۔ نجس ابن نجس۔ آخر ایک خوفناک غل غپاڑے کے درمیان چھ طاقتور حبشی لوگوں کو چیرتے پھاڑتے آئے اور کافر کو پکڑ لیا انھوں نے اپنے شہ زور بازوؤں کے بیچ میں اس کو ایک بچے کی طرح اٹھا کر اور اس کا منہ بند کرکے ایک اونٹ پر کس دیا اور بہت جلد مجمع سے اس کو نکال کر لیگئے راچیز سمجھا کہ اب اس کی قضا آگئی اور اب کوئی دم میں یہ تلوار کے گھاٹ اتارا جائے گا۔ مگر درحقیقت ان حبشیوں نے اس کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا ان کو شریف مکہ نے بھیجا تھا جو بظاہر اس کو گرفتار کرکے اور حقیقت میں ان مسلمانوں کے ہاتھ سے جو غصے کے مارے دیوانے ہوگئے تھے اس کو بچا کر لے گئے۔ انھوں نے راچیز کو اونٹ کی پیٹھ پر کس دیا تھا اور اس کے منہ پر کپڑا ڈال دیا تھا جس سے اس کا دم گھٹا جارہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک اونٹوں کو بے تحاشا دوڑانے کے بعد وہ ٹھہرے۔ اب راچیز نماز پڑھ کر مرنے کے لئے تیار ہونا چاہتا تھا مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ حقیقت میں اس کے دوست ہیں اور انھوں نے اس کی جان بچادی تو قریب تھا کہ خوشی کے مارے اس کو شادی مرگ ہوجائے۔ قصہ کوتاہ اس کو اونٹ سے اتارا اس کی رسیاں کھولیں اور ایک جھونپڑی میں لیجاکر اسے کچھ کھانے پینے کو دیا اور اس سے وہ کہانی بیان کی جس کی بنا پر یہ گرفتار کیا گیا تھا۔ راچیز کا جس بات پر ماتھا ٹھنکا تھا آخر وہی پیش آئی یعنے الجزائر کے دو شخصوں نے قاضی مکہ کو اس کی موجودگی کی اطلاع دی۔ قاضی نے شریف مکہ سے ذکر کیا۔ شریف نے بڑی چالاکی کی۔ ظاہر میں تو اس سے اظہار نفرت کیا لیکن چپکے سے اپنے

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) شریک نہیں میں حاضر ہوں فی الحقیقت تعریف و نعمت و ملک سب تیرے ہی لئے سزاوار ہے تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔ یہ حاضری احرام باندھنے کے بعد مسلسل زمانہ حج میں حاجی پڑھتے رہتے ہیں بالخصوص قافلہ کی روانگی و قیام کے وقت جب ایک قافلہ دوسرے قافلے سے ملے۔ بلندی پر چڑھتے اور نشیب میں اترتے وقت مکہ سے عرفات کو جاتے ہوئے خطبہ عرفات کا ہر فقرہ ختم ہونے پر۔ جس جوش و خروش سے لبیک کہا جاتا ہے اس کا اندازہ بغیر دیکھے اور سنے ہوئے ناممکن ہے۔

اپنے حبشی غلاموں سے یہ کہہ دیا کہ ہوشیاری کے ساتھ اس کو یہاں سے نکال لیجاؤ یہ حبشی عرفات میں مجمع کثیر ہونے کی وجہ سے کئی گھنٹے تک اس کو ڈھونڈھتے پھرے لیکن شام کے وقت جب عیسائی عیسائی کی آوازیں بلند ہوئیں تو وہ عین موقعہ پر اس کے پاس جا پہنچے اور اس کی جان بچا دی۔ باوجودیکہ شریف مکہ خود اس کی حفاظت پر آمادہ تھا پھر بھی اس کو خوف تھا کہ عام حاجی کہیں اس کی گردن نہ اڑا دیں اس لئے اس نے ان حبشیوں کو حکم دیدیا تھا کہ راچیز فوراً اس ملک سے بھاگ جائے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت تیز اونٹ لئے اور صرف سات گھنٹوں میں اس کو عرفات سے جدے پہنچا دیا[1]۔ اور اسی شام کو وہ جہاز میں بیٹھ کر قصیر[2] روانہ ہوگیا۔

راچیز کا سفر حجاز تو یہیں ختم ہو جاتا ہے مگر اس کے نتائج جو مسلمانوں کے لئے خاص طور پر موجب عبرت ہیں انکے بیان کرنے سے قبل شریف مکہ کی نسبت اظہار بدظنی مناسب معلوم ہوتا ہے اس فقیر کا نفس سرکش ہمیشہ اشراف مکہ کی جانب سے بدگمان رہا ہے اس لئے بطور سوءظن اگر یہ عرض کیا جائے تو غالباً بے محل نہ ہوگا کہ راچیز جس کے روپیئے نے بڑے بڑے کرشمے دکھائے تھے قیروان کے علماء کو توڑ ڈالا تھا۔ ازہر کے علما کو نرم کردیا تھا۔ اسی روپیئے نے یقیناً شریف مکہ محمد بن عون کو بھی پچھاڑ دیا ہوگا۔ اگرچہ رالی صاحب نے جن کی کتاب کرسچنز اٹ مکہ سے ہم نے راچیز کے حالات اخذ کیے ہیں شریف صاحب کے اس بیوپار کی کوئی صراحت نہیں کی ممکن ہے اصل سفرنامۂ راچیز میں جو فرانسیسی زبان میں ہے اس کا کچھ ذکر ہو یا راچیز نے خود اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو گر وجوہ شبہ بہت قوی ہیں ورنہ بداعتقاد سے بداعتقاد مسلمان سے بھی بمشکل یہ حرکت ہوسکتی ہے کہ ایک عیسائی کو اس کے حسب مراد فتوے دینے میں مدد کرے اور مکہ معظمہ میں عیسائی کی موجودگی کا علم ہو جانے پر خود اس کے پرزے نہ اڑا دے حتی کہ دوسرے مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی اس کو ٹھکانے نہ لگنے دے بلکہ حفاظت کے ساتھ اس کو حدود حجاز سے باہر پہنچا دے۔ ہونہ ہو یہ سب کرامات حضرت قاضی الحاجات مبلغ علیہ السلام کی ہے۔ مزا یہ ہے کہ شریف نے راچیز کا کل سامان بھی معہ فتوی کے جوں کا توں اس تک پہنچا دیا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ شاباش یہی بات شرافت کی ہے چاہے ایمان رہے یا جائے مگر جس کام کی اجرت مل جائے اسکو اسی طرح پورا کردے میں نے اس وقت تاریخ اشراف مکہ پر جو غور سے نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ محمد بن عون نے ۱۸۴۲ء میں جو دین فروشی کی تھی وہی میراث میں اس کی اولاد کو ملی چنانچہ ہمارے زمانہ کے مشہور ملت فروش حسین شریف مکہ نے جو محمد بن عون کا پوتا ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم میں سلطان ٹرکی سے بغاوت کرکے فرنگی نوازی کا خوب ثبوت دیا۔ ان دادا پوتوں کے کارناموں کا مقابلہ کرنے سے اس مثل کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے کہ

---

[1] عرفات سے مکہ نو کوس ہے اور مکہ سے جدہ کوئی چوبیں کوس۔ معمولی اونٹ اس قدر مسافت بیس پچیس گھنٹے میں طے کرتے ہیں
[2] قصیر بحر احمر کے مغربی ساحل پر مصر کے راستہ میں ایک مشہور بندرگاہ ہے جدے سے چار دن میں وہاں جہاز پہنچتا ہے۔

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند"۔ ۲۷ جنوری ۱۸۴۲ء کو راچیز بندرگاہ قصیر پہنچا۔ بھاگ دوڑ میں اس کا سامان توسب کے ہی میں رہ گیا تھا۔ گرہ میں کچھ پیسے تھے جن میں سے کچھ قصیر تک کرایہ میں خرچ ہوئے باقی رستے میں چوری گئے۔ اس نے کچھ اپنے کپڑے بیچے جو غالبًا احرام کی ایک چادر ہوگی اور کچھ نجومی بن کر اور کسانوں کی قسمت کا حال بیان کرکے اتنا پیسہ پیدا کر لیا کہ اسکندریہ پہونچ گیا اور وہاں سے اپریل ۱۸۴۲ء میں روم پایۂ تخت اٹلی چلا گیا۔ جس دن وہ اس شہر میں داخل ہوا اتفاق سے وہ عیسائیوں کی ایک عید کا دن تھا۔ یہ بھی گرجے میں گیا اور اپنی گزشتہ حالت اور مذہب عیسوی سے ظاہری نفرت پر آبدیدہ ہوا۔ اس نے اگرچہ اپنی الجزائر کی ملازمت سے استعفا دیدیا تھا مگر جنرل بوگاؤ نے اس کو روم کے فرانسیسی سفیر کے ذریعے الجزائر طلب کیا اور یہ ۳ جنوری ۱۸۴۳ء کو پھر وہاں پہنچ گیا۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس کا سامان کپڑے فتوئی حالات سفر کے متعلق اس کی یادداشتیں۔ ہتیار۔ کتابیں وغیرہ سب چیزیں جو اس نے مکے میں چھوڑی تھیں وہ اس کا دوست حسن بن ابراہیم قاہرہ لے آیا تھا اور اس کے برادر نسبتی شیخ تونس نے یہ سامان الجزائر بھیجدیا تھا حسن نے اس کو حبشیوں کے ہاتھ میں گردوغبار کے بگولے کے ساتھ اڑتا ہوا دیکھا تھا اور اسکی بدقسمتی پر رویا تھا مگر ڈر کے مارے اپنے تعلقات کو جو اس کے ساتھ تھے پوشیدہ رکھا تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ راچیز زندہ ہے تو وہ بے حد خوش ہوا۔ راچیز نے جان پر کھیل کر جو فتوئی حاصل کیا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی آفریقہ کے بہت سے عرب قبائل نے فرانسیسیوں سے مقابلہ ترک کر دیا۔ مگر عبدالقادر اب بھی برابر لڑتا رہا۔ راچیز کے ساتھ عبدالقادر کی مراسلت ۱۸۸۳ء تک جاری رہی۔

مراکو والجزائر کی مہم کے بعد راچیز کو اسکی خطرناک خدمات کے صلہ میں طرابلس و تیونس میں بڑی ذمہ داری کے عہدے دئے گئے۔ اس کے بعد وہ جاپان میں سفیر مقرر ہوا۔ اور آخر میں فرانس واپس ہو کر وظیفہ یاب کی زندگی بسر کی۔ عرفات کا دل ہلانے والا واقعہ اس کو پچاس برس سے زیادہ عرصے تک یاد رہا۔ ۱۸۹۵ء میں وہ مرا اس کا سفرنامہ ۱۸۸۴ء بہ مقام پیرس فرانسیسی زبان میں شایع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ درویش فرانسیسی زبان سے مطلق ناآشنا ہے اس لئے راچیز کا سفرنامہ خود دیکھ کر اس پر کوئی رائے زنی نہ کر سکا۔

"تو ایسے سماں میں آ پیاری"

شیلی کی نظم "دعوت" INVITATION ملخص ترجمہ

(از جناب سید محمد اکبر وفا قانی بی-اے)

(۱)

او موہن مورت باہر آ — او رشک قمر او ماہ لقا
تو دن سے بڑھ کر روشن ہے — تو چاند سے بڑھ کر کندن ہے
تو شام کی سندر پیاری ہے — تو وقت سحر کی دیوی ہے
جب طفلک سال نو کے لئے — دیتی ہو باد سحر جھونکے
ہو وقت خوشی کا موسم گل — رو لیتی ہو جس میں بلبل
تو ایسے سماں میں آ پیاری — اور آ کر مجھ کو رلا پیاری

(۲)

شاید یہ سماں پیدا کر دے — پھر موسم گل کے سے چرچے
لہروں میں تلاطم پیدا ہو — دریا میں تبسم پیدا ہو
سب چشمے موسیقار بنیں — سب کوہ رباب کے تار بنیں
پھر کیوں نہ خزاں گلشن بن جائے — جب تیری ہنسی مجھ کو یاد آئے

(۳)

دور، اس دنیا کی بستی سے — کلفت کی اوج اور پستی سے
ہم کوہ و دشت میں جائینگے — جنگل کی ہوائیں کھائیں گے
ایک وجد سکون قلب سے ہو — پابندی کوئی نہ ہو دل کو
جس جا قدرت کا ہر ذرہ — ہو حسن کے نغمے میں ڈوبا

(۴)

او نور سحر! خورشید لقا! — اب خواب سے اٹھ اور باہر آ
آ نہروں کے نظاروں پر — آ قدرت کے فواروں پر
پتوں کے جھرمٹ میں آ جا — پھولوں کے گھونگٹ میں آ جا

میکل فیراڈے اور اُس کے افاداتِ سائنس

(از جناب عبدالوہاب صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

(۱)

سوانح حیات

بہت کم ہستیاں ایسی گزری ہونگی جو علمی او عملی قابلیت کے لحاظ سے میکل فیراڈے کی ہم دوش ہو سکتی ہوں جب ہم اُس کی ابتدائی کس مپرسی کی حالت سے لے کر اس کی عظیم الشان اور قابل رشک موت تک کے واقعات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر واقعہ ہمارے لئے ایک داستان استقلال ہے جس کو شمع ہدایت بنا کر ہم اپنے بعد ایک زندہ جاوید روشنی چھوڑ جا سکتے ہیں۔

میکل فیراڈے جو ایک غریب اور غیر معروف گھرانے کا فرد تھا ۲۲ ستمبر ۱۷۹۱ء کو نیونگٹن میں پیدا ہوا۔ جیمس فیراڈے کا تیسرا لڑکا تھا اس کا باپ ایک لوہار تھا جو یومیہ اجرت پر کام کرکے اس قدر رقم پیدا کر لیتا تھا کہ اُس کے مختصر کنبہ کی جو چھ آدمیوں پر مشتمل تھا کفالت کر سکے۔ ابھی میکل پانچ برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُس کے والدین کو نیونگٹن چھوڑ کر منچسٹر اسکوئر میں آباد ہونا پڑا۔ ۱۸۰۱ء میں میکل فیراڈے کے گھرانے کی مالی حالت کا نقشہ اس کا خاص سوانح نگار ڈاکٹر جونس اس طرح پر کھینچتا ہے کہ "میکل کے حصہ میں ہفتہ میں ایک بار روٹی کا ایک ٹکڑا آتا تھا جو کسی طرح ایک ہفتہ تک اُس کے لئے کافی نہ تھا"

غرض ان حالات کے تحت میکل کی پرورش ہوئی اور اس کی ابتدائی زندگی ایک بے خانماں غریب لڑکے سے زیادہ نہ تھی اُس نے ایک مدرسہ میں کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور کچھ حساب بھی جانتا تھا باقی اوقات وہ سڑکوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتا۔ آخر کار تیرہ سال کی عمر میں وہ ایک کتب فروش اور جلد ساز کی دوکان پر نوکر ہو گیا۔ اُس نے اپنی کارگزاری کے باعث اپنے آقا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کو بہ حیثیت امیدوار اور کار آموز اپنے پاس بلا ضمانت متعین کرلے اس طرح اس کو پہلی بار موقع ملا کہ اپنا عزیز وقت قیمتی کتابوں کی صحبت میں گزارے۔ دوران مطالعہ میں اُس نے حکمت کی بھی بہت سی کتابیں دیکھیں جنھوں نے اس کو تحصیل حکمت پر بے حد مائل کر دیا۔

چند پیسے جو وہ پس انداز کرسکتا تھا، معمولی معمولی تجربوں کی ترتیب میں خرچ ہونے لگے اور اس کا شوق بڑھنے لگا جب وہ انیس برس کا ہوا تو اُس نے اپنے بڑے بھائی سے اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کو مالی امداد پہنچائے تاکہ وہ "فلسفۂ فطرت" پر جو تقاریر ہونے والی تھیں اور جن میں بہ اُجرت داخلہ ممکن تھا شریک ہوکر کچھ معلومات حاصل کرسکے۔ اس کا بھائی جو خود ایک لوہار تھا اس علمی دلچسپی کی قدر کرکے اُس کی امداد پر آمادہ ہوگیا۔ اور اس طرح میکل فیراڈے کی علمی ترقی کا پہلا مرحلہ بہ سہولت تمام طے ہوا۔ ان تقاریر میں مستقل طور پر حاضر رہنے کی وجہ سے اُس میں حکمت سے ایک خاص دلچسپی بڑھتی گئی اور مزید برآں ایسے لوگوں سے میل جول کا موقع ہاتھ لگ گیا جو خود اسی مذاق کے تھے اُس کو اب جلدسازی میں کوئی لطف نہیں ملتا تھا اُس کے دن بے چینی سے گزرتے اور راتیں آئندہ کے خوشگوار خواب دیکھنے میں صرف ہوتیں علم و حکمت کی چنگاری اُس کے دل میں بھڑک چکی تھی۔

کتب فروش کی دوکان میں ہر وقت کلم کرتے رہنے سے اُس کے تعلقات مسٹر ڈانس (DANCE) سے شروع ہوچکے تھے جو ادارۂ شاہی (ROYAL INSTITUSION) کا رکن تھا اور جو ہر وقت اُس کی دوکان پر آیا جایا کرتا تھا ڈانس نے اُس کے حکیمانہ ذوق کو تاڑ لیا اور ایک موقع پر جبکہ سر ہمفری ڈیوی کے لکچر ہونے والے تھے میکل کو اپنے ساتھ لیجانے کا وعدہ کیا۔ یہ تقاریر میکل فیراڈے کے لئے الہام مسرت تھیں جن کے سُن لینے کے بعد اُس کی یہ خواہش بڑھتی گئی کہ وہ اس غیر موزوں تجارت کو چھوڑکر خود کو علم و حکمت کی خدمت کے لئے وقف کردے۔ کیا یہ ممکن تھا؟ کیا کوئی شخص اس کی اس بے کس زندگی میں ان خواہشات کی تکمیل کے لئے اسکی مدد کرتا تھا؟ اس کی کار آموزی کا زمانہ ختم ہونے کو تھا اور وہ ہمیشہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا کہ کچھ کرنا چاہئے کچھ کرنے کے خیال نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ مجلس شاہی (ROYAL SOCIETY) کے صدر کی خدمت میں التماس کرے کہ وہ اس آرزو کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹائے لیکن اُس کی یہ درخواست بلالحاظ مسترد کردی گئی۔

اپنی عمر کے اکیسویں سال میں اُس نے کار آموزی کے معاہدہ سے خلاصی حاصل کی اور ایک فرانسیسی تاجر کے پاس یومیہ اجرت پر کام کرنے لگا اس کا یہ نیا مالک اس قدر سخت گیر تھا کہ اس کو مطالعۂ حکمت کے لئے اپنی فرصت کا ذرا سا وقت بھی صرف کرنا مشکل ہوگیا تجارت اور کاروباری زندگی اُس کے لئے وبال جان ہوگئی اور اُس نے ایک بار اور کوشش کی کہ اس قید و بند سے نجات حاصل کرکے اپنے دلی مقصد کے حصول میں کامیاب ہو۔

بالآخر اُس نے یہ ترکیب سوچی کہ اپنی اس غیر فانی خواہش کو سر ڈیوی پر ظاہر کرے اُس نے ایک طویل عرضداشت میں اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا اور اُس کے ساتھ وہ اقتباسات بھی منسلک کردئے جو اُس نے ڈیوی کی تقاریر سے اخذ کیے تھے اس عرضداشت کا نہایت مفید اثر ہوا۔ اُن اقتباسات سے اُسکی قابلیت کا پتہ چلتا تھا۔ اسکی یہ عرضداشت دلی آرزوؤں کا ایک مجموعہ تھی جو سر ہمفری ڈیوی کے دل کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔

انتظار کی گھڑیاں بھی عجیب پریشان کن ہوتی ہیں۔ میکل فیراڈے کا یہ انتظار اُس کے حق میں بہت مفید اور ہمت افزا ثابت ہوا۔ سر ڈیوی نے اس کے جواب میں ایک تحریر روانہ کی اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس وقت باہر جا رہا ہے جب وہ واپس آئے گا تو میکل جس وقت چاہے اُس سے مل سکتا ہے۔ اُس کے لئے یہ امر باعث مسرت ہوگا کہ وہ میکل کی خاطر خواہ خدمت کر سکے۔

یہ واقعہ میکل کی زندگی کے رُخ کو پھیر دینے والا ثابت ہوا اور اسکی خوش قسمتی سے ادارۂ شاہی کے معمل میں ایک مددگار کی خدمت خالی ہوئی۔ ڈیوی نے فیراڈے کو بلوا بھیجا۔ منتظمین ادارہ نے یکم مارچ ۱۸۱۳ء کو اس امر کا تصفیہ کیا کہ میکل فیراڈے معمل میں بہ حیثیت مددگار کام کرنے کے لئے مقرر کیا جائے۔

اب یہاں سے میکل فیراڈے کی عملی اور علمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اُس کے فرائض گو نہایت معمولی تھے لیکن وہ حد درجہ خوش تھا اس کو موقعہ مل چکا تھا اساتذہ کو ان کے کام میں مدد دینا اور معمل کی صفائی اور ترتیب پر نظر رکھنا اس کا کام قرار دیا گیا اور اس کی تنخواہ پچیس شلنگ فی ہفتہ قرار دی گئی۔ وہ ادارہ کی عمارت کے بالائی حصہ میں فروکش ہوا۔ اُس نے اپنے آپ کو موجودہ فرائض سے زیادہ اہم فرائض کا اہل ثابت کیا اور رفتہ رفتہ ڈیوی کے محرر یا منشی کی خدمات بھی انجام دینی شروع کیں۔ اُس نے اپنے چند دوستوں کا ایک حلقہ بنایا جو اُس کے کمرہ پر علمی مباحث پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ اُس کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔

ان سرگرمیوں نے ڈیوی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سفر یورپ کے دوران میں میکل فیراڈے کو اپنے ہمراہ رکھے جب ڈیوی اکتوبر ۱۸۱۳ء کو انگلستان سے روانہ ہوا تو اُس کے ہمراہ فیراڈے بھی تھا ایسی دو متضاد شخصیتوں کے باہمی میل جول سے ایسے بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوئے کہ جن کی وجہ سے سفر فیراڈے کے لئے ایک تعلیمی سفر بن گیا اس سفر میں اُس نے یورپ کے بڑے بڑے فلسفیوں سے ملاقات کی جو آئندہ چل کر اُس کے گہرے دوست بننے والے تھے۔

اُس کا یہ سفر ۱۸۱۵ء میں ختم ہوا جب وہ واپس ہوا تو گو اُس کی خدمات وہی رہیں لیکن مشاہرہ میں فی ہفتہ پانچ شلنگ کا اضافہ کیا گیا۔ فیراڈے نے معمولی معمولی تجربات کو بھی بہت خوبی سے انجام دینا شروع کر دیا تھا اور وہ سادہ کیمیائی تشریح بہ آسانی کر سکتا تھا اُس کا یہ زمانہ تحصیل کا ہے ایجاد کے دن بعد کو آتے ہیں۔

سٹی فلاسفکل سوسائٹی میں اُس نے ایک مقالہ "خواص مادہ" پر پڑھا اور اس کے بعد سائنس کے ماہانہ رسالہ میں اس کا وہ مضمون چھپا جو (CAUSTIC LIME) کی کیمیائی تشریح پر مشتمل تھا اُس کے مختلف مضامین مختلف رسالوں میں مسلسل چھپتے رہے ۱۸۲۰ء میں اُس نے ایک مضمون "کلورین اور کاربن کے نئے مرکبات اور ہیڈروجن کاربن اور آئوڈین کے ایک نئے مرکب" پر شائع کیا جس کے بعد مجلس شاہی کی نظروں

میں اُس کی وقعت بڑھ گئی۔ اس مضمون کی بہت قدر کی گئی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا تھا کہ وہ ان متعدد مضامین کا پیش خیمہ ہے جو فیراڈے اپنی آئندہ زندگی میں عوام کے سامنے پیش کرنے والا تھا۔

اسی سال یعنی سنہ ۱۸۲۱ء میں ڈاکٹر ولیسٹن (WOLASTON) نے وہ تجربات مجلس شاہی کے سامنے پیش کرنا چاہے جن کے متعلق آمپیر (AMPERE) اور اورسٹڈ (OERSTED) نے نظری تحقیقات کی تھیں ان تجربوں میں اس کو ناکامی ہوئی اس جلسہ میں فیراڈے بھی موجود تھا اسکو ان میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ بجائے اس کے کہ وہ اول اُن کے حل کرنے کی کوشش کرتا اُس نے اُن چیزوں کے متعلق علم حاصل کرنا شروع کیا جو اس تجربہ سے پہلے منکشف ہو چکی تھیں اُس نے اس مقصد کے حاصل کرنے میں جو کوشش کی تھی اس کا ثبوت اُس کی تصنیف (A HISTORY OF THE PROGRESS OF ELECTROMAGNETISM) سے بخوبی ملتا ہے اس قدر معلومات حاصل کر لینے کے بعد اُس نے اُس تجربہ کی تکمیل کی کوشش کی جس میں ولیسٹن کو ناکامی ہوئی تھی اور آخر کار دسمبر ۱۸۲۱ء میں اُس گر کو معلوم کر لیا جس کی خوشی میں وہ پہلی بار سرکس دیکھنے کے لئے گیا۔ اسی سال ۱۲ جون ۱۸۲۱ء کو اُس نے ایک زرگر کی لڑکی مس سارا برنارڈ سے شادی کی۔

اس عرصہ میں اس کو منتظم معملات کی خدمت پر ترقی مل چکی تھی اور اسکی علمی تحقیقات کو اول درجہ کی اہمیت حاصل ہوگئی اُس نے اپنے تجربوں کے دوران میں اسٹڈ آرٹ (STODARE) سے مدد لی اور فولاد کی کچھ دھاتوں پر تجربے کئے۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں اُس نے گیسوں کی اماعت کے لئے تجربوں کو مرتب کیا اور یہ دریافت کیا کہ تمام گیسیں ایسے مائعات کے بخارہیں جن کا نقطۂ جوش بہت پست تھا ان میں بعض تجربات مثلاً شیشہ کے برتن پر کثیر دباؤ کا مشاہدہ وغیرہ اس قدر خوفناک تھے کہ ایک مرتبہ دھماکے کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ میں شیشہ کی تیرہ دھجیاں چبھ گئیں۔ ان تمام تجربوں کی تکمیل کے بعد وہ ایک ماہر فن بن چکا تھا جس کے اعتراف میں وہ مجلس شاہی کا رفیق منتخب کر لیا گیا۔ ڈیوی کی سفارش پر سنہ ۱۸۲۵ء میں ناظم معملات مقرر ہوا اس خدمت پر فائز ہونے کے بعد اُس نے "جمعہ کی مجالس" کا آغاز کیا جس میں وہ لوگ شامل ہوتے تھے جنکو علم و حکمت سے دلچسپی ہوتی ان جلسوں میں وہ ایک ہردلعزیز مقرر کی حیثیت سے بھی ممتاز ہو گیا۔ جمعہ کی شام کو اس کی تقریریں سننے لوگ جوق جوق آتے جن "رائل انسٹیٹوٹ" کھچا کھچ بھرا نظر آتا تھا۔

اس کے چند سال بعد اُس نے مناظری شیشوں پر تجربے کئے اس دوران میں بہ حیثیت ناظم اس کا ایک سو پونڈ مشاہرہ علاوہ کرایہ مکان اور روشنی کے تھا یہ رقم اُس کے رتبہ کے لحاظ سے بہت کم تھی لیکن تقاریر اور تسیر تجارتی کی اجرت سے اس کو سالانہ ایک ہزار پونڈ اور کبھی اس سے زیادہ بھی وصول ہو جایا کرتے۔ ان حالات کی

ا۔ ماڈرن انسائیکلوپیڈیا جلد سوم ص (۴۷۶)

ماتحت اُس کے سامنے ایک زبردست اخلاقی سوال پیدا ہوتا ہے ایک طرف اگر علمی تجسس کا وسیع میدان تھا جس میں ترقی کرکے وہ دائمی عزت اور مسرت حاصل کرسکتا تھا تو دوسری طرف وہ اپنی علمی تحقیقات کو ختم کرکے تجارتی دنیا میں قدم رکھ کر بھی بے شمار دولت حاصل کرسکتا تھا۔ ٹنڈل جو اس کا گہرا دوست تھا یوں رقمطراز ہے کہ جب میں ایک مرتبہ فیراڈے سے حکمت اور تجارت کے باہمی تعلق پر گفتگو کررہا تھا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ اُس کی زندگی میں ایک وقت ایسا گزرا ہے جبکہ وہ اس امر کے فیصلہ پر مجبور ہوگیا تھا کہ اپنی زندگی کا مقصد سائنس کی خدمت قرار دے یا حصول دولت؟ وہ ان دونوں کی بیک وقت تکمیل سے قاصر تھا بنابرآں اس کے لئے ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا لازمی تھا اس معاملہ میں اس کا فیصلہ اس قدر شاندار ہے کہ دنیا اس کی یاد کو نہیں بھلا سکتی۔ واقعات خود اس کے شاہد ہیں ۱۸۳۱ء میں اسکی آمدنی ایک ہزار نو دپونڈ سے کچھ زیادہ تھی لیکن ۱۸۴۵ء میں صرف بائیس پونڈ رہ گئی! وہ ایک غریب آدمی کی حیثیت میں مرنا پسند کرتا تھا لیکن یہ اُسی کا حق تھا کہ اقوام عالم میں انگریزوں کے نام کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک بہ حیثیت ایک حکیمانہ قوم کے بلند و بالا رکھ سکا۔ اس عرصہ میں اس کو پروفیسر کیمیا کی خدمت پر ترقی مل گئی۔

ایک زبردست مقرر اور ایک قابل قدر حکیم ہونے کے لحاظ سے فیراڈے اپنے تمام ہمعصروں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے اس کی علمی تحقیقات پر اس مضمون کے دوسرے حصہ میں ہم آئندہ مکمل بحث کریں گے۔ ایک مشاہد اور تجربوں کو مرتب کرنے والے کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو فیراڈے اپنے زمانہ کا اُستاد شمار کیا جاسکتا ہے۔ جس تعجب خیز احتیاط اور حیرت انگیز نفاست پسندی کے ساتھ وہ اپنے تجربوں کی تکمیل کے لئے مشہور ہے اُسی قدر اپنے مضمون میں کامل ہونے اور ذہن رسا پانے کے لحاظ سے بھی اس کو اپنے ہم عصروں پر سبقت لے جانے کا فخر حاصل ہے۔ ایک مقرر کی حیثیت سے وہ ایک ممتاز درجہ رکھتا تھا اپنی جادو بیانی سے ہر عمر والے کو مسحور کرلینے میں وہ کبھی ناکام نہیں رہا۔

میکل فیراڈے کی اس حکیمانہ زندگی سے قطع نظر جب ہم اس کی مذہبی اور روزمرہ زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو شان خدا نظر آتی ہے " ۱۸۵۴ء میں اس نے ذہنی تعلیم" پر جو تقریر کی تھی اُس سے اس رشتہ کا علم ہوتا ہے جو اس نے حکمت اور مذہب کی درمیان قائم کیا تھا تو وہ کہتا ہے:۔

"مضمون سے بحث کرنے کے قبل مجھ کو ایک ایسا فرق بتلا دینا چاہیئے جو باوجود دوسروں کے پاس معمولی ہونے کے میرے لئے ایک نہایت ہی بالشان ہے انسان کو جب دیگر مخلوقات پر فوقیت دی گئی ہے تو اسکے پیش نظر ایک بلند مرتبہ اور وقعت کا درجہ ہونا چاہیئے اور وہ ذرائع غیر محدود ہیں جنکی مدد سے وہ

اپنی آنے والی زندگی کے متعلق بیم و رجا کے خیالات اور دیگر توقعات کو اپنے دماغ میں جگہ دے سکتا ہے میرا یہ عقیدہ ہے کہ مستقبل کی حقیقت کا انکشاف انسان پر اس کی دماغی کاوشوں کی مدد سے غیر ممکن ہے گو وہ کیا ہی عالی مرتبہ کیوں نہ ہو اور میں اس پر بھی عقیدہ رکھتا ہوں کہ یہ انکشافات اس کو ایسی تعلیمات کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں جو اسکی اپنی نہیں ہے یہ محض اُن سادہ اعتقادات سے حاصل ہوتے ہیں جو اس کو ابتداً سکھلائے گئے ہوں جس ذاتی تعلیم کی میں اس وقت سفارش کرنے والا ہوں اس کے متعلق کوئی شخص یہ نہ فرض کرلے کہ وہ ہماری خوشش آئندہ اور پیش نہاد توقعات کو اپنے دامن میں لے لیگی یا یہ کہ ہم اُس کی مدد سے توجیہات کی طومار باندھ کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں پر اس نوعیت کے مضمون سے بحث کرنا اور علاوہ اس کے مذہبی اور روزمرہ زندگی میں مطلق فرق بتلانے کی کوشش کرنا بے محل ہے۔ لیکن تاہم دنیاوی معاملات میں میرا یہ عقیدہ ہے کہ "شان آلہی کی پوشیدہ نشانیاں" مخلوقات عالم میں نمایاں ہیں جنکی پہچان انہی مخلوقات کی مدد سے ممکن ہے اور انہی کی مدد سے ہم اس کی شان الوہیت اور ازلی قوت کا اعتراف کرسکتے ہیں جو چیزیں کہ انسان سے متعلق ہیں (جنکو وہ اپنی اندرونی روحانیت سے معلوم کرسکتا ہے) اور وہ اعلیٰ چیزیں جو اسکے مستقبل سے متعلق ہیں (اور جن کو وہ اپنی روحانیت کی مدد سے معلوم نہیں کرسکتا) مجھے ان دونوں میں ناموافقت نظر نہیں آتی۔"

ڈاکٹر بنس جونس اسکی فرض شناسی کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس کا معیار فرض شناسی مافوق الفطرت ہو چکا تھا اور اسکی بنیادیں نہ تو کذب و صداقت کے وجدانی خیالات پر قائم کی گئی تھیں اور نہ مکان و زمان کے خارجی تجربات پر بلکہ اس نے اس کو خدا کے ارادے کے الہام کی بناء پر ترتیب دیا تھا اور وہ مدت العمر اسی جدوجہد میں لگا رہا کہ اپنے عقیدہ کے مطابق اسی پر کاربند رہے۔"

اُس کی حکیمانہ طبیعت ان کارناموں سے ظاہر ہے جو دنیا کے سامنے پیش کیے گئے مگر اس کے کردار کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کی ترقی کے لئے اُس نے اُسی قدر توجہ اور وقت صرف کیا جو اس کے خاندان، دوستوں اور مذہب کے لئے مخصوط تھا اُس کے مکتوبات اور ملفوظات تمامتر ایسی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں جو مذاق سلیم پیدا کرتے ہوں اور اُن باتوں سے مبرا ہیں جو بددلی اور بدطینتی پیدا کریں وہ تکبر اور غرور سے کوسوں دور تھا نہ وہ خود ستا تھا اور نہ خود نما جس وقت کہ اسکی علمی قوت بڑھتی جارہی تھی اُس وقت بھی وہ نہایت فراخ دلی سے تمام اعتراضات کو قبول کرتا اور اُن تمام تدابیر پر غور کرتا تھا جو اُس کے سامنے پیش کی جاتی تھیں خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہوں جس وقت اس کا دماغ سائنس میں علمی طور پر کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ اُس کو اسی میں خوشی حاصل ہوتی تھی کہ وہ اپنے شریف جذبات اور پرجوش احساسات محبت کو کام میں لائے

جن کی ترقی میں اسی قدر فکر سے کام لیا گیا تھا جس قدر کہ حکیمانہ مذاق کی ترقی میں۔

لیکن فیراڈے کی عمر کا آخری حصہ اُس کے لئے دائمی مسرت اور کامیابی کا زمانہ ہے جبکہ دنیا کے بڑے بڑے تعلیمی اور فلسفیانہ ادارے اس کو اعزازی خطابات اور انعامات دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور اس کو اپنے ادارے کا رفیق بنانا۔ ادارہ کی عزت میں چار چاند لگانے کے مماثل گردانتے تھے "مجلس شاہی" نے ہر ممکنہ طریقہ سے اُس پر اعزازات اور انعامات کی بوچھار کر دی۔ جامعات نے اعزازی ڈگریوں کی بھرمار سے اور شاہان وقت نے اپنی اپنی طرف سے خطابات دیکر اسکی زندگی کے آخری حصہ کو حد درجہ معزز کر دیا۔ فرانس نے اس کو بلو ربنڈ (BLUE RIBOND) عطا کر کے اپنی اکاڈمی آف سائنس کا رفیق بنایا جب "مجلس شاہی" کی کرسی صدارت خالی ہوئی تو مجلس نے بہ اتفاق آرا یہ تصفیہ کر لیا کہ یہ خدمت میکل فیراڈے کے تفویض ہونی چاہئے لیکن اُس نے انکار کر دیا اور اپنے دوست ٹنڈل سے کہا کہ میں اپنی آخری عمر تک وہی سادہ میکل فیراڈے رہنا پسند کرتا ہوں سر رابرٹ پیل نے اسکی آخر عمر میں تین سو پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کیا اور حکومت وقت نے بھی معقول وظیفہ مقرر کر کے عزت افزائی کی۔

ٹنڈل اس کے متعلق یوں رقمطراز ہے :۔ "اسکی نرمی اور ملائمت کے پیچھے ایک آتش فشاں پہاڑ کی حدت موجود تھی وہ ایک بہت جلد بھڑک جانے والا انسان تھا لیکن اُس نے اپنی ذاتی تربیت سے اس آگ کو ایک مرکزی روشنی اور زندگی کی قوت محرکہ میں تبدیل کر لیا اور اس آگ کو بے جا خواہشات میں رائگاں نہ کیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے اپنی علمی جدوجہد کو ختم کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بعد کا زمانہ اطمینان و آرام میں گزارنے کی کوشش کی ۱۸۶۵ء کے ختم پر وہ بیمار ہوا اور لقوہ و فالج کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے اس کے بعد سے اس کا وقت زیادہ تر بے ہوشی کے عالم میں گزرتا تھا اُس نے ایک بار کہا تھا "ٹنڈل! میرے کارناموں کا بہترین عطیہ وہ ہمدردی اور نیک خیالی ہے جو اُن کی بدولت مجھ پر اکناف عالم میں ظاہر کی گئی" یہ کیفیت اُس کے جدوجہد کے زمانہ کی تھی اور وہی کیفیت اب بھی ہے جبکہ وہ موت کی میٹھی نیند سو رہا ہے اُس کی زندگی ۲۵ ؍ اگست ۱۸۶۷ء کو ختم ہوئی وہ نہایت اطمینان اور چین کے ساتھ اپنے آخری آرام کی طرف مائل ہوا۔ موت اُس کے لئے نیند کے مانند تھی وہ اپنی عمر کی اعلیٰ کامیابی اور اپنے خدمات کے عظیم الشان اتمام کے بعد دنیا سے رخصت ہوا اور مصاف ہستی میں ایک کامران اور فتحمند شہسوار میدان علم و سائنس کی حیثیت سے اپنا نام چھوڑ گیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(۲)

علمی تحقیقات

فیراڈے کی زندگی کا جو مختصر سا خاکہ مضمون کے پہلے حصہ میں پیش کیا گیا ہے اس سے صاف طور پر اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی علمی اور حکمی کامیابیاں سر ہمفری ڈیوی کے امداد کی رہین منت ہیں لیکن ذرا ان تحقیقات میں فیراڈے کی مستعدی اور علو ہمتی پر بھی نظر دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کوشش کیے چلے جانا اور ایک ہی چیز پر بہت پست ہمت ہونے کے بغیر ساری عمر صرف کر دینا ہر شخص کا کام نہیں ہے جبکہ مالی مشکلات ساتھ ساتھ دامن گیر ہوں۔ فیراڈے کی علمی قابلیت محض اس کے ذاتی مطالعہ اور شوق پر موقوف ہے اگر ایک طرف اس کی اس ہمیشہ رہنے والی ناموری کا راز اسکی معلومات کی کمی اور ابتدائی کس مپرسی زندگی میں مضمر ہے تو دوسری طرف اس کی اعلیٰ ذہنیت اور دور رس دماغی قابلیت کا پتہ اس حقیقت سے بھی واضح ہے کہ وہ ساری عمر ریاضی کے پیچیدہ تو کیا بلکہ سادہ مسائل سے بھی بالکل عاری رہا۔ دنیا کے جتنے بڑے بڑے ماہران طبیعیات گزرے ہیں ان میں سے ایک ایک کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بعض تو زبردست ریاضی داں تھے اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے بہت کم ریاضی پڑھی ہو۔ کم و بیش ان سبھوں نے اس اعلیٰ استعداد کی مدد سے بہت سے بڑے بڑے مسائل طبیعی حل کر لئے یا ان کے ممکن ہونے کا پتہ لگایا۔ فیراڈے کا حال بالکل جداگانہ ہے۔ اس نے بچپن میں ایک سال میں کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ ملازم ہونے کے بعد کتب بینی سے اس میں علم و حکمت کا چسکہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی معلومات کو محض مطالعہ اور غور و فکر سے وسعت دیتا ہے۔ جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو تجربوں کی مدد سے اپنے معلومات کو تقویت دینا شروع کی اس کا ذہن اس قدر چالاک تھا کہ اس کو ریاضی کے استعمال کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ حق پر ہے اگر اس نے اس بات پر فخر کیا ہو کہ اس نے کبھی ریاضی کو کام میں نہیں لایا۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک کامل مشاہد اور تجربوں کو مرتب کرنے والا تھا۔ اس میں ایک خاص لطیف حس تھی جس کی مدد سے وہ طبیعی صداقتوں کو سونچ سکتا اور ان کو اپنے معمل میں جانچتا تھا لیکن اسکی یہ تحقیق اور جانچ پڑتال ہمیشہ حیرت ناک طور پر کامیاب نکلی۔ اور اگر دراصل دیکھا جائے تو وہ ادارہ شاہی میں استاد کیمیا کی خدمات انجام دیتا تھا۔

ہم نے فیراڈے کی بعض بعض علمی تحقیقات کا مجمل ذکر اس کی سوانح عمری کے سلسلہ میں کر دیا ہے۔ اب یہاں اس کی بعض اہم تحقیقات کو کچھ تفصیل اور کچھ اجمال کے ساتھ پیش کرتے ہیں :-

ہم نے اس امر کا بھی ذکر کر دیا ہے کہ ولیسٹن کی ناکامی نے فیراڈے کو اس بات کی طرف مائل کیا کہ وہ اس تجربہ کو

مرتب کرنے کی کوشش کرے۔ اب ہم اس تجربہ کی نوعیت اور اس کے امکانات پر تھوڑی سی بحث کریں گے۔ اورسٹڈ نے تجربتاً یہ بتلا دیا تھا کہ جب ہم کسی موصل کے قریب ایک مقناطیسی سوئی کو رکھیں اور اس موصل پر سے برقی رو گزارا جائے تو مقناطیسی سوئی موصل کے علی القوائم وضع میں قائم ہو جاتی ہے۔ اس مظہر کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ مقناطیس کا شمالی قطب خطوط قوت کی سمت میں حرکت کرنے کا متقاضی ہے اگر اس کو آزادانہ چھوڑ دیا جائے تو وہ لازماً حرکت کرے گا۔ اس توجیہ کی بنا پر اس بات کے امکان کا پتہ چلتا تھا کہ اگر ایک انتصابی موصل تار میں سے رو گزرتی ہو تو مقناطیس کا شمالی قطب اس موصل کے اطراف چکر لگائے گا۔ کیونکہ ایسے موصل تار کے گرد برقی میدان کے خطوط قوت ہم مرکز دائروں کی شکل میں ہوتے ہیں۔

مقناطیس کی ساخت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دونوں سرے مساوی اور متضاد خواص کے مالک اور ناقابل انقسام طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن کسی موصل برقی دور کے متعلق سوچئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک بند دور ہوتا ہے ورنہ رو کا بہنا ناممکنات سے ہے ایسی صورت میں اگر اورسٹڈ اور آمپیر وغیرہ کے نظریات کی بنا پر اس امر کے امکان کی توقع رکھیں کہ ایک مقناطیس اور ایک موصل تار میں ایک دوسرے کے گرد باہمی طور پر مسلسل گردش ممکن ہے تو ایک ناممکن شئے کے ممکن ہونے کو فرض کر لینا پڑیگا کیونکہ جب مقناطیس کا ایک سرا کسی خاص سمت میں گھومنے کی کوشش کریگا تو دوسرا سرا چونکہ مساوی اور متضاد خواص کا مالک ہے اس لئے اُسے بالکل مخالف سمت میں مساوی اور متضاد اثر پیدا کرنے کا متقاضی ہوگا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو مقناطیس اُس موصل کے گرد چکر لگا سکتا ہے اور نہ اُس تار کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے یا گھومنے کا موقع دے سکتا ہے۔

بظاہر یہ تجربہ غیر ممکن ثابت ہوتا ہے اور اُس کے عدم امکان کو ویسٹن نے اپنے تجربے کی ناکامی سے ایک حد تک عملی طور پر بھی ثابت کر دیا تھا لیکن چونکہ نظری حیثیت استوار بنیادوں پر قائم تھی اس لئے ایسا ضرور ہونا چاہئے تھا۔ فیراڈے نے بہت غور و خوض کے بعد اس کے امکان کی صورت معلوم کر لی۔ اُس نے اپنے تجربہ کو اس طرح پر مرتب کیا کہ ایک موصل تار لیکر اُس کی دو ساقیں انتصابی وضع میں قائم کیں اور ینائی
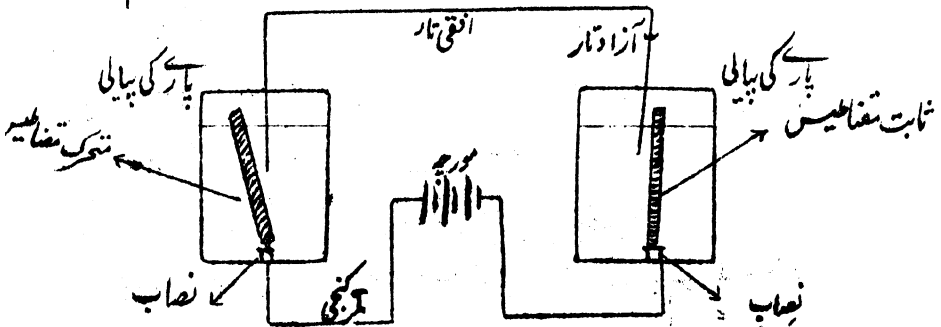
اور درمیانی حصہ کو افق کے متوازی رکھا اس میں دائیں جانب کی ساق کو دور سے جدا کر لیا گیا اور اس طرح پر انتظام کیا کہ ساق دور سے ملحق بھی رہے اور آزادانہ گھوم بھی سکے۔ اب ان ساقوں کو دو پارے کی پیالیوں میں ڈبو دیا گیا۔ ان پیالیوں کے پیندوں میں موصل تار اور نصاب لگے ہوئے تھے ان موصل تاروں کو مورچے کے سروں سے ملا دیا گیا تھا۔ نصابوں پر مقناطیس اس طرح سے رکھے گئے تھے کہ وہ انتصابی وضع میں ہوں۔ ان میں سے دائیں جانب والا مقناطیس مضبوط جکڑ دیا گیا تھا اور دوسرا مقناطیس اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ نصاب پر آزادانہ گھوم سکے فیراڈے اس قسم کی ترتیب میں کامیاب رہا۔ جب اس نے مورچے کے سروں سے دور کو مکمل کر دیا تو یہ بات مشاہدہ میں آئی کہ آزاد مقناطیس اور آزاد تار گھومنے لگتے ہیں۔ فیراڈے اس کامیاب تجربہ پر اس قدر خوش ہوا کہ جوں جوں وہ تار اور مقناطیس گھومتے تھے وہ ان کے ساتھ ساتھ فرط انبساط سے ناچنے لگا (دسمبر ۱۸۲۱ء)

غرض اس تحقیق اور کامیابی نے اس کی دماغی قابلیت کا سکہ جما دیا۔ ڈاکٹر بنس جونس کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی یہ کامیابی بہتوں کے ساتھ دشمنی کے آغاز کا باعث ہوئی جو صرف حسد اور بغض پر مبنی تھی لیکن وہ خوش تھا اس کے چند سال بعد اس نے علم برق میں اس زبردست باب کے اضافہ کی طرف توجہ کی جو "برقی مقناطیسی امالہ" (ELECTRO-MAGNETIC INDUCTION.) کے نام سے موسوم ہے۔ دسمبر ۱۸۲۴ء میں اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مقناطیس کی مدد سے برقی رو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اس نے اولاً اس بات پر غور کیا کہ جب ہم برقی رو سے مقناطیسی میدان پیدا کر سکتے ہیں تو شاید یہ ممکن ہے کہ برقی رو کی پیدائش مقناطیس کے ذریعہ ہو سکے۔ اپنے اس خیال کے ثبوت کے لئے اس نے تین تجربے نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کئے لیکن اس کو ان تجربوں میں ناکامیابی ہوئی وہ اس تحقیق میں اپنا زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس زمانہ میں مناظری شیشوں اور نور کے متعلق تجربوں میں مصروف بکار تھا۔ بنا بر آں ۱۸۲۴ء سے لیکر ۱۸۳۱ء تک اس نے صرف تین بار "برقی مقناطیسی امالہ" کے لئے ناکام تجربے مرتب کئے۔ آخر کار ۲۹ اگست ۱۸۳۱ء کو اس نے ایک تجربہ مرتب کیا۔ جس میں آمپیر کے اس اصول سے کام لیا گیا تھا کہ جب ہم مرغولہ دار لچھے (SOLENOID) کے قلب میں لوہے کی سلاخ رکھ کر لچھے پر سے رو گزارتے ہیں تو یہ سلاخ زبردست مقناطیس کی طرح عمل کرتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر اس نے حسب ذیل تجربہ مرتب کیا۔

اس نے ایک لوہے کا حلقہ لیا جو تقریباً ایک انچ موٹی سلاخ کا تھا اس حلقہ کے نصف حصہ پر موصل تار لپیٹ کر اس کے سرے مورچے سے ملا دئے۔ اور دوسرے حصہ پر تار لپیٹ کر رو پیما سے ملا دیا۔ جب ابتدائی دور یعنی مورچہ کے دور کو مکمل کیا گیا تو ثانوی دور یعنے رو پیما کے دور میں ایک آنی رو پیدا ہوئی جو رو پیما کی سوئی کی جست سے ظاہر ہوئی۔ اس نے اس کی اہمیت پر غور کرتے ہوئے اپنے دوست آرفلپ کو یوں لکھا کہ
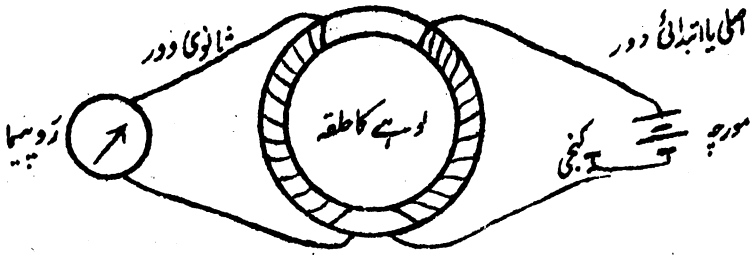
"میں آج کل دوبارہ برقی مقناطیسیت میں مصروف بکار ہوں میرا یہ خیال ہے کہ ایک اچھی چیز ہاتھ لگ گئی ہے لیکن میں اس پر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ممکن ہے کہ یہ مچھلی کی بجائے گھاس ہو جو میں اپنی محنت کے اختتام پر سطح آب سے باہر کھینچ سکوں" (۲۳ ستمبر ۱۸۳۱ء)

فیراڈے نے اس پر بھی غور کیا کہ برقی مقناطیسیت کی ایک خاص صورت ہو سکتی ہے اس نے لوہے کی بجائے ایک مقناطیسی شئے کا حلقہ لے کر تجربہ کو دہرایا تو کیفیت وہی تھی لیکن کم نمایاں یا خفیف تھی اس کے بعد اس نے ایک استوانہ لے کر اس پر تار کو لپیٹ دیا اور اس کے سرے ردپیما سے ملادئے اس استوانہ کو دو مقناطیسوں کے
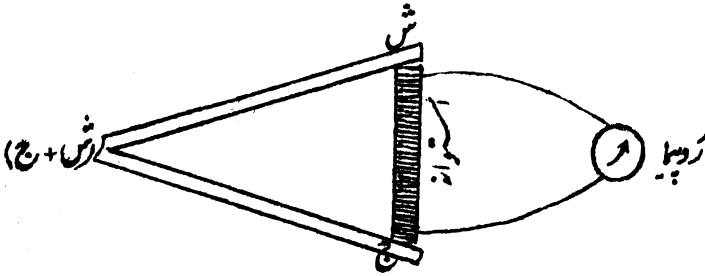
بیچ میں اس طرح رکھا کہ ایک طرف ان کے متضاد سرے ملے ہوئے تھے اور دوسری طرف ان باقی سروں کے درمیان یہ استوانہ تھا جب کبھی ان سروں اور استوانے کے سروں سے تماس پیدا کیا جاتا تو اس وقت ردپیما ایک غیر مستقل یا آنی جست ہو کر ختم ہو جاتی۔ یہی حالت تماس کے توڑنے سے پیدا ہوتی تھی لیکن متضاد سمت میں۔ اب وہ اس پر کافی یقین کرنے لگا تھا کہ یہ محض مقناطیسیت کا اثر ہے کہ برقی رو ظاہر ہو رہی ہے اس طرح اورسٹڈ کے انکشافات کے بالکل برعکس انکشافات کئے یعنی اورسٹڈ نے یہ معلوم کیا تھا کہ برقی رو مقناطیسی میدان رکھتی ہے تو فیراڈے نے یہ معلوم کیا کہ مقناطیسی میدان کے اندر ہم رو پیدا کر سکتے ہیں جو محض اس میدان کا اثر ہے۔ فیراڈے نے اعلیٰ دماغی قابلیت کے زور سے اپنے تجربہ کی روح کو بھی پہچان لیا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب ہم تماس قائم کرتے ہیں یا توڑتے ہیں اور دَور کو مکمل کرتے ہیں یا منقطع کرتے ہیں تو صرف ان صورتوں میں

رَو پیا میں ایک جست ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔

برقی مقناطیسیت میں اپنی پہلی کامیابی کے دو ماہ بعد اس نے اس مظہر طبیعی کے علی العموم مشاہدہ کی طرف توجہ کی اب تک تو اس نے راست طور پر مقناطیس استعمال کئے تھے اب اس نے تجربے کی نوعیت کو اس طرح پر بدل دیا کہ دو دور قائم کئے ابتدائی میں مورچہ شریک تھا اور ثانوی میں رَو پیا شامل تھا۔ جب ابتدائی کا دور مکمل کیا گیا تو ثانوی کے رَو پیا میں ایک جست ہوئی۔ جب ابتدائی کا دور منقطع کر دیا گیا تو ثانوی میں دوبارہ
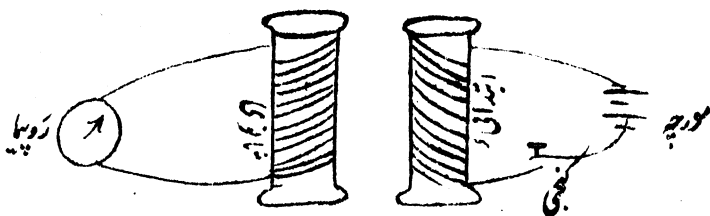
برقی رَو کا پتہ لگا لیکن دوسری صورت میں جست کی سمت پہلے کے بالکل متضاد تھی۔ ان تجربوں سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "جب کبھی ہمیں اِمالی رَو پیدا کرنی ہو تو ابتدائی اور ثانوی کی اضافی حالتوں میں تبدیلی کرنی چاہیئے اور امالی رَو اسی وقت پیدا ہو گی جبکہ موصل میدان کے خطوط قوت کو منقطع کرے" اس نتیجہ کے ثبوت کے لئے اب اس نے تجربہ اس طرح مرتب کیا کہ ابتدائی دَور کو سرے سے اڑا کر ثانوی دَور کا ایک مرغولہ بنا لیا۔ اس مرغولہ کے قلب میں سے ایک سلاخی مقناطیس کو فوراً گذارا تو مرغولہ کے دور میں جو رَو پیا شامل تھا اس کی سوئی منصرف ہو گئی۔ جب مقناطیس کو واپس نکالا گیا تو دوبارہ اِنصراف ہوا جس کی سمت پہلے اِنصراف کے متضاد تھی۔ مقناطیس کے سروں کو بدل کر تجربہ کرنے کے بعد اس نے کچے لوہے کی ایک سلاخ استعمال کر کے مشاہدات اخذ کئے۔ ان تمام تجربوں سے اس کے پہلے نتیجہ کی بالکلیہ تصدیق ہوتی تھی اس نے ارضی امالہ کے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا اور یہ تبلایا کہ چونکہ زمین خود ایک زبردست مقناطیس ہے اس لئے جب کوئی دَور اس کے خطوط قوت کو منقطع کرے گا تو لازماً برقی رَو پیدا ہو گی۔ اسی ارضی امالی اصول کو کام میں لا کر آج ہم اپنے تجربہ خانوں یا معملات میں زمین کے افقی اور انتصابی اجزا کی پیمائش کرتے ہیں اور تجارتی طور پر برقی رَو پیدا کر کے اس سے بہر نوع فائدہ اٹھاتے ہیں اس نے اپنی
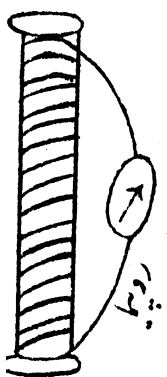
یہ تمام تحقیقات مجلس شاہی کے روبرو ۲۴ نومبر ۱۸۳۱ء میں پیش کیں۔

اُس نے فروری ۱۸۳۲ء میں اس تجربہ میں کامیابی حاصل کر لی کہ امالی رَو کی مدد سے شرارہ پیدا کر سکے اُس کی یہ تحقیق بھی زبردست علمی حیثیت رکھتی ہے۔ برقی قمقموں کی روشنی کی موجودہ حالت فیراڈے کے اسی تجربہ کی مرہونِ منت ہے۔

اِس کے علاوہ اُس نے برق میں اور بہت سے تجربات اور انکشافات کئے ہیں فیراڈے پہلا شخص ہے جس نے فرکی برق کی پیدائش کی صورت میں مساوی تعداد اور متضاد خاصیتوں کی برقی کیفیت کے بہ آن واحد وجود میں آنے کا خیال ظاہر کیا اور اُس نے یہ بھی تبلایا کہ خواہ ہم کسی طریقہ سے برق حاصل کریں وہ صرف ایک ہی قسم کی چیز ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا مثلاً اولٹائی برق اور فرکی برق ایک دوسرے کے بالکل مطابق ہیں اس کو اس بات کا بھی فخر حاصل ہے کہ برق پاشیدگی (ELECTROLYSIS) میں رَو اور کیمیائی تعامل کے درمیان رشتہ معلوم کرے۔ اُس کے کلیاتِ برق پاشیدگی آج تک مسلمہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اُس نے برق گزار واسطوں (DiLECTRIC S.) کی طرف توجہ کی اور مسلسل کوششوں سے یہ معلوم کر لیا کہ شیشہ، لاکھ، مسکا وغیرہ جیسے "برق گزار" واسطے ہیں جن کی "نوعی امالی گنجائش" (SPECIFIC INDUCTIVE CAPACITY) بہ نسبت ہوا کے زیادہ ہے "برق گزار نوعی امالی گنجائش" یا "برق گزاری مستقل" وغیرہ الفاظ اُس کے خود تراشیدہ ہیں۔ (ہنری کیونڈش نے ۱۷۷۳ء میں برق گزار واسطوں کی اس خاصیت کو معلوم کر لیا تھا لیکن چونکہ اُس کے یہ تجربے ۱۸۷۹ء تک شائع نہ ہو سکے اس لئے نہ تو فیراڈے کو اس کا علم تھا اور نہ دیگر حکمائے وقت اس سے واقف تھے۔

ان تمام تحقیقات کے بعد اُس نے مظاہر فطرت میں ایک عام رشتہ معلوم کرنے کی طرف توجہ کی ۱۸۴۵ء میں اُس نے تقطیب نور (POLARIZATION OF LIGHT) اور برق کے درمیان رشتہ معلوم کرنے کا اہتمام کیا اسکی پاکیزہ اور متجسس نظر میں عرصہ دراز سے اس امر کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ مختلف حوادث فطرت میں یکسانیت اور ربط اتحاد معلوم کریں۔ آخر کار ۲۴ نومبر ۱۸۴۵ء کو اُس نے اپنی اس خواہش اور خیال کا اظہار مجلس شاہی کے روبرو کیا۔ کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اُس نے اس انکشاف کے متعلق اپنے خیالات کو کس طرح مرتب کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "عرصہ سے مجھ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا جو وثوق کی حد تک پہنچ چکا تھا کہ مختلف شکلیں جنمیں توانائی کا اظہار ہوتا ہے ان سب کی ایک مشترک اصل ہے یا بہ الفاظ دیگر یہ ایک دوسرے کے اس طرح تابع ہیں اور ان کا باہمی ربط ایسا ہے کہ ہم ان کو ایک دوسرے میں بدل سکتے ہیں اور ان کی عاملیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ .... وغیرہ" اس نے اس تجربہ میں جو نور اور برق میں باہمی ربط معلوم کرنے کے لئے مرتب کیا گیا تھا نور کی ایک خاص شکل یعنے مقطب نور (POLARIZED LIGHT.) کو

کام میں لاکر مشاہدات حاصل کئے اُس نے آلات کو ایک خاص شکل میں ترتیب دے کر اولاً تقطیب نور پیدا کی بعد ازاں آلات کو ایک زبردست مقناطیس کے قطبین کے درمیان اس طرح پر رکھا کہ مقناطیسی خطوط قوت کی سمت سمت اشاعت نور کے موافق ہو جبکہ نور "تقطیبی شیشہ" میں سے گزر رہا ہو۔ اس ترتیب سے یہ معلوم ہوا کہ "مقناطیسی میدان کے اثر سے نور کے تقطیب کا مستوی بدل جاتا ہے" اس کے بعد فیراڈے نے مقناطیس کے بجائے ایک مرغولہ استعمال کر کے تقطیبی شیشہ کو اس لچھے کے بیچ میں رکھ کر اسکی دوبارہ تصدیق کی۔ مجلس شاہی کے روبرو یہ انکشاف ۱۸ نومبر ۱۸۴۵ء میں پیش کیا گیا۔

اس کے بعد مقناطیسی تقسیم اشیا کی طرف توجہ کر کے اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا کی ساری چیزیں یا تو "کم مقناطیسی" ہیں یا "پُر مقناطیسی" اُس نے برقی مقناطیس کے قطبین کے درمیان ایک شیشہ کی سلاخ کو ریشم کے مہین تار سے آزادانہ لٹکا دیا۔ یہ سلاخ قطبین کو ملانے والے خط کے علی القوائم قائم رہی۔ اس سلاخ کو ہٹا کر لوہے کی سلاخ پر تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ لوہے کی سلاخ قطبین کو ملانے والے خط کے متوازی سمت میں رہتی ہے شیشہ کی سلاخ کی خاصیت ظاہر کرنے والے اجسام کو فیراڈے نے "کم مقناطیسی" اشیا نام دیا۔ اور لوہے کی سلاخ کی خاصیت والے اجسام "پُر مقناطیسی" کہلائے۔

ان مختلف تجربوں کی نوعیت اور اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے کیا کوئی شخص فیراڈے کی علمی قابلیت اور علمی دلچسپی کی وقعت کما حقہ کر سکتا ہے جن مسائل کے حل کے لئے اُس وقت کے بڑے بڑے ماہران حکمت سرگرداں تھے اُس نے اپنی فکر رسا اور علمی قابلیت کی بنا پر نہایت آسانی سے انکو حاصل کر لیا۔ اُنیسویں صدی کے تمام ماہران حکمت جو زبردست ریاضی داں بھی تھے اس کا لوہا مانتے ہیں اور اب بھی جبکہ علوم طبعیہ میں روز افزوں ترقی ہوتی جارہی ہے قدم قدم پر ہمیں فیراڈے کے انکشافات سے مدد لینی پڑتی ہے۔

غرض یہ ہیں وہ حالات اور واقعات جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فیراڈے کی زندگی جدید حکمت میں ایک انقلاب پیدا کرنے والی ثابت ہوی۔ اور انسانی زندگی کی موجودہ کامیابیوں کا بیشتر حصہ نہیں تو کچھ نہ کچھ فیراڈے کے انکشافات کا ضرور رہین منت ہے۔

رباعی

از جناب محمد علی صاحب قتیل حیدرآبادی

خوش شیوہ و رسم دلربائی داری — با دشمن و دوست آشنائی داری
حسنت بہزار پردہ پنہاں ماند — لیکن ہمہ جا جلوہ نمائی داری

یورپ اور ہندوستان

معاشی نقطہ نظر سے

از

(جناب غازی الدین احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) متعلم ایچ سی ایس کلاس)

لعبت مغرب کی ہرستانہ اداؤں تو اپنے اندر وہ کشش پنہاں رکھتی ہے کہ دیوانہ مشرق بے خود و مسحور ہوکر متاع عقل و دانش صد ہزار بار اس پر نثار کرنے کو آمادہ نظر آتا ہے لیکن خلاق عالم نے ان دونوں کی فطرت میں وہ عظیم الشان فرق پیدا کردیا ہے کہ باوجود صدیوں کے باہمی ربط اور میل جول کے درجہ اختلاط زیادہ بلند نہ ہوا۔ مغرب کی خوش آئند جفاکاریوں نے ضرور ایک حد تک مشرق کو سر نیاز خم کرنے کا عادی بنادیا ہے تاہم ابھی ایسے عناصر کا وجود معدوم نہیں جو اس طرز خاص کی ہوش ربائیوں سے پوری طرح متاثر نہیں ہوئے ہیں، وہ گفتہ سولن پر کان دھرنے والوں کے پہلو بہ پہلو "تلقین نعمان" کے دلدادہ بھی پراجمائے نظر آتے ہیں، موٹر نشینوں کے سامنے بنڈی رانوں کی قطاریں کوئی غیر معمولی منظر پیش نہیں کرتیں۔ سوٹ بوٹ کے روبرو جبہ و دستار نے ابھی سر تسلیم خم نہیں کردیا ہے سر و مسٹر کے ساتھ پنڈت و مولانا ابھی تک معاشرت ہند کے جز لاینجزیٰ تصور کیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اصول معیشت جنھوں نے یورپ کی حیات اجتماعی میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کردیا ہے ہنوز کشور ہند کے جمود کو تحریک میں منتقل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اور تاوقتیکہ خود معاشرت میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا نہ ہوں ان اصول کا انطباق غیر ممکن نظر آتا ہے۔

متذکرہ بالا امر مختلف فیہ ہے بعض کا خیال ہے کہ اصول جو ایک خطہ ارض کے لئے وضع ہوئے ہیں دوسرے مقامات پر بھی بے شبہ قابل انطباق ہیں بعض کو اس سے اختلاف ہے ان کے نزدیک ہر ملک کی فضا خاص قسم کے اصول کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے حقیقت ان دونوں آرا کے بین بین ہے یعنے اصول تو ہر جگہ کے لئے ایک ہی نوعیت رکھتے ہیں لیکن جن مفروضات پر ان کی بنا قائم ہے ان میں اختلاف ہوتا ہے اور یہی اختلاف باعث ہوتا ہے اصول کی ترمیم و تنسیخ کا۔ لہٰذا اس نقطہ نظر سے یورپ و ہندوستان کو مد مقابل رکھا جائے تو حقیقت خود بخود عیاں ہو جائے گی۔

ماہرین علم معاشیات نے تحصیل دولت کے لئے چند عناصر ضروری قرار دئے تھے۔

زمین[1]، محنت، اصل و تنظیم۔ ظاہر ہے کہ کون ملک اُن کی برکات سے مستفیض نہیں ہوتا۔ لگان، اجرت، سود، منافع اور ناکس مسلم الثبوت طور پر تقسیم دولت کے اجزا ہیں لیکن طریق عمل اکثر جداگانہ ہے مثلاً وہ ممالک جو تہذیب اسلامی کے خوشہ چین ہیں ہنوز سود کو روا نہیں رکھتے صرف دولت کے لئے انسانی ضروریات کا وجود لازمی ہے۔ غیر مہذب ممالک میں یہ ضروریات محدود ہوتے ہیں لیکن تہذیب یافتہ ممالک میں لاانتہا مثلاً اگر ایک کاشتکار زمین کا رہنے والا موٹا جھوٹا کھا کر رات کو کھرے کھاٹ پر سو رہتا ہے اور نہایت سادگی سے اپنی زندگی بسر کر لیتا ہے تو لنکاشائر کے مزدور کے لئے چا، بسکٹ اور سینما بھی ضروری ہیں۔ مبادلہ دولت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شئے کے معاوضہ میں دوسری شئے دی جائے اس سے کون ملک خالی ہے البتہ اگر انگلستان میں سکّے چلتے ہیں تو ہندوستان کے دیہات میں لوگ ترکاری کے عوض گیہوں قبول کر لینے میں عذر نہیں کرتے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ تحصیل دولت کے عناصر ایک ہیں اور تقسیم دولت کے اجزا یکساں صرف دولت اور مبادلہ دولت کی صورتیں ایک دوسرے سے متغائر ہیں لیکن فرق جو ہے وہ ملک کی عام فضا میں مضمر ہے خواہ وہ معاشرتی ہو یا سیاسی۔ یورپ و ہندوستان کو خواہ معاشرتی حیثیت سے دیکھیں خواہ سیاسی حیثیت سے فرق زمین و آسمان کا نظر آئے گا، دلدادگان تہذیب حاضر نے معاشی ترقیوں کے لئے یہ فرض کر لیا ہے کہ "ہر انسان اپنے ذاتی اور مالی نفع کی خاطر کام کرتا ہے" بالکل درست! کیونکہ اگر شیخ غلام قادر نے دن بھر کولہ تو خود بچھوڑا اور پیسے رکھا ئے لاکر میاں فقیر محمد کے ہاتھ تو کما چکے دولت اور ہو چکی ترقی ساری عمر کمائی کی لیکن رہے ہمیشہ کوڑی کوڑی کو محتاج۔ لیکن واقعہ کچھ اور ہی ہے۔

مسٹر بریڈلا کی والدہ آنجہانی کا انتقال ہوا لاشہ گھر پر چھوڑ چلے فیکٹری کو لوگوں نے بھی نہ پوچھا کیونکہ یہ واردات غیر معمولی نہ تھی چھ گھنٹے کام کاج سے فراغت ہوئی تو تجہیز و تکفین میں بھی شرکت کر لی ورنہ "I HAVE NO TIME" (میرے پاس وقت نہیں ہے) کا فاتحہ پڑھ دیا!

اِدھر نواب چھبن صاحب کے صاحبزادے کی خدانخواستہ ڈاڑھ میں درد ہوا اسی روز سرکاری مالگزاری داخل کرنی تھی وہ تو کارندوں نے بخوف "شملہ سرخ" داخل کر دی لیکن نواب صاحب کی سراسیمگی نے تمام کاشتکاروں کو رخصت کر دیا۔ حکیم ڈاکٹروں کے ہجوم نے کاروبار کے تمام دروازے بند کر دئے جب خدا خدا کر کے بلند اقبال نے غسل صحت کیا تو شادیانے بجے رنگ رلیاں ہوئیں موقعہ ملا تو تحصیل وصول بھی کیا اور خاص اسی غرض سے ورنہ

---

[1] زمین سے مراد محض تودۂ خاک نہیں بلکہ اس میں اصطلاحاً دیگر عاملین قدرت مثلاً باد و باران بھی شامل ہیں۔ محنت میں دماغی و جسمانی دونوں اقسام شامل ہیں اصل سے مراد وہ دولت ہے جو مزید پیدائش دولت کے کام آئے۔ تنظیم کا مفہوم یہ ہے کہ متذکرہ بالا عناصر کو اس خوبصورتی سے ترتیب دیا جائے کہ پیدائش دولت میں اضافہ ہو۔

ورنہ اللہ بس باقی ہوس!

اب وہ ماہرین معاشیات کے "معاشی انسان" نواب صاحب ہیں یا مسٹر بریڈلا؟ اور پیدائش دولت کے اصول سے انھوں نے فائدہ اٹھایا یا انھوں نے؟ معاشرت کے اختلاف کی یہ پہلی نظیر ہے۔

کہتے ہیں کہ "ہر شخص اپنا نفع و نقصان خوب سمجھتا ہے" قبول! بیشک مساوات قابلیت کا فرض کرنا معاشی اصول کی بنیاد ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ نفع و نقصان کے تخیل ہی میں فرق ہے کسی صاحب بہادر سے پوچھئے تو نفع اُسے کہیں گے کہ دو سو روپیہ پر چالیس روپیہ سالانہ مسلسل زیادتی ہوتی رہے مولانا نے اگر یہ سن پایا تو استغفر اللہ کے نعروں سے زمین و آسمان میں گونج پیدا کر دیں گے وہ تو نفع اُسے سمجھیں کہ برسوں جان اللہ شاہ کا فاتحہ کیا تبرک سے دوست احباب کی ضیافت کی دنیا میں بھی سرخرو ہوئے دین بھی ہاتھ سے نہ گیا۔

یہ کیوں؟ اس لئے کہ ایشیا کے ضمیر میں وہ جراثیم ہنوز حلول نہیں کر آئے ہیں جنھیں مادی ترقیوں کا باعث خیال کیا جائے واقعہ یہ ہے کہ مغربی دماغ جسے نفع سمجھتا ہے مشرقی نقطۂ نظر سے وہ سراسر نقصان ہے اگر وہاں مادی ترقیاں کسی قوم کو بام عروج پر پہنچا سکتی ہیں تو یہاں اُسے قعر مذلت میں گرا دینے کے لئے کافی ہیں یعنے ترقی کا تخیل ماورائی مادیت ہے۔

علم معاشیات کا ایک اہم ترین مفروضہ یہ ہے کہ "ہر شخص کو کاروبار میں پوری آزادی حاصل ہے اور حصول منفعت میں کوئی قانون و رواج مزاحم نہیں" درا صل یہ مفروضہ اس موجودہ مبحث کی جان ہے اسی لئے اسکو بالتفصیل بیان کرنا مقصود ہے اس کی جامعیت تذکرۂ اول مفروضات پر بھی حاوی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر رسوم و قوانین کی بندشیں انسانی جد و جہد پر عائد کر دی جائیں تو کم از کم مادی ترقیوں کا دروازہ تو بند ہی ہو جائیگا چنانچہ بدقسمتی ہندوستان کے حق میں انھیں بندشوں نے طرح طرح کی مزاحمتیں پیدا کر دی ہیں اس سے بحث نہیں کہ آیا یہ بندشیں واقعی طور پر موجب ضرر ہیں یا باعث انتفاع لیکن کم از کم چشم ظاہر بیں تو انھیں مفید نہیں تصور کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ جہاں تک معاشی جد و جہد کا تعلق ہے میدان ترقی میں ہندوستان یورپ سے کئی فرسنگ پیچھے نظر آتا ہے۔

ہندوستان کی آبادی کے دو خاص عناصر ہیں۔ ہندو اور مسلمان ان دونوں کی معاشرت میں مسلم الثبوت طور پر ایسی خرابیاں موجود ہیں جن کا اثر لازماً معاشی جد و جہد پر پڑنا چاہئے مثلاً کمسنی میں شادیوں کا رواج جس سے قویٰ میں جلد انحطاط پیدا ہوتا ہے اور اولاد بھی ضعیف پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ خود اس قابل رہتے ہیں کہ محنت و جفاکشی کر سکیں اور نہ نسل ہی کو اس قابل رہنے دیتے ہیں دوسرے تمام رسومات میں بڑا دخل اُن کثیر مصارف کو ہے جن کی وجہ سے نہایت متمول خاندان اکثر و بیشتر نان شبینہ

کو محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگلستان کی حالت پر نظر ڈالئے تو دونوں امور ایک دوسرے کے برعکس نظر آئیں گے وہاں زیادہ تر ۲۵ اور ۳۰ سال کی عمر سے کم میں شادیاں نہیں کرتے جس کی وجہ سے نسلی خرابیاں پیدا ہونے نہیں پاتیں مزید برآں وہ بے موقعہ اخراجات جو یہاں کے رسم و رواج کا جزو لازمی ہیں وہاں حقیقتاً نظر ہی نہیں آتے۔

ان فروعی امور کے علاوہ قوانین معاشرت نے بھی معاشی زندگی پر گوناگوں اثرات ڈالے ہیں مسلمانوں کے قانون وراثت کی رو سے باپ کی جائداد محض بیٹے ہی کو تفویض نہیں ہوتی بلکہ اقارب وغیرہ تک حصہ دار قرار پاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ایک بڑی جائداد مختلف حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

اہل ہنود کے یہاں خاندان مشترکہ کی رو سے ایک اولوالعزم ہونہار رکن خاندان دولت پیدا کرتا ہے اور دیگر کم حوصلہ اور کم استطاعت افراد اس سے متمتع ہوتے ہیں[۱]۔

یورپ کی معاشرت اس کے بالکل برعکس ہے والد کی جائداد کا مالک بالعموم فرزند اکبر قرار دیا جاتا ہے اور بقیہ اراکین خاندان اپنے خورونوش کا انتظام علیحدہ کرتے ہیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ اکثر نوآبادیات میں معزز خاندانوں کے رکن کسب معاش کے لئے کاشتکاری اور کان کنی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں جس کا اثر عام قومی دولت پر نہایت خوشگوار پڑ رہا ہے۔

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یورپ کی وہ غیر مساوی تقسیم جس نے اہل داروں اور مزدوروں کے درمیان ایک وسیع خلیج اختلاف حائل کر دی ہے اپنے مضر اثرات ہندوستان پر نہیں ڈال سکتی۔ لیکن کم از کم جہاں تک حصول دولت کا تعلق ہے یورپ کا تفوق یقینی طور پر مسلم ہے۔

ذات پات کے قوانین نے اور بھی قومی دولت کے حصول میں سنگ گراں حائل کر رکھے ہیں کسی دھیڑ کو مشکل سے دیکھا ہوگا کہ کرسی عدالت پر رونق افروز ہوا وہی مسٹر لائڈ جارج تھے جنھیں کسی نقش دوز سے شرف تناسل حاصل تھا لیکن پانچ برس تک یورپ کی سیاسی دنیا میں شہنشاہت کرتے رہے۔

مستورات کی پردہ نشینی ہی نے ایک کثیر حصہ ملک کو بے کار کر دیا ہے (کم از کم یورپ کے مقابلہ میں) خواہ اس کے اخلاقی اثرات کچھ ہی ہوں لیکن معاشی نقطۂ نظر سے تحصیل دولت پر اس کے اثرات

---

[۱] امریکہ میں ۱۲ فی صدی آبادی ۰۰ فی صدی سے زائد مجموعی دولت کی مالک ہے یعنی ۲ فی صدی دولت ۸۸ فی صدی کی ملک ہے اور بقیہ ۲ فی صدی دولت ۹۸ فی صدی آبادی میں منقسم ہے انگلستان میں ۲ فی صدی خاندانوں کی ملک ۸۰ فیصدی کے مقابل ہے چنانچہ ۱۹۱۱ء میں کل ترکہ جات میں سے نصف ۰۰ لوگوں کو پہنچے اور بقیہ نصف چار لاکھ چالیس ہزار وارثوں کو گویا نصف حصہ ایک شخص کو بقیہ نصف پانسو میں تقسیم ہوا۔

کچھ خوش گوار نہیں۔[1]

لیکن ان معاشرتی اختلافات کے علاوہ سب سے بڑا فرق وہی ہے جس سے آج ہندوستان کا ایک ایک طفل مکتب بخوبی واقف ہے اور وہ قومی آزادی اور غلامی ہے معاشرت کی تبدیلی تو خود اپنے ہاتھوں سے بھی ممکن ہے لیکن ناقہ لیلیٰ کی آزادی کی باگ تو اس ساربان کے ہاتھ ہے کہ جسے قیس صفت ہند کی فلک دوز آہ وزاری کچھ متاثر نہیں کرسکتی۔

ہندوستان میں تقریباً ۷۰ فی صدی آبادی کا پیشہ زراعت ہے لگان کی وصولیابی کا حق سرکار کو حاصل ہے۔ رکارڈو کا مسئلہ لگان[2] دنیائے یورپ میں عام طور پر قبولیت حاصل کرچکا ہے لیکن یہ امر قطعاً فراموش کردیا جاتا ہے کہ سرزمین ہند اس کے لئے اپنے اندر کتنی موزونیت رکھتی ہے۔ کاشتکاروں کی حالت دریافت کرنے کے لئے مختلف اوقات میں کمیشن مقرر ہوئے ان کی مالی حالت پر سب کو ترس آیا معلوم ہوا کہ پیداوار سے مصارف پیدائش ہی وصول نہیں ہوتے سارا کاروبار قرض ادھار پر چل رہا ہے لیکن سرکاری دیوتا بغیر بھینٹ چڑھائے راضی ہونے سے رہا اس کے جو مضر اثرات ہوتے ہیں ان سے نگاہ دوربین کبھی ناآشنا نہیں رہ سکتی۔ لیکن

مرا در سیت اندر دل اگر گویم زباں سوزد وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

صنعت وحرفت کے قوانین نے وہ ستم ڈھائے ہیں کہ جو صفحات تاریخ سے کبھی محو نہیں ہوسکتے ہندوستان کے ریشمی کپڑے سوتی کپڑے عمدہ قالین ہر قسم کے زیورات تانبے پیتل کے برتن تمام عالم میں مشہور تھے سنہ ۱۸۱۳ء کی تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑے انگریزی کپڑوں سے پچاس ساٹھ فی صد کم نرخ پر ولایت کے بازاروں میں فروخت ہوسکتے تھے لیکن انگریزی مال بلا محصول یہاں ٹھونسا جانے لگا اور رفتہ رفتہ ہندوستانی مال کی برآمد ستر اور اسی فی صدی محصول لگا لگا کر روک دی گئی۔

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے تنزل کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں وہ دخانی کلیں اور مشینیں نہیں تھیں تجارت بر پیمانہ کبیر[3] سے تقسیم عمل کے فوائد نہیں اٹھائے جاسکتے تھے۔ سائنس اور علوم کی ترقیوں کے

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ دوران جنگ میں ۸۸۶ عورتیں صرف انگلستان میں ججوں کے عہدوں پر فائز تھیں۔

[2] رکارڈو کے مسئلہ لگان کا مفہوم یہ ہے کہ کاشتکار جس قدر پیداوار حاصل کرتا ہے اسمیں سے اسکے مصارف منہا کئے جائیں اور بقیہ حصہ میں لگان شامل ہے۔

[3] تجارت جو بڑے پیمانہ پر کیجاتی ہو یعنی زیادہ مال سے زیادہ کاروبار چلایا جاتا ہو۔

سبب یورپ نے سونے میں سہاگہ کا کام کیا تھا لیکن عام خیال تھا کہ اس کے باوجود بھی تجارت ہند اس قدر سبقت لیجا چکی تھی کہ ان کلوں اور مشینوں کا رواج اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن پے بہ پے ایسے قوانین نافذ کیئے گئے کہ جنھوں نے اس تجارت کو قطعاً معدوم کر دینے کا تصفیہ کر دیا۔

۱۸۸۳ء[۱] میں پارلیمنٹ کی منتخب کمیٹی نے یہ ہدایت کر بھیجی کہ بنگال کے ریشمی کپڑا بننے والوں کو کمپنی کے زیر نگرانی کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مجبور کرنے میں کچھ ہرج نہیں البتہ اگر وہ کام نہ کریں تو سرزنش بھی قانوناً ممنوع نہیں۔

۱۹۱۸ء کی صنعتی تحقیقات کی کمیٹی نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی صنعت کو تباہ و برباد کرنے کی پیہم کوششیں جاری رکھی گئیں منجملہ دیگر طریقوں کے نوربافوں کو قید کرنا انکے ہاتھ کٹوا دینا بھی شامل ہیں جنھیں تہذیب جدیدہ کی روشنی میں بغیر تعجب ملاحظہ کرنا غیر ممکن ہے۔

اس کا مقابلہ یورپ کی حالت سے کیجئے کہ تجارتی مفاد کے لئے زار روس ایسے شہنشاہ با جبروت کو معہ اس کے خاندان کے نیست و نابود کر دیا گیا فرانس اور اٹلی میں اشتراکیت کا مدتوں دور دورہ رہا انگلستان کی حکومت کچھ عرصہ کیلئے مزدوروں کے ہاتھ میں آگئی جو دنیا کے لئے ایک نادر واقعہ ہے اگر دار العوام میں ٹریڈ یونین بل یا مسودہ انجمن تجارت پیش ہو رد کیا جاتا ہے تو مسٹر میکڈانلڈ گورنمنٹ کو چیلنج دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اگر مزدوروں کی اجرت میں اضافہ نہیں ہوتا تو چھ ماہ تک مسلسل ہڑتال جاری رہتی ہے اور دوسرے ممالک سے استمداد کے لئے بے مزاحمت مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ ع ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ہندوستان کی صنعت کے تحفظ کے بارے میں لارڈ ریڈنگ کا وہ مشہور کارنامہ پیش کیا جاتا ہے کہ ٹارف بورڈ قائم کر کے ٹاٹا کے لوہے اور فولاد کے کارخانے (TATA IRON + STEEL WORKS.) کی پیداوار کو گورنمنٹ کی ضروریات پوری کرنے کی اجازت دی گئی لیکن

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا

الغرض وہ معاشی مفروضات جن پر یورپ کے اقتصادی اصول منحصر ہیں۔ ہندوستان کی معاشرتی بلکہ مذہبی، اخلاقی اور سیاسی زندگی سے کسی طرح مطابقت نہیں کرتے اور اگر ان اصول کو یہاں منطبق کرنا چاہیں تو سب سے پہلا فرض ان حالات کو پیدا کرنا ہے جنکے تحت یہ اصول کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں اور وہ معاشرتی اور سیاسی اصلاح مددگار ہے کہ جس کے باعث بلا مزاحمت ان اصول پر عملدر آمد ہو سکے ورنہ خوف ہے کہ (خام پڑھا) کوے اور ہنس کی مثال صادق نہ آئے۔

---

[۱] ماخوذ از علم المعیشت مصنفہ مولوی محمد الیاس برنی (ہندوستانی تجارت خارجہ کی سرگزشت)

پنہاری کا کنواں

افسانہ

(از جناب غلام رسول صاحب سٹی کالج)

گومتی نے بستر مرگ پر پڑے ہوئے چودھری ونایک سنگھ سے کہا "چودھری میری زندگی کی یہی حسرت تھی"
چودھری نے متاثر ہو کر کہا "اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ چچی تمھاری آرزو خدا پوری کرے گا۔ میں آج ہی سے مزدوروں کو بلا کر کام پر لگائے دیتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو تم اپنے کنویں کا پانی پیوگی۔ تم نے تو گنا ہوگا کتنے روپے ہیں؟" گومتی نے ایک لمحہ آنکھیں بند کر کے اور اپنے منتشر خیالات کو یک جا کر کے کہا "بھیا میں کیا جانوں کتنے روپے ہیں۔ جو کچھ ہیں وہ اسی ہانڈی میں ہیں ایسا کرنا کہ اتنے میں کام چل جائے کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھروگے؟" چودھری نے بند ہانڈی کو اٹھا کر ہاتھ سے تولتے ہوئے کہا "ایسا تو کریں گے۔ چچی کون دینے والا ہے ایک چٹکی بھیک تو کسی کے گھر سے نکلتی نہیں۔ کنواں بنوانے کو کون دیتا ہے خوش نصیب ہو تم کہ اپنی عمر بھر کی کمائی اس دھرم کے کام کے لئے دیدیں۔"
گومتی نے فخر سے کہا "بھیا تم تو تب بہت چھوٹے تھے، تمھارے چچا مرے تو میرے ہاتھ میں ایک کوڑی بھی نہ تھی دن دن بھر بھوکوں پڑی رہتی جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ سب کچھ اُن کی بیماری میں اُٹھ گیا وہ خدا کے بڑے بھگت تھے اس لئے بھگوان نے انھیں جلدی سے بلا لیا اس دن سے آج تک تم دیکھ رہے ہو کہ میں کس طرح دن کاٹ رہی ہوں؟ میں نے ایک ایک دن میں من من بھر اناج پیسا ہے۔ بیٹا! دیکھنے والے حیرت کرتے تھے نہ جانے اتنی طاقت مجھ میں کہاں سے آجاتی تھی بس یہی حسرت رہی کہ ان کے نام کا ایک چھوٹا سا کنواں گاؤں میں بن جائے۔ نام تو چلنا چاہیئے اسی لئے تو آدمی بیٹا بیٹی کو روتا ہے۔"
اس طرح چودھری ونایک سنگھ کو وصیت کر کے اسی رات کو بڑھیا گومتی پرلوک سدھاری۔ مرتے وقت آخری لفظ جو اس کے منہ سے نکلا وہ یہی تھا کہ "کنواں بنوانے میں دیر نہ کرنا اس کے پاس روپیہ ہے یہ تو لوگوں کو یقین تھا لیکن دو ہزار ہیں اس کا کسی کو گمان نہ تھا۔ بڑھیا اپنے روپے کو عیب کی طرح چھپاتی تھی۔ چودھری گاؤں کا مکھیا اور نیت کا صاف آدمی تھا اسی لئے بڑھیا نے اس سے یہ آخری وصیت کی تھی۔

(۲)

چودھری نے گومتی کی کریا کرم میں بہت روپے نہ خرچے۔ یوں ہی ان سنسکاروں سے چھٹی ملی۔

وہ اپنے بیٹے ہرناتھ سنگھ کو بلا کر اینٹ، چونا، پتھر کا تخمینہ کرنے لگے۔ ہرناتھ تو غلہ کی تجارت کرتا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ بیٹھا ہنستا رہا، پھر بولا "دو چار مہینے کنواں نہ بنے تو کوئی بڑا حرج ہے"؟

چودھری نے ہوں ہوں کرکے کہا "حرج تو کچھ نہیں لیکن دیر کرنے کا کام ہی کیا ہے۔ روپئے انہوں نے دے ہی دئے ہیں۔ ہمیں تو مفت میں ثواب ملے گا۔ گومتی نے مرتے مرتے جلد کنواں بنوانے کو کہا تھا"

ہرناتھ "ہاں کہا تو تھا لیکن بازار اچھا ہے دو تین ہزار کا غلہ بھر لیا جائے تو اگہن پوس تک سوایا ہو جائیگا میں آپ کو کچھ سود دیدوں گا" چودھری کا دل امید و بیم کے شبہ میں پڑ گیا۔ دو ہزار کے کہیں ڈھائی ہزار ہو گئے تو کیا کہنا! جگ موہن میں بیل بوٹے بنا دونگا لیکن ڈر تھا کہیں گھاٹا ہو گیا تو؟ اس شبہ کو وہ چھپا نہ سکے، بولے "اگر کہیں گھاٹا ہو گیا تو؟

ہرناتھ نے مضطرب ہو کر کہا: "گھاٹا کیا ہو جائے گا کوئی بات ہے"

"فرض کرو گھاٹا ہو گیا تو"

ہرناتھ نے جسارت کرکے کہا "یہ کہو کہ تم روپے نہیں دینا چاہتے، بڑے دھرماتما بنے ہو"!

دوسرے عمر رسیدہ ہونے سے چودھری بھی بیٹے سے بہت دبتے تھے" دبی آواز میں بولے۔

"میں کب یہ کہتا ہوں کہ روپے نہ دونگا لیکن پرایا دھن ہے سوچ سمجھ ہی کر تو اس میں ہاتھ لگانا چاہیے۔ بنج بیوپار کا حال کون جانتا ہے کوئی مخالف گھر میں آگ ہی لگا دے۔ سب باتیں سوچ لو اچھی طرح"

ہرناتھ نے پیچ و تاب کھا کر کہا "اس طرح سوچا ہو تو یہ کیوں نہیں خیال کرتے کہ کوئی چور ہی اٹھا لے جائے یا بنی بنائی دیوار بیٹھ جائے یہ باتیں بھی تو ہوتی ہی ہیں۔"

چودھری کے پاس اب کوئی دلیل نہ تھی کمزور سپاہی نے تال تو ٹھونکی اکھاڑے میں اتر بھی پڑا لیکن تلوار کی چمک دیکھتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بغلیں جھانک کر چودھری نے کہا "تو کتنا لوگے"؟

ہرناتھ چالاک جنگجو کی طرح دشمن کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر بپھر کر بولا "سب کا سب دیجئے۔ سو پچاس روپے سے کیا ہو سکتا ہے۔ چودھری راضی ہو گئے۔ گومتی کو انھیں روپے دیتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ بدنامی کا بڑا گمان بھی نہ تھا۔ ہرناتھ نے اناج بھرا۔ اناجوں کے بوروں کا ڈھیر لگ گیا آرام کی میٹھی نیند سونے والے چودھری اب ساری رات بوروں کی رکھوالی کرتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی چوہیا بوروں میں گھس جائے چودھری اس طرح جھپٹتے تھے کہ بلی بھی ہار مان لیتی۔ اس طرح چھ مہینے گزر گئے پوس میں اناج بکا۔ پورے پانسو کا نفع ہوا۔

ہرناتھ نے کہا "اس میں سے پچاس آپ لے لیں"

چودھری نے جھلا کر کہا۔ پچاس کیا خیرات لے لوں۔ کسی سے اتنے روپے لئے ہوتے تو کم سے کم دو سو سود کے ہوتے۔ مجھے تم دو چار روپے کم دے دو اور کیا کروں گا۔"

ہرناتھ نے زیادہ بات بڑھنے نہ دی۔ ڈیڑھ سو چودھری کو دیدئے۔ چودھری کا دل اتنا خوش کبھی نہ ہوا تھا رات کو وہ اپنے کمرے میں سونے گیا۔ تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ بڑھیا گومتی کھڑی مسکرا رہی ہے چودھری کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ نیند میں نہ تھا کوئی نشہ نہ کیا تھا۔ گومتی سامنے کھڑی ہوئی تھی ہاں اس پژمردہ چہرے پر ایک سہانا پن برس رہا تھا۔

(۳)

کئی سال گزر گئے چودھری برابر اسی فکر میں رہتے کہ ہرناتھ سے روپے نکال لوں لیکن ہرناتھ ہمیشہ ہی حیلے حوالے کرتا رہتا تھا وہ سال میں تھوڑا سا سود دیدیتا۔ پر بھول کے لئے ہزار باتیں بناتا تھا کبھی گھاس چارہ کی شکایت تھی کبھی ترقی کا رونا تھا البتہ کاروبار بڑھتا جاتا تھا آخر ایک دن چودھری نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تمھارا کام چلے یا ڈوبے مجھے پروا نہیں اس مہینے میں تمھیں ضرور روپے ادا کرنے ہونگے ہرناتھ نے بہت اڑن چھائیاں بتائیں مگر چودھری اپنے ارادے پر جمے رہے۔

ہرناتھ نے جھنجھلا کر کہا "کہتا ہوں کہ دو مہینے اور ٹھہرئے مال بکتے ہی میں روپے دیدونگا"

چودھری نے درشتی سے کہا "تمھارا مال کبھی نہ بکے گا اور نہ تمھارے دو مہینے کبھی پورے ہونگے میں آج روپے لوں گا"

ہرناتھ اس وقت غصہ میں بھرا ہوا اُٹھا اور دو ہزار روپے لا کر چودھری کے سامنے زور سے پٹک دئے چودھری نے کچھ جھینپ کر کہا روپے تو تمھارے پاس تھے"

"اور کیا باتوں سے روزگار ہوتا ہے"

"تو اس وقت پانسو دیدو باقی دو مہینے میں دیدینا سب آج ہی تو خرچ نہ ہو جائنگے"

ہرناتھ نے تاؤ دکھا کر کہا "آپ چاہے خرچ کیجیے چاہے جمع کیجیے۔ مجھے روپے کا کام نہیں دنیا میں کیا ساہوکار مر گئے ہیں جو آپ کی دھونس سہوں"

چودھری نے روپے اٹھا کر ایک طاق میں رکھ دئے۔ کنوئیں کی داغ بیل ڈالنے کا سارا جوش خروش سرد پڑ گیا۔ ہرناتھ نے روپے تو واپس کر دئے تھے پر دل میں کچھ اور منصوبہ باندھ رکھا تھا آدھی رات کو جب گھر میں سناٹا چھا گیا تو ہرناتھ چودھری کے کمرے کی چول کھسکا کر اندر داخل ہوا۔ چودھری

بے خبر سوئے ہوئے تھے ہزناتھ نے چاہا کہ دونوں تھیلیاں اُٹھا کر باہر نکل جاؤں لیکن جوں ہی ہاتھ بڑھایا اُسے اپنے روبرو گومتی کھڑی دکھائی دی وہ دونوں تھیلیوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئی تھی ہزناتھ خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا پھر یہ سوچ کر کہ شاید مجھے دھوکا ہو رہا ہے۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھایا مگر اب کے وہ مورتی اتنی ڈراؤنی ہوگئی کہ ہزناتھ ایک لمحہ بھی وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ بھاگا مگر برآمدے ہی میں غش کھا کر گر پڑا۔

(۴)

ہزناتھ نے چاروں طرف سے اپنے روپے وصول کرکے بیوپاریوں کو دینے کے لئے جمع کر رکھے تھے۔ چودھری نے آنکھیں دکھائیں تو وہی روپے لا کر ٹیک دئے۔ دل میں اُس وقت سوچ لیا تھا رات کو روپئے اڑا لونگا جھوٹ موٹھ چور کا غل مچا دونگا۔ تو مجھ پر شبہ بھی نہ ہوگا مگر جب یہ پیش بندی ٹھیک نہ اتری تو اس پر بیوپاریوں کے تقاضے ہونے لگے۔ وعدہ پر لوگوں کو کہاں تک ٹالتا۔ جتنے حیلے ہوسکتے تھے سب ختم کئے۔ اور وہ نوبت آگئی کہ لوگ نالش کرنے کی دھمکیاں دینے لگے ایک نے تو تین سو کی نالش کربھی دی۔ بیچارے چودھری بڑی مشکل میں پھنسے۔ دکان پر ہزناتھ بیٹھتا تھا چودھری کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر اس کی جو ساکھ تھی وہ چودھری کے سبب۔ لوگ چودھری کو کھرا لین دین کا صاف آدمی سمجھتے تھے۔ گو اب بھی کوئی اُن سے تقاضا نہ کرتا تھا مگر وہ سب سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ لیکن انھوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ کنوئیں کے روپے نہ چھوؤں گا۔ چاہے کچھ بھی پیش آئے رات کو ایک بیوپاری کے ملازم نے چودھری کے دروازے پر آکر ہزاروں گالیاں سنائیں چودھری کو بار بار غصہ آتا تھا کہ چل کر اس کی مونچھ اکھاڑ لوں، دل کو سمجھایا" ہم سے مطلب ہی کیا ہے بیٹے کا قرض اُتارنا باپ کا دھرم نہیں، جب بھوجن کرنے گیا تو بیوی نے کہا یہ سب کیا ظلم مچا رکھا ہے"

چودھری نے کرخت آواز میں کہا "میں نے مچا رکھا ہے؟"

" اور کس نے مچا رکھا ہے۔ بچہ قسم کھاتا ہے کہ میرے پاس صرف تھوڑا مال ہے روپئے تو سب آپ نے مانگ لئے۔

چودھری۔" مانگ نہ لیتا تو کیا کرتا حلوائی کی دوکان پر دادا کا فاتحہ پڑھنا مجھے پسند نہیں"

بیوی۔" یہ ناک کٹائی اچھی لگتی ہے"

چودھری۔" تو میرا کیا بس ہے بھائی۔ کبھی کنواں بنے گا کہ نہیں؟ پانچ سال تو ہوگئے"

بیوی۔ "اُس وقت اس نے کچھ نہیں کھایا۔ تھوڑی ہی دیر میں منہ جھوٹا کرکے اُٹھ گیا تھا"

چودھری۔ "تم نے سمجھا کر کھلایا نہیں، دانہ پانی چھوڑ دینے سے تو روپے نہ ملیں گے۔"

بیوی۔ "تم کیوں نہیں جا کر سمجھاتے۔"

چودھری۔ "مجھے تو وہ اس وقت دشمن سمجھ رہا ہوگا۔"

بیوی۔ "میں روپے لیجا کر بچے کو دے آتی ہوں۔ ہاتھ میں جب روپے آجائیں تو کنواں بنا دینا۔"

چودھری "نہیں نہیں، ایسا غضب نہ کرنا۔ میں اتنی بڑی عہد شکنی نہ کرونگا چاہے گھر خاک ہی میں مل جائے۔"

لیکن بیوی نے ان باتوں کی طرف دھیان نہ دیا وہ لپک کر اندر گئی اور تھیلیوں پر ہاتھ ڈالنا ہی چاہتی تھی کہ ایک چیخ مار کر ہٹ گئی۔ اس کا سارا جسم ستار کے تار کے موافق کانپنے لگا۔

چودھری نے گھبرا کر پوچھا کیا ہوا کیا؟ تمھیں چکر تو نہیں آ گیا۔"

بیوی نے طاق کی طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ کر کہا "وہ چڑیل وہاں کھڑی ہے۔"

چودھری نے طاق کی طرف دیکھ کر کہا "کون چڑیل مجھے تو کوئی نظر نہیں آتی۔"

بیوی۔ "میرا تو کلیجا دھک دھک کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس بڑھیا نے ہاتھ پکڑ لیا۔"

چودھری۔ "یہ سب وہم ہے۔ بڑھیا کو انتقال کیئے پانچ سال ہوگئے اب تک یہاں بیٹھی ہے۔"

بیوی۔ "میں نے صاف دیکھا وہی تھی۔ بچہ بھی کہتا تھا کہ اس نے رات کو تھیلیوں پر ہاتھ رکھے دیکھا تھا۔"

چودھری۔ "وہ رات کو میرے کمرے میں کب آیا؟"

بیوی۔ "تم سے کچھ روپیوں کی بات کہنے آیا تھا اُسے دیکھتے ہی بھاگا۔"

چودھری۔ "اچھا پھر تو اندر جاؤ میں دیکھ رہا ہوں۔"

بیوی نے کان پر ہاتھ رکھ کر "نا بابا" اب میں اس کمرے میں قدم نہ رکھوں گی۔"

چودھری۔ "اچھا میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

چودھری نے کمرے میں جا کر دونوں تھیلیاں طاق میں سے اٹھالیں۔ کسی طرح کا شبہ نہ ہوا۔ گومتی کے سائے کا کہیں نام بھی نہ تھا بیوی دیوار پکڑی جھانک رہی تھی۔ چودھری نے آکر فخر سے کہا "مجھے تو کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں ہوتی تو کہاں جاتی۔"

بیوی۔ "کیا جانے تمھیں کیوں نہیں دکھائی دی۔ تم سے اس کو اُنس تھا اس لئے ہٹ گئی ہوگی۔"

چودھری۔ "تمھیں وہم تھا اور کچھ نہیں۔"

بیوی۔ "بچے کو بلا کر پچھوائے دیتی ہوں۔"

[illegible]

بیوی کو کچھ آرام ہوا۔ اُس نے طاق کے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا کہ زور سے چلا کر بھاگی اور صحن میں آ کر دم لی۔

چودھری بھی اس کے ساتھ صحن میں آ گیا اور تعجب سے بولا" کیا تھا کیا؟ فضول بھاگی چلی آئی۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہ دیا۔" بیوی نے ہانپتے ہوئے حقارت آمیز آواز میں کہا" چلو ہٹو اب تک تو تم نے میری جان ہی لے لی تھی نہ معلوم تمھاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کھڑی تو ہے وہ موئی!"

اتنے میں ہزاماتھ بھی وہاں آ گیا ماں کو صحن میں پڑے دیکھ کر بولا" کیا ہے اماں کیسی طبیعت ہے۔"

بیوی۔" وہ چڑیل آج دو دفعہ دکھائی دی بیٹا! میں نے کہا لاؤ تمھیں روپے دیدوں پھر جب ہاتھ میں آجائینگے تو کنواں بنوا دیا جائے گا۔ لیکن جوں ہی تھیلیوں پر ہاتھ رکھا اس چڑیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا دم سا نکل گیا۔"

ہزاماتھ نے کہا" کسی اچھے عامل کو بلانا چاہیئے جو اسے مار بھگائے۔"

چودھری۔" کیا رات کو تمھیں بھی دکھائی دی تھی؟"

ہزاماتھ" ہاں میں تمھارے پاس ایک معاملہ میں صلاح کرنے آیا تھا جوں ہی اندر قدم رکھا وہ چڑیل طاق کے پاس کھڑی دکھائی دی، میں بدحواس ہو کر بھاگا۔"

چودھری۔" اچھا پھر تو جاؤ۔"

بیوی۔" کون؟ اب تو میں نہ جانے دوں چاہے کوئی لاکھ روپے دے۔"

ہزاماتھ" میں اب نہ جاؤں گا۔"

چودھری" مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات کیا ہے۔"

ہزاماتھ" کیا معلوم آپ سے ڈرتی ہو گی۔ آج کسی عامل کو بلانا چاہیئے۔"

چودھری۔" کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ماجرا ہے کیا ہوا۔ بیجو پانڈے کی ڈگری کا؟"

ہزاماتھ ان دنوں چودھری سے اتنا جلتا تھا کہ اپنی دوکان کے بارے میں کوئی بات ان سے نہ کہتا تھا صحن کی طرف تاکتا ہوا گویا ہوا ایں بولا۔" جو ہونا ہو گا وہ ہو گا۔ میری جان کے سوا اور کوئی کیا لے گا جو کھا گیا ہوں وہ تو اُگل نہیں سکتا۔"

چودھری" کہیں اس نے ڈگری جاری کر دی تو؟"

ہزاماتھ" تو کیا دوکان نیلام ہو جائے گی، چار پانچ سو کا مال ہے نیلام ہو جائے گا۔"

چودھری۔" کاروبار سب چوپٹ ہو جائے گا۔"

ہزاماتھ۔" اب کاروبار کے نام کو کہاں تک روؤں اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ کنواں بنوانے کی اتنی جلدی ہے

تو یہ کام چھیڑتا ہی کیوں۔ روٹی دال تو پہلے بھی مل جاتی تھی۔ بہت ہوگا دو چار مہینے حوالات میں رہنا پڑے گا۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

ماں نے کہا "جو تمھیں حوالات میں لیجائے اس کا منہ جھلس دوں۔ ہمارے جیتے جی تم حوالات میں جاؤ گے۔"

ہرناتھ نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ "ماں باپ جنم کے ساتھی ہوتے ہیں۔ کسی کرم کے ساتھی نہیں ہوتے۔"

چودھری کو بیٹے سے بے حد محبت تھی انھیں یقین ہوگیا تھا کہ ہرناتھ روپے ہضم کرنے کے لئے ٹال مٹول کر رہا ہے اسی لئے انھوں نے جلدی کر کے روپے وصول کر لئے تھے اب انھیں یقین آیا کہ ہرناتھ کی جان سچ مچ ضیق میں ہے خیال کیا "اگر لڑکے کو حوالات ہوگئی یا دوکان پر قرقی آگئی تو آبرو خاک میں مل جائے گی۔ کیا ہرج اگر گومتی کے روپے دیدوں۔ آخر دوکان چلتی ہی ہے کبھی نہ کبھی تو روپے ہاتھ میں آویں گے۔"

یکایک کسی نے باہر سے پکارا "ہرناتھ سنگھ"۔ ہرناتھ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ چودھری نے پوچھا کون ہے؟

"قرق امین"

"کیا دوکان قرق کرنے آیا ہے۔"

"ہاں معلوم ہوتا ہے۔"

"کتنے روپیوں کی ڈگری ہے۔"

"بارہ سو کی"

"قرق امین کچھ لینے دینے سے نہ ٹلے گا۔"

"ٹل تو جاتا مگر ساہوکار بھی تو اس کے ساتھ ہوگا۔ اسے جو کچھ لینا ہے ادھر سے لے چکا ہوگا۔"

"ورنہ بارہ سو گومتی کے روپیوں میں سے دے دو۔"

"اس کے روپے کون چھپائے گا نہ جانے گھر پر کیا آفت آوے۔"

"اس کے روپے کوئی ہضم تھوڑا ہی کئے لیتا ہے چلو میں دیدوں۔"

چودھری کو اس وقت خوف ہوا کہیں مجھے بھی وہ دکھائی دے لیکن ان کو معمولی شبہ تھا انھوں نے ایک تھیلی سے دو سو نکالے اور دوسری تھیلی میں رکھ کر ہرناتھ کو دے دئے۔

شام تک ان دو ہزار میں ایک روپیہ بھی نہ بچا۔

(۵)

بارہ سال گزر گئے نہ چودھری اب اس دنیا میں ہے نہ ہرناتھ۔ چودھری جب تک زندہ رہا انھیں کنوئیں کی فکر دامنگیر رہی یہاں تک کہ مرتے دم بھی ان کی زبان پر کنوئیں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ لیکن دوکان میں ہمیشہ

روپیوں کا توڑا رہا۔ چودھری کے مرتے ہی سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ ہرنامتھ نے آنے روپے کے نفع پر قناعت نہ کر کے دو گنے تگنے نفع پر ہاتھ مارا۔ جوا کھیلنا شروع کیا۔ سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ دکان نیلام ہو گئی گہنے پاتے برتن بھانڈے سب خاک میں مل گئے۔ چودھری کے انتقال کے ٹھیک سال بھر بعد ہرنامتھ نے بھی اس نفع نقصان کی دنیا سے سدھارا۔ ماں کی زندگی کا اب کوئی سہارا نہ رہا۔ بیمار پڑی مگر دوا درمن نہ ہو سکی۔ تین چار مہینے تک مختلف طور پر مصیبت جھیل کر وہ بھی چل بسی۔ اب صرف اسکی بہو تھی اور وہ بھی حاملہ۔ اس بیچاری کے لئے اب کوئی سہارا نہ تھا۔ اس حالت میں مزدوری بھی نہ کر سکتی تھی۔ پڑوسنوں کے کپڑے سی سی کر اُس نے کسی طرح پانچ چھ مہینے کاٹے۔ پڑوسنیں کہتی تھیں تیرے لڑکا ہوگا۔ سارے آثار لڑکے کے تھے۔ یہی ایک زندگی کا سہارا تھا لیکن جب لڑکی ہو گئی تو یہ سہارا بھی جاتا رہا۔ ماں نے اپنا دل سخت کر لیا کہ نوزائیدہ بچہ کو چھاتی سے بھی نہ لگاتی تھی۔ پڑوسنوں کے بہت سمجھانے بجھانے پر چھاتی سے لگایا مگر اس کی چھاتی میں دودھ کی ایک بوند نہ تھی اس وقت بدنصیب ماں کے دل میں ہمدردی شفقت اور محبت کا ایک زلزلہ آ گیا۔ اگر کسی تدبیر سے اسکی پستان کی آخری بوند دودھ بن جاتی تو وہ اپنے کو نصیبے والی سمجھتی۔

بچی کی وہ بھولی بھالی حسرتناک اور ارمان بھری صورت دیکھ کر اُس کا مادری دل ہزار آنکھوں سے آنسو بہانے لگا تھا۔

اس بچی کی قسمت میں ماں کی محبت کے سکھ نہیں بدے تھے ماں نے کچھ اپنا دودھ اور کچھ اوپر کا دودھ پلا کر اُسے پرورش کیا مگر اُس کی حالت دن بدن گھٹتی جاتی تھی۔ ایک دن لوگوں نے جا کر دیکھا تو وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی اور بچی اس کی چھاتی سے چمٹی اس کے سر پستان کو چوس رہی تھی غم اور شکستہ حالی سے مجروح بدن اس کے خون کے ٹکڑے کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔

وہی بچی پڑوسیوں کی دیا بھکشا سے پل کر ایک دن گھاس کھودتی ہوئی اس جگہ جا پہنچی جہاں بڑھیا گومتی کا گھر تھا۔ چھپر کب کے پنچ بھوتوں میں مل چکے تھے صرف اِدھر اُدھر دیواروں کے نشان باقی تھے کہیں کہیں آدھی آدھی دیواریں کھڑی تھیں بچی نے نہ جانے کیا خیال کر کے کھرپی سے گڑھا کھودنا شروع کیا دوپہر سے شام تک وہ گڑھا کھودتی رہی۔ نہ کھانے کی سُدھ تھی نہ پانی کی نہ کوئی وہم تھا۔ نہ ڈر اندھیرا ہو گیا مگر وہ جوں کی توں بیٹھی گڑھا کھود رہی تھی۔ اس وقت کسان لوگ بھول کر بھی اُدھر سے نہ گزرتے تھے مگر بچی بے خوفی سے بیٹھی زمین سے مٹی نکال رہی تھی جب اندھیرا ہو گیا تو وہ چلی گئی۔ دوسرے دن وہ بڑے سویرے اُٹھی اور اتنی گھاس کھودی جتنی وہ کبھی دن بھر میں بھی نہ کھودی تھی دوپہر کے بعد وہ اپنی ٹوکری اور کھرپی لئے پھر اُسی مقام پر پہنچی مگر آج وہ تنہا نہ تھی اس کے ساتھ دو بچے اور بھی تھے تینوں وہاں شام تک۔ کنواں

کنواں کھیلتے رہے۔ بچی گڑھے کے اندر کھودتی تھی اور دونوں بچے مٹی نکال کر پھینکتے تھے۔

تیسرے دن دو لڑکے اور بھی اس کھیل میں مل گئے۔ شام تک کھیل ہوتا رہا آج گڑھا دو ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے بچوں اور بچیوں میں اس عجیب کھیل نے ناپائدار شوق پیدا کر دیا تھا۔

چوتھے دن اور بھی کئی لڑکے آ ملے۔ صلاح ہوئی کون اندر جائے کون مٹی اٹھائے۔ کون ٹوکری بنائے گڑھا اب چار ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ مگر ابھی تک لڑکوں کے سوا اور کسی کو اسکی خبر نہ تھی۔

ایک دن رات کو ایک کسان اپنی کھوئی ہوئی بھینس ڈھونڈھتا ہوا اس کھنڈر میں جا نکلا۔ اندر مٹی کا اونچا ڈھیر، ایک بڑا سا گڑھا اور ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ دیکھا تو ڈر کر بھاگا اوروں نے بھی آ کر دیکھا کئی آدمی تھے کوئی ڈر کی بات نہ تھی قریب جا کر دیکھا تو۔ بچی بیٹھی تھی ایک آدمی نے پوچھا۔

"ارے کیا تو نے یہ گڑھا کھودا ہے؟" بچی نے کہا۔ "ہاں"

"گڑھا کھود کر کیا کرو گی"

"یہاں کنواں بناؤنگی"

"کنواں کیسے بناؤ گی؟"

"جیسے اتنا کھودا ہے ویسے ہی اور کھودلونگی۔ گاؤں کے سب لڑکے کھیلنے آتے ہیں"

"معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی جان دیگی اور اپنے ساتھ اور لڑکوں کو بھی مارے گی خبردار جو کل سے گڑھا کھودا۔

دوسرے دن اور لڑکے نہ آئے۔ بچی بھی دن بھر مزدوری کرتی رہی لیکن شام کے وقت وہاں پھر چراغ جلا اور پھر وہ کھرپی ہاتھ میں لئے وہاں بیٹھی دکھائی دی۔ گاؤں والوں نے اسے مارا پیٹا کمرے میں بند کیا مگر وہ موقع پاتے ہی وہاں جا پہنچتی۔

گاؤں کے لوگ اکثر سادہ لوح ہوتے ہی ہیں بچی کی اس غیر مانوس محبت نے آخر ان میں بھی محبت پیدا کی کنواں کھدنے لگا۔

ادھر کنواں کھد رہا تھا۔ ادھر بچی مٹی سے اینٹیں بناتی تھی اس کھیل میں سارے گاؤں کے لڑکے شریک ہوئے تھے۔ چاندنی راتوں میں جب لوگ سو جاتے تب بھی وہ اینٹیں تھاپتی دکھائی دیتی تھی نہ جانے اتنی لگن اسمیں کہاں سے آ گئی تھی۔ سات برس کی عمر کوئی عمر ہوتی ہے لیکن سات برس کی وہ لڑکی تھی وہ بات چیت میں اپنے بڑی عمر والوں کے کان کاٹتی تھی آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ کنواں بن گیا اور اسکا پکا پشتہ تیار ہو گیا اس دن بچی اس پشتہ پر سوئی آج اسکی خوشی کی انتہا نہ تھی گاتی تھی چہکتی تھی اس پشتہ پر صرف اسکی نعش ملی۔ اس دن سے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ وہی بڑھیا گومتی تھی اس کنویں کا نام **پنہاری کا کنواں** پڑا۔ (ماخوذ)

"کہنے والے کہتے ہیں کہ "اردو شاعری کو گل و بلبل، حسن و عشق، اور کنگھی چوٹی کے فرسودہ پامال اور مصنوعی مضامین و مطالب کی بھول بھلیاں سے نکال کر اردو زبان کے اندر نیچرل شاعری کے بانی مبانی آزاد صاحب آب حیات ہیں"۔ اسکی ابتدا (۸ مئی ۱۸۷۴ء) ڈاکٹر لائٹنر کے مشاعرے سے شروع کیجاتی ہے اور آزاد کی "ہوائے ممتاز" والی مثنوی کو مزے لے لے کر سناتے ہیں ممکن ہے کہ یہ "جدید شاعری" کی تحقیقات میں صحیح ہو لیکن ہماری یہاں تو قدیم سے کیفیات گوناگون عالم اور مناظر قدرت پر اردو شاعروں کی قدرت چلے آرہی ہے یہ اور بات ہے کہ شلی کی نظم بادل (CLOUD) اور کیٹس کی نظم (ODE TO AUTUMN) سا کیف اس حبت و جو جدید میں نظر نہ آئے!

(عمر یافعی)

عجب برسات کی ہی فصل پیاری — کہ جس کا فیض ہی عالم میں جاری

لکھوں کس رنگ سے تعریف اُس کی — کہ کاغذ خود بخود ہوتا ہی ابری

اگر صفحہ پہ کھینچوں جدول سیم — رواں ہوتی ہی مثل جوئے تسنیم

ہر اک نقطہ سے قطرہ ہووے پیدا — بنے ہر سطر اشک موج دریا

حروف عین و غین از قاف تا قاف — ہیں وہ آل ابرو عین چشمۂ صاف

کوئی اب شعر کہہ سکتا کہاں ہے — کہ ہر اک بحر دریائے رواں ہی

رقم ہووے اگر مضموں بہ دشوار — ڈبو دیوے سفینہ بحر اشعار

پہونچنا کیونکہ ہووے تا بہ منزل — سیاہی سے قلم ہی پائے در گل

مگر یہ خامۂ مژگانِ پُرنم — بزنگ ناؤ واں جاری ہی ہر دم

لکھوں جو زرق و برق اُس کی بجا ہو — کہ بہتر موسم ابر و ہوا ہی

ہجوم ابر کا ہے اس قدر جوش   کہ ہے خورشید بھی عالم سے روپوش
یہ طوفاں آب کا از غرب تا شرق   مہ نو کی بھی کشتی ہو گئی غرق
تلاطم بس کہ تا چرخ بریں ہے   نہنگ کہکشاں بھی تہ نشیں ہے
عروج آب کا اتنا ہے طوفاں   پھریں بہتے بروج حوت و سرطاں
گذر قوس قزح سے بے تامل   فلک پر بھی بندھا ہے اندنوں پل
نہیں یہ برق اب چمکی ہے ناگاہ   دل مجنوں کی آتش ریز ہے آہ
شرار تیشۂ فرہاد یا ہے   کہ جس نے بے ستوں کو شق کیا ہے
اگر ابر سیاہ (و) کوہ و ہامون   نہیں ہے دود آہ اشک مجنوں
فراہم پنبۂ داغ جگر کر   سراسر قیس نے پھینکا ہوا پر
نہیں ہے گر شب تیرہ سیہ پوش   سویدائے دل مجنوں کا ہے جوش
سیہ خیمہ ہے لیلی عرب کا   سواد وادی عالم ہے برپا
ہوی قوس قزح از بس کہ زہ گیر   برستے ہیں عجب قطرات کے تیر
نہ کیجے شور رعد و برق کی پے   کہیں دونوں کی آپس میں چھڑی ہے
شفق ابر سیہ میں نیں ہے غلطاں   ملا ہے خاک میں خون شہیداں
نہ گرم دو ہرخ کی اب تو ہو درپے   نشانی دست فندق بند کی ہے
جہاں کیجے ہیچ آتش کی نشانی   اگر ڈھونڈو تو اب مشکل ہے پانی
تنور گرم سے طوفاں کا ہے جوش   ہوی آتش برنگ لعل خاموش
ہے آتش سنگ میں بھی بس کہ نایاب   شرر کی جاے نکلے قطرۂ آب
سمندر کی یہ سنتے ہیں زبانی   "ہوا جاتا ہوں میں بھی پانی پانی"
یہ دشت و بر میں بارش کا اثر ہے   کہ خار خشک بھی مژگان تر ہے
خط جادہ ہے از بس رود پر آب   ہوا ہر نقش پا مانند گرداب
زمیں اوپر شہرتا سنگ ہے کب   شناور ہے بیابان سنگ پشت آب
زمیں گیری محال از بس ہوئی ہے   پرندے پھرتی ہے ترتے اب بطاے
حباب اب جا بجا مت بوجھ ترتے   سبھے مرغابی کے انڈے ہیں پھرتے
تموج میں ہے از بس آب گوہر   صدف مثل حباب اب ہے شناور

جہاں شمشیر میں جوہر عیاں ہے　　برنگ سبزہ و آب رواں ہے
طراوت اتنی ہے طوفاں کی درپے　　کہ نقش بوریا بھی موج زن ہے
تموج آب کا ہے تا با فلاک　　پھرے خط شعاعی مثل خاشاک
ہوا کا باد پائے برق آہنگ　　جلو ریزی میں ابرش[۱] کے رکھے ڈھنگ
زبس فیل سحاب اب قطرہ زن ہے　　کچاک کی شکل ہر شاخ چمن ہے
لب جو پر ہیں نخل ازبس کہ نایاب　　بجائے سرو ہیں فوارۂ آب
ہر اک غنچہ سمن کا شبنم تر　　ٹپکتا موتیا سے آب گوہر
بجائے بید مجنوں ہر مکاں میں　　ہوئی قوس قزح پیدا جہاں میں
ہوا اب شعلۂ آتش گل تر　　بجائے دود پیدا سنبل تر
یہ ہے انگشت و اخگر کا حوالہ　　مطرا ہے برنگ داغ لالہ
ترشح میں ہے ازبس ابر تصویر　　چمن نقاش کا ہے رشک کشمیر
عجب نیرنگ کی نشو و نما ہے　　پر طاؤس داماں ہوا ہے
زمیں سے تا فلک مت سرسری دیکھ　　بہار عالم نیلوفری دیکھ
یکا یک برق جب کڑکے ہے بے باک　　دھمک جاوے حصار ہفت افلاک
یہ ہے بادل گرجنے سے علامت　　کہ آئے شور میں صور قیامت
نہیں جگنو چمکتے ہیں یہ سارے　　پڑے افلاک سے ہیں ٹوٹ تارے
شب تاریک میں یوں شمع ہے گم　　کہ جیسے دیدۂ آہو میں مردم
ہے سیل شمع سے بھی یہ خرابی　　بنی فانوس کی صورت حبابی
یہ طوفاں اب ہے میخانے کے اندر　　کہ منبع آبگینہ حوض ساغر
ہے زہد خشک کا ابتر یہ اسباب　　عصا فوارہ و تسبیح دولاب
نہ کیجو سر پہ اپنے تو عبث جبر　　کہ بارانی ہے دریا بار جوں ابر
سمجھ اس فصل سے گر آشنا ہے　　کہ جوں عکس آئینہ جانے شنا ہے
بیاں ہووے نہ کیفیت کما ہی　　ہے جوشش آب از مہ تا بماہی
حباب آسا زمانہ کا ہے اسباب　　زمیں تا آسماں اک عالم آب
ادھر لا کشتی مئے جلد ساقی!　　جہاں کے ڈوبنے میں کیا ہے باقی

[۱] گھوڑے کی ایک قسم کا نام

مجھے جانا ہے اُس خورشید رو تک
عروسک جس کے فندق کی کنیز تک

نظر میری طرف تیری کہاں ہے
مری ہر اک پلک اب ناوداں ہے

ندی نالوں نے فرصت رات مجھ کو
ستاتی ہے نپٹ برسات مجھ کو

اُدھر اک بار بجلی کا کڑکنا
غضب ایدھر مرے دل کا دھڑکنا

عذاب ہجر سے کیوں کر ہوں سر بر
مجھے قوس قزح آرہ ہے سر پر

عجب طوفان پر ہے ابر مژگاں
نگہ میری ہے برق خرمن جاں

نمونہ برج آبی چشم کا ہے
کہ سیل اشک بھی اک ماجرا ہے

سنے جو کوئی اس کو لوٹ جاوے
سرشک چشم سے دریا بہاوے

یہ رُت بدلی ہے جب سے جی گھٹا ہے
کہ وہ خورشید رو مجھ سے جدا ہے

اندھاری رات ساون کی ڈراوے
ادھر بجلی جدی آنکھیں دکھاوے

کبھو مارے ہے چشمک برق سے ابر
کبھی غرّاں ہے رعد تند جوں ببر

عجب اک کش مکش کے دام میں ہوں
کہ اک دم بھی نہیں آرام میں ہوں

اُدھر بادل طرف جنگل کے اینچے
اِدھر بجلی جدی تلوار کھینچے

سنو پی پی پپیہا کی جب آواز
کرے ہے مرغ جاں قالب سے پرواز

شتابی آ کہیں اس وقت ساقی
تری اس سرد مہری نے لیا جی

پھروں ہوں چرخ ڈانواڈول ہوئے
کہ عقل اس چاہ میں اب باؤلی ہے

عجب آئی ہے فصل برشگالی
نہیں ہے موج سے کوئی بھی خالی

رواں نہریں ہیں اور سبزہ ہے گہرا
چمن سے لے کے تا دامان صحرا

کسی جا ناچتے بن بن کے ہیں مور
کسی جا کو کلا کوئل کا ہے شور

جدھر دیکھو اُدھر اب کیا کہوں ہیں
ہنڈولوں پر پری رو جھولتے ہیں

نظر اُس پینگ میں وہ حسن کب آئے
ہوا پر ایک بجلی سی چمک جائے

حنائی دست و پا زیور طلائی
شفق ہے جوں کرن کی روشنائی

قیامت ہے اگر حسن دلاویز
غضب آواز شیریں شور انگیز

کہیں ساون کی ہے آواز دلکش
فرشتے کو سُنے سے جیسے ہو غش

کہیں ٹھمری کسی جا دادرا ہے
کہ ٹک سُنتے ہی جس کے جی ہوا ہے

پری رو ہر مکاں میں ہو کے اک جمع
برنگ صحبت پروانہ و شمع

کریں باہم دگر آب گرم جوشی
مہیا سب ہی بزم بادہ نوشی

جہاں میں جا بجا ہی راگ اور رنگ
جسے دیکھو تو اب ہے عیش آہنگ

رکھے ہی ایک مجھ سے جنگ یاراں
کرے ہی دل پہ میرے سنگ باراں

رکھے کب تک مری کشتی تباہی
مجھے دے وصل کی دولت الٰہی

سدا میرے رہے وہ سیم بر ساتھ
بالفت لب بلب اور ہات میں ہاتھ

شراب عیش کا جام و سبو بخش
ترا بندہ ہوں مجھ کو آبرو بخش

جہاں میں جب تلک ابر و ہوا ہے
یہی ایمان کی یارب دعا ہے

یہ سب جوش و خروش ابر باراں
مبارک ہو یہ جمع میگساراں

وہ میرا مہرباں اور میں ہر اک دم
رہیں ابر و ہوا کی طرح باہم

غزل

(جناب ظفر تاباں پروفیسر رامجس کالج دہلی)

لاکھ بیداد پہ بھی شکوۂ بیداد نہیں
یہ زباں وہ ہی جسے آہ و فغاں یاد نہیں

اک دلِ درد رسیدہ ہوں تلاطم بکنار
اک لبِ یاس ہوں جس پر کوئی فریاد نہیں

اپنی ناکامیِ قسمت کا گلہ کرتا ہوں
تری بیداد کا شکوہ ستم ایجاد نہیں

تپشِ حسن کا ہر شئے پہ اثر ہوتا ہی
جلوۂ ہوش ربا طور کو کیا یاد نہیں

ایک ہستی ہے یہ صد رنگ تماشا فرما
اے دلِ زار یہ ہنگامۂ ایجاد نہیں

غور سے دیکھیے یہ دنیا ہے سراسر ویراں
جس کو آباد سمجھتے ہو وہ آباد نہیں

امتحانِ دلِ ارباب وفا ہی منظور
ورنہ واقف ہوں کہ وہ خوگرِ بیداد نہیں

خوگرِ جور ہوں غم وجہ دل آرامی ہی
مرے حق میں تری بیداد بھی بیداد نہیں

وہ ہوا دست کشِ ظلم و ستم وائے نصیب
یہ سمجھتا ہی مجھے حسرتِ بیداد نہیں

بیخودی ہائے محبت کا تماشا تاباں
عہدِ تسلیم ستم بھول گیا یاد نہیں

تنقید و تبصرہ

صراط الحمید مولفہ جناب الحاج محمد الیاس برنی صاحب چشتی القادری ایم اے ال ال بی (علیگ) پروفیسر معاشیات کلیہ جامعہ عثمانیہ صفحات ۴۲۴ تقطیع $\frac{22\times36}{16}$ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ چکنے کاغذ پر (۱۳) مقدس مقامات کی عکسی تصاویر کے ساتھ پاک صاف کتابت اور طباعت قیمت عہ/۳ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

پروفیسر الیاس برنی کا نام علمی دنیا سے نامانوس نہیں۔ منتخبات نظم اردو کے طویل سلسلے (معارف ملت جذبات فطرت، مناظر قدرت) مرتب کرکے اور علم المعیشت لکھ کر آپ اردو مصنفین میں اپنی جگہ قائم کر چکے ہیں زیر نظر کتاب برنی صاحب کا وہ سفرنامہ ہے جو آپ نے مقامات متبرکہ کی زیارت سے واپس لوٹنے کے بعد لکھا ہے۔ سفرنامے عموماً دلچسپ مطالعہ کے سرمایہ دار ہوتے ہیں گو وہ اہم امور سے بالکل خالی بھی نہ ہوں معلومات میں ان سے اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دماغی تفریح کا سامان بھی وافر ان میں موجود رہتا ہے سفرنامہ کی دلچسپی اور اہمیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مصنف اس میں اپنے چشم دید واقعات اپنے خاص نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ مصنف کی حالت سفرنامے میں ایک آپ بیتی ناول کے ہیرو کی سی بھی ہوتی ہے جو اپنی مہمات اور اپنے تاثرات کا ہر جگہ ذکر کرتا چلا جاتا ہے یہ آخری چیزیں ہیں جو سفرنامے کو سندباد جہازی کے قصے سے کچھ کم دلچسپ نہیں بنا دیتیں۔

صراط الحمید میں ایک سفرنامے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ سفر کی تیاری سے لیکر روانگی از ہندوستان تا عراق، شام، فلسطین، حجاز، بیت المقدس، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ تک جانے اور آنے کے واقعات نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ سفر حج کے بیان میں ایک اور خوبی یہ ہونی ضروری تھی کہ دنیوی افادی پہلو کے ساتھ دینی اور روحانیت کا پہلو بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ برنی صاحب نے اس کا خاص طور سے لحاظ رکھا ہے تمام ضروری ارکان، حج ادعیہ اور تجربات سفر کا ذکر اپنے عادتی دلچسپ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس متبرک سرزمین کے عازمین سفر کیلئے یہ سفرنامہ صراط الحمید کا رہنما ہے۔ مصنف کے تیز مشاہدے نے دوران سفر کے تمام جزئی امور کو بھی اپنے احاطے میں داخل کرلیا ہے جہاز کے حالات ریل موٹر اور اونٹوں کے سفر میں گذرتے ہوئے مناظر قدرت خصوصاً دمشق۔ حیفہ۔ قنطرہ۔ سویز کے پرکیف مناظر سے بھی قارئین کی تواضع کرتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے احساسات اور تاثرات کی جھلک بھی بعض اداروں اور رواجات پر ہلکی تنقید کرتے ہوئے دکھائی ہے۔ بصرہ اور محمرہ کے اہلکاران محکمہ کروڑگیری کی چیرہ دستیاں، حکومت حجاز کی خوبیاں اور خرابیاں عمدگی سے بیان کی ہیں۔ جیسے ابھی بیان ہوا ہے اسلوب بیان برنی صاحب کا عادتاً شگفتہ اور سلیس ہے۔ موقع بہ موقع اشعار کی "آمد" مولف کی شعر دوستی کا ثبوت دیتی ہے قرآن مجید کی آیات اور ادعیہ بھی بلا تکلف سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر ان مقامات میں عربی جملوں کے معنی بھی لکھنے کی تکلیف گوارا کیجاتی۔ مجموعی حیثیت سے سفرنامہ معلومات میں اضافہ کرنے والا علم ہے اسلوب کی شگفتگی اور واقعات کی دلچسپی "چہار درویش" کے قصے کے مطالعے کیلئے کم نہیں۔

معلومات

عہد فراعنہ سے جنگ عظمیٰ تک کے مقتولین کی تعداد فرانس کا ایک اخبار کو تدریان لکھتا ہے کہ کامل فدر ماریوس نے جو فلکیات کا بڑا عالم ہے ان تمام مقتولین کی اوسط نکالی ہے جو اقسام کی لڑائیوں میں عہد فراعنہ سے اخیر جنگ عظمیٰ تک قتل ہوئے ہیں مقتولین کی تعداد ایک قرن میں چالیس ملین ہوتی ہے اس حساب سے فی منٹ ایک آدمی ہوتا ہے یا گزشتہ تیس قرون میں مقتولین کی تعداد (۱۲۰۰) ملین ہوتی ہے۔ اگر ان کا خون جمع کیا جائے تو (۱۸) ملین میٹر مکعب قطر کو پُر کر سکتا ہے اگر ان کی کھوپریاں یکے بعد دیگرے ملا کر جائی جائیں تو ان کا طول (۵۰,۰۰۰) فرسخ ہوگا یعنے اس مسافت کا چگنا ہوگا جو چاند اور زمین کے مابین ہے اگر ان کھوپریوں کی تسبیح بنائی جائے تو کرہ ارض سے چھ گنا زیادہ بڑی ہوگی۔

یورپ میں خودکشی کے اموات ہر سال بحساب فی لاکھ:-

ہنگری (۲۶) جرمنی (۲۳) فرانس (۱۷) انگلستان (۱۰) ہسپانیہ (۴) اٹلی (۸) ہالینڈ (۶) ڈنمارک (۱۵) سویڈن (۱۵)

گزشتہ سال یورپ میں خودکشی کی (۵۰,۰۰۰) وارداتیں ہوئیں۔ اس قسم کی وارداتیں انہی اقوام میں زیادہ ہیں جو جنگ عظیم میں شکست کھائی ہیں اس وقت صرف ہسپانیہ میں خودکشی کی واردات بہت ہی کم ہے یعنی سال میں فی لاکھ چار آدمی اس کے بعد ہالینڈ اور پھر اٹلی کا درجہ ہے زیادہ وارداتیں ہنگری میں ہوتی ہیں یعنی ہر سال فی لاکھ ۲۶ آدمی۔

پولس کیلئے نوایجاد برقی روشنی شہر باتھ (انگلستان) میں جو پولس کے جوان سڑکوں پر موٹروں کی آمد و رفت کے انتظام کے واسطے مقرر ہیں اُن کی ٹوپیوں کے اوپر ایک برقی روشنی لگائی گئی ہے جسکی بیاٹری ان کی کمر کی پیٹی میں لگی ہوئی ہے یہ اس واسطے کہ بعض بے تحاشا موٹر چلانے والوں کو تاریک سے تاریک رات میں بھی پولس والے نظر آتے رہیں اور کچلنے سے محفوظ رہیں۔

دنیا کا سب سے زیادہ ساکت کمرہ جامعہ اٹرکٹ ہالینڈ کی عمارت میں ایک کمرہ ایسا بنایا گیا ہے جس میں انتہائی ممکنہ سکوت پایا جاتا ہے اس کمرے کا سکوت قریب قریب ایسا ہی کامل ہے جیسے کسی غیر آباد پہاڑ کی چوٹی اس میں جو آلات لگائے گئے ہیں وہ باہر کی آواز سے متحرک ہو جاتے ہیں اور جو شخص اندر موجود ہو اس کو نہیں سن سکتا اس کمرے کی ساخت بالکل اسی اصول پر مبنی ہے جیسے تھرماس (برف رکھنے کا شیشہ) یہ کمرہ ایک بڑے کمرے کے اندر بنایا گیا ہے اور دونوں دیواروں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس میں سے ہوا خارج کردی گئی ہے۔ خود دیواریں تین سیسہ، لکڑی اور فلٹ کی تہوں سے بنائی گئی ہیں اور سارا کمرہ ستونوں پر قائم ہے جو کنکریٹ لکڑی اور گھوڑے کے بالوں سے بنایا گیا ہے۔

افتخار الحکماء نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطباء فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفاء کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔ (برص منتشر یعنے کوڑھ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے حکیم مولوی محمد عبد القادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دار التشخیص و انجمن اطباء یونانی حیدر آباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مرضاء برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے۔ میں نے بچشم خود مرضاء برص کا معائنہ کیا ہے بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے یہ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ (شرح دستخط افتخار الحکماء حاذق جنگ مرحوم)

انگریزی دواخانہ
جیمس اینڈ کمپنی
اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن
JAMES & Co
VEGETOL BALM
ویجیٹبل بام
جہاں سب دن رات دوا ملسکتی ہی۔ ماہر شخص کی نگرانی میں نسخہ تیار ہوتا ہی آپکی ضرورت پر فوری امداد ملتی ہی بلدہ کے علاوہ اضلاع پر بھی دوائیں احتیاط سے روانہ کیجاتی ہیں ہمارا تیار کردہ شربت سار میں مقوی اور گرما میں مفرح اس دکان کی نمایاں کارگزاری ہے مرکب خاص ادویہ کا ذخیرہ موجود ہی
ویجیٹبل بام گھر کا ڈاکٹر ہی بیگم صاحب کا معتمد۔ بچوں کیلئے آرام دہ بلا ضرر متعدد امراض میں فوری فائدہ دیتا ہی کس گھر میں سمجھو نہیں؟ کس کو سردی نہیں ہوتی؟ کون ہی جو دردسے لاچار نہیں اسکا استعمال خود ثابت کریگا ہر جگہ لیجیے
ہا! ہو ہو!! ار ر ار ار!!! بھری مجلس میں جوتا کھولنا کس قدر معیوب ہی۔ شریفوں کا دل خفا ہوتا ہی سنئے علاج اپنے پاؤں کے تکلیف دہ گٹھے دور کرنے کے لئے دوا طلب کیجئے۔
داد داد زنگشن تکلیف دہ اور علاج نہیں لیکن دوستوں کیلئے کریہ منظر ضرور ہی اسکے لئے ہماری تیار کردہ دوا زنگشن بہت لاجواب ہے
جیمس سرپ ویجیٹبل بام۔ گٹھوں کی دوا۔ زنگشن اور دوسری ادویات پتہ بالا سے طلب کیجئے۔
برکات عثمانیہ
مولفہ عالیجناب سید عبدالرزاق صاحب ایم ایس سی آئی
ڈاکٹری ادویۂ جدیدہ کا مبسوط و مکمل سائکلوپیڈیا
اردو زبان میں ایسی ضخیم کتاب اب تک نہیں لکھی گئی ہے جس سے عصر جدید کے اُن تمام کیمیائی نباتی جمادی اور پیٹنٹ ادویہ کی کیفیت تحریر ہو جن کو حکماء یورپ و امریکہ نے گزشتہ صدی کے نصف آخر میں تحقیق و تیار کیا ہے ہر دوا کے بیان میں اس کی ماہیت ترکیبی اجزا افعال و خواص طریق استعمال مقدار خوراک اور اسی قبیل کے دیگر متعلقات اور ہزارہا ڈاکٹری اصطلاحات کے طبی مترادفات تفصیل کے ساتھ مرقوم ہیں مزید حالات کیلئے مفصل اشتہار مفت طلب فرمالیجئے قیمت فی جلد مجلد سہ کلدار یا سے حالی اور بلا جلد لے کلدار یا سہ حالی علاوہ محصول ڈاک۔
ملنے کا پتہ سید عبدالرزاق اینڈ کمپنی کیمسٹ خاص چار کمان حیدرآباد دکن

دکن کی صحافت میں ایک نئے اخبار کا اضافہ
یعنی
روزنامہ
صبح دکن
زیر ادارت
مولوی احمد عارف صاحب
بہترین اسٹاف اور معقول سرمایہ کے ساتھ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۷ھ
م ۲۰ مہر سنہ ۱۳۳۷ ف سے جاری ہو جائیگا
انتظار کیجیے
منیجر صبح دکن - حیدرآباد دکن

مطبوعات مکتبہ

علمی و ادبی کتابیں

دکن میں اردو۔ مولفہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل اس کتاب میں جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ اور قطب شاہی اور عادل شاہی اور آصف جاہی دور میں اس ونظم ونثر کی کیفیت اور ہر دور کے شعرا کے جستہ جستہ حالات کے ساتھ ان کا نمونہ کلام پیش کرکے اردو زبان کا ارتقاء دکھلایا گیا ہے ضخامت ۴۸۰ صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

خیابان اردو مرتبہ جناب احمد عارف صاحب حیدرآبادی یہ ہندوستان کے ماضی وحال کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے چیدہ نظم ونثر کے جواہر ریزوں کا مجموعہ ہے اردو ادب میں بہترین انتخاب ہے۔ سرستان ادب کیلئے پر کیف تحفہ ہے یہ کتاب مدارس کی تعلیمی ضروریات کو بھی کما حقہٗ پورا کر سکتی ہے ضخامت تقریباً ۲۴۵ صفحے سائز پاکٹ اڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ ؏

روح تنقید اس کتاب کو ملک کے فاضل انشا پرداز مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے تصنیف کرکے اردو ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اردو دنیا کو علماء یورپ کے فن تنقید سے روشناس کرایا جائے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے زور صاحب نے اس کتاب میں یورپ میں دور حاضرہ کے علاوہ دور ماضی اور متوسط اور عصر بیداری میں جس قدر نقد ونظر کے اصول جاری وساری تھے ان سب کو بیان کیا ہے اور پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید کرکے ان کا استعمال دکھلایا ہے ضخامت (۳۰۵) صفحے سائز پاکٹ اڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ طبع دوم عہ ۱۲ آنہ

تنقیدی مقالات۔ مصنفہ زور صاحب۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جسمیں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبان کے مشہور اہل قلم کی قلم کاریوں پر تنقید کرکے تنقیدی اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نثر اردو، میر انیس کی شاعری، میر حسن اور سحر البیان، فارسی شعر کا آغاز اور ابو علی لطیمی ہورس اسمتھ کیفی حیدرآبادی کی سرخیوں کے تحت ہر ایک کے کلام، طرز تحریر اور اسلوب بیان پر تنقید کی گئی ہے اور متعلقہ مضمون کے خاتمہ پر اس کی ((BIBLIOGRAPHY) یعنی علمیات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے تاکہ مزید تحقیق کرنے والوں کے لئے سہولت ہو ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ مجلد سادہ ہے

اردو کے اسالیب بیان مصنفہ زور صاحب ہر زبان کے ادب میں اسلوب بیان کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ادب میں نظم کے اسالیب بیان کا ابتدا سے لیکر آج تک کا حال اردو تذکروں سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن نثر کے طرز تحریر کے متعلق اردو کے تذکرے اور تاریخیں ساکت ہیں اس کتاب سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اردو نثر نگاری کی ابتدا کب ہوئی اور مختلف دوروں میں اس کا کیا رنگ رہا اور موجودہ زمانہ میں خاص طرز تحریر کے کون کون انشا پرداز ہیں ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ پاکٹ اڈیشن کاغذ چکنا اور لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب غزنوی سلطنت اور غزنین کے باہمی تعلقات، سلطان محمود غزنوی سے پہلے کے فارسی علم ادب کی حالت سلطان محمود کی معارف نوازی، دربار غزنین کے ارباب علم وفضل کے حالات اور سلطان محمود اور غزنوی دور کے علمی وادبی کارناموں کا مرقع ہے ترتیب کتاب کے وقت ادبیات ایران مصنفہ پروفیسر براؤن مصنف کے زیر مطالعہ رہی ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے

کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ اڈیشن قیمت ۱۲/

طلسم تقدیر مصنفہ زور صاحب - یہ ایک نیم تاریخی فسانہ ہے جس میں دکن کی تاریخ اور اس کے باشندوں کی تمدنی حالت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں تقدیر و تدبیر کے اہم مسئلہ کو بڑی خوبی سے سلجھایا گیا ہے ضخامت ۱۶۵ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۸/

دنیائے افسانہ اب تک اردو میں ادب لطیف کے متعلق کوئی اصول قلم بند نہیں ہوئے تھے مولوی عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی کا اردو دنیا پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کر کے دنیائے اردو ادب کو رہین منت کیا ہے اس کتاب میں افسانہ و ناول نگاری کی تاریخ اور اسکے اصول و مبادیات پر بحث کی گئی ہے افسانہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں اردو افسانوں اور ناولوں کو بھی جانچا ہے اخیر میں مصنف نے اردو افسانہ نگاری کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے اردو افسانہ نگاروں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ضخامت ۲۱۸ صفحے پاکٹ اڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا سید غلام مصطفےٰ ذہین و علامۃ الدہر مولانا سید مختار احمد - ہندوستان کے مشہور نیچرل شاعر نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا گیا ہے جو ہر مرد و عورت اور طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہے ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی خاصی پاکٹ اڈیشن قیمت عہ

قاموس الاغلاط مصنفہ علامۃ الدہر سید مختار احمد و مولانا ذہین اس کتاب میں پانچ ہزار کے قریب الفاظ کی تحقیق و تدقیق اور اغلاط کی تصحیح و تنقیح ہے اور ممتاز ادیبوں اور نامی گرامی شاعروں کے کلام کے حوالوں سے استناد کیا گیا ہے تحقیق لغات میں یہ پہلی کتاب ہے جو اہل ادب کے لئے مفید و کارآمد علمی تحفہ ہے زیر طبع

مبادی فلسفہ از مولوی میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی عثمانیہ مولف نے ڈاکٹر اے ایس راپوپورٹ پی ایچ ڈی کی کتاب پرائمر آف فلاسفی کو عام فہم سلیس اور بامحاورہ اردو میں اس خوبی سے منتقل کیا ہے کہ فلسفہ جیسا دقیق مضمون بالکل سہل ہو گیا ہے ضخامت ۱۳۰ صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ اڈیشن ۱۴/

اسوۂ حسنہ مصنفہ احمد عبداللہ المسدوسی بی اے اسمیں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ہر مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے پاکٹ اڈیشن ضخامت ۸۰ صفحے قیمت ۸

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس سلسلہ مشاہیر اسلام و سرپرستان علوم و فنون میں مسلمان حکمرانوں کے علمی کارناموں سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے کتاب کی ابتدا میں ایک محققانہ دیباچہ ہے جسمیں سلاطین اسلام کے علمی کارناموں سے متعلق مورخین کی غلطیوں کا انکشاف کیا گیا ہے یہ مصنف کے سالہا سال کے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تدقیق واقعات کا بے بہا علمی سرمایہ ہے ہر تعلیم یافتہ مسلمان زیر مطالعہ رکھے تاکہ اسکو اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کی حقیقت منکشف ہو ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ چکنا سائز ۲۷×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور جابکی اس کتاب میں ایک رفیع الشان صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ اور مفصل سوانح حیات ہیں جن کا وجود مبارک آصفجاہ ثالث نواب سکندر جاہ بہادر کے زمانہ میں ظہور پذیر ہوا تھا ابتدا لے کتاب میں فن تذکرہ نویسی کی نسبت مولوی مرزا حسنی بیگ شاذلی کا مقدمہ درج ہے ضخامت ۱۲۴ صفحہ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین سائز پاکٹ اڈیشن قیمت ۵/

خزینۂ اخلاق از مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز یہ اخلاقی اور ادبی نظم و نثر کا مجموعہ ہے اس میں کی اکثر نظمیں وقتاً فوقتاً اردو رسالوں میں شایع ہو کر مقبول ہوئی ہیں یہ لڑکے اور لڑکیوں کیلئے مفید اور کارآمد کتاب ہے ضخامت ۴۰ صفحے لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۲/

سیرت خیر البشر ناظم الاخلاق مولانا ذہین صاحب کا طبع زاد منظوم رسالہ ہے جسمیں آنحضرت صلعم کے اخلاق حمیدہ کو عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے یہ بچوں کیلئے نہایت مفید رسالہ ہے قیمت ۱/

نیک بی بی یہ بھی مولانا ذہین کا منظوم رسالہ ہے اسمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایک نیک خو بی بی اپنے بدخو شوہر کو کس طرح ٹھیک کر سکتی ہے یہ عورتوں کے لئے نہایت مفید رسالہ ہے۔ قیمت ۲/

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔ باہتمام رام کشن لیتھوگرافر و منیجر مطبع

مجلۂ مکتبہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ام اے ال ال بی

۱ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہی جو ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کریگا

۲ یہ علمی وادبی رسالہ ہے جسمیں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے
حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائیگا اگر اتفاقاً وصول نہو تو
ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہر) فی پرچہ ۶ر

۵ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (عہ) نصف کے لئے (ہے) اور چوتھائی
کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے
۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلہ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی
علمی مذاق کی اور درسی کتابیں بکمشت یا بدفعات خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت
جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا بتیس روپے کی درسی
و دیگر کتابیں بدفعات یا بکمشت خریدینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت
حاضر ہوگا بکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات
کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دی جائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج
ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا
رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُن کے نام جاری کردیا جائیگا
یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے
استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط منتظم مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن ہونی چاہیے۔

منتظم مجلہ

مجلۂ مکتبہ

جلد (۱) — شمارہ ۵ (۵)

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۸ء

شذرات

اُردو دنیا کے لیئے گزشتہ مہینے کا ایک بڑا سانحہ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، پروفیسر اُردو کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی وفات ہے۔ اگلے زمانے خصوصاً سرسید احمد خاں، حالی اور شبلی کے حلقے سے یہ ایک یادگار باقی رہ گئی تھی افسوس کہ وہ بھی خاک میں مل گئی۔

مولوی صاحب آٹھ ماہ پہلے پائیوریا سے علیل ہوئے تھے، سکندرآباد کے سیول ہسپتال میں کچھ دن زیرِ علاج رہنے کے باوجود طبیعت نہ سنبھلی اور سرطان کا شبہ ہوا، تو رانچی کے ریڈیم انسٹیٹوٹ میں علاج کی خاطر جارہے یہاں سے جو خطوط مولوی صاحب نے ہمیں تحریر کیئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیم کے علاج سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اسی لیے انتقال سے دوماہ پہلے وہ ملیح آباد چلے گئے اور ۲۹ر جولائی کو وہیں انتقال کیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادِ صبا　　یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

مولوی صاحب نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اردو زبان اور ادب کی خدمت میں بسر کیا، سرسید احمد خا کے ادبی مددگار، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، معارف اور مسلم گزٹ کے مدیر رہ چکنے کے علاوہ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی آپ کچھ کم مشہور نہیں ہیں۔ آخری ایام کلیۂ جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں بسر ہوئے سالہا کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی مشاغل کو بھی جاری رکھے رہے۔ آئے دن ملک کے اکثر رسالوں میں آپ کی نظمیں اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

اردو کو علمی زبان بنانے اور مقامی قیود سے آزاد کرنے میں، مولوی صاحب کی مساعی کو بھی بڑا دخل تھا۔ "وضع اصطلاحات" لکھ کر آپ نے ملک بھر کی توجہ علمی اصطلاحات کی طرف منعطف کردی خود کئی الفاظ بنائے اور بنانے میں مدد دی۔

اس قحط الرجالی کے زمانے میں مولوی صاحب مرحوم جیسی ذہین، اور حاضر دماغ ہستی کا وجود بھی بے حد غنیمت تھا۔

گزشتہ مہینے میں دکن کے ایک ماہر تعلیم پروفیسر کاروے، جنھوں نے پونہ میں جامعۂ خواتین ہند کی بنیاد ڈالی ہے۔ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ آپ سے گفتگو کرنے اور آپ کی تقریر سننے کا ہمیں بھی موقع ملا تھا۔ ۶ ہر جولائی کی شام کو ینگ منس امپروومنٹ سوسائٹی کی سرپرستی میں اور دکن ہی کے ماہر تعلیم پرنسپل محمد عبدالرحمان خاں بی، اس، سی آنرز (لندن) صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کی صدارت میں آپ نے موجودہ تعلیم پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کیے۔ پروفیسر کاروے کا نظام تعلیم بے حد وسیع ہے۔ دوران تقریر میں انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ عورتوں اور مردوں کی تعلیم میں اصولاً فرق کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اسی فرق کو مد نظر رکھکر پروفیسر موصوف نے جامعۂ خواتین ہند کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہاں سے بعض خوش قسمت خواتین کے طیلسانی حاصل کرنے پر ہم اس سے پہلے جامعہ کو مبارکباد دے چکے ہیں۔

پروفیسر کاروے کے دیرینہ تجربہ نے ان کو اس امر کا یقین دلا دیا ہے کہ ہندوستانی جامعات کی موجودہ تعلیم، ہندوستان کے حق میں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس سے نوجوانوں میں خود اعتمادی کے بجائے، انجذاب گدایانہ کا احساس دن بدن ترقی کر رہا ہے اور یہ یقیناً نظام تعلیم اور ذریعہ تعلیم کا بڑا نقص ہے۔

پرنسپل محمد عبدالرحمان خاں نے بھی پروفیسر کاروے کی تقریر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ غیر زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ باوجود گذشتہ تین چوتھائی صدی کی کوششوں کے ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم پیدا ہو سکی۔ اگر ہم دنیا کی مہذب قوموں میں اپنا بھی شمار کروانا چاہیں، تو ہمارے آئندہ لائحہ عمل کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے درمیان نوشت و خواند سے واقف کاروں کی فیصد تعداد میں امکانی اضافہ کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ مگر یہ کام اسی وقت بوجہ احسن انجام پا سکتا ہے کہ جب ملکی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ ہندوستان میں صرف چند زبانیں ایسی ہیں کہ جو ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت اپنے آپ میں پنہاں رکھتی ہیں۔ اردو نے اپنے شاندار نتائج پیش کر دیے ہیں۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ تلنگی اور کنڑی میں بھی تھوڑی سی کوشش سے یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔

ان ماہرین تعلیم کے قابل قدر خیالات کو پیش نظر رکھکر ہم جو نتائج مستنبط کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم میں ایک اصولی تبدیلی ناگزیر ہے اور ہماری آئندہ ترقیوں کا دارومدار ہماری ملکی زبانوں کے ذریعہ تعلیم بنائے جانے پر ہے۔

ہمیں بڑی مسرت ہے، کہ ڈاکٹر سید حسین صاحب بی۔ اے۔ (عثمانیہ) ام اے (علیگ) پی، ایچ، ڈی (لندن) سائنس کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ۱۱ اگست کی شام کو بلدہ واپس ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ عثمانیہ کی بہترین پیداوار سے ہیں۔ جامعہ کے اوّلین طیلسانین میں، آپ بہ حیثیت مجموعی اول کامیاب ہوئے تھے۔ اسی بنا پر آپ جامعہ کی جانب سے کیمیا کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے یورپ بھیجے گئے۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے دو سال میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اور ایک سال تک جرمنی میں جرمن زبان سیکھنے اور معلومات میں اضافہ کرنے کے بعد پھر اپنی مادر علمی کے آغوش میں واپس ہو رہے ہیں۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ نے بھی پوری قدر شناسی کا ہاتھ بڑھا کر آپ کا استقبال کیا اور ام، اس، سی کی اسکیم میں پانچسو تا ایکہزار کے گریڈ پر زائد پروفیسر کیمیا مقرر کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کامیابی پر ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں ہمیں قوی امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب جامعہ کے نہایت وفا شعار اور ملک و قوم کے سچے خدمت گزار ثابت ہوں گے۔

دوسری اشاعت میں رموز الابر پر جو مضمون "اشارات انجام" کے عنوان سے شایع ہوا تھا اس کے متعلق مولوی زبید احمد صاحب ام، اے پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی کالج نے اپنی گرانقدر رائے، لندن سے روانہ فرمائی ہے۔ جہاں آپ عربی کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گئے ہوئے ہیں۔ اردو سے زیادہ ایک عربی کے پروفیسر کی اردو زبان کے اہم مسائل کی طرف توجہ فرمائی قابل تشکر ہے۔ ہمیں اسی موضوع پر مزید مضامین کے وصول ہونے کی توقع ہے۔ اس کے بعد ہم کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

۵

کلیاتِ وطنؒ

کا

دیباچہ

از جناب غلام معین الدین صاحب یوسفی

حضرت سید افتخار علی شاہ وطنؒ حیدرآباد دکن کے ایک نامی گرامی بزرگ تھے اور آپ کا حلقۂ ارادت ملک کے چاروں گوشوں میں پھیلا ہوا تھا۔ علمِ تصوف میں آپ کی ایک کتاب (سفر درِ وطن) کو اہلِ دانش و بینش سرمۂ نظر بناتے ہیں۔ دکن کی شاعری کے عام مذاق نے آپ کو تخلص (وطن) سے بڑا مشہور و معروف بنا رکھا۔ آپ صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں اور بعض کتابیں طبع بھی ہوگئیں جو اپنے وقت کے مذاقِ طبع کا ثبوت ہیں، حلقہ ارشاد و ہدایات کے بزرگوں کی تصانیف کیلئے ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ موجودہ مذاق مطالعہ کی خصوصیات میں پیش کیا جائے بڑی خوشی کی بات ہے کہ جناب یوسفی صاحب خادم و نبیرۂ رضائی حضرت وطنؒ نے کلام وطن کو "کلیات وطن" کے نام سے، اپنی خوش سلیقگی کے ساتھ شایع کرنے کا اہتمام کیا اور اس پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ حضرت مصنفؒ کی تصویر کے ساتھ "کلیات وطن" کی اشاعت سے پہلے "مجلہ مکتبہ" میں طباعت کے لئے دیدیا ہے جس کے ہم شکر گزار ہیں۔ امید ہے کہ جناب یوسفی صاحب کی۔ اس خاص کوشش کو عقیدت مندان خاندان افتخاریہ" بنظر استحسان دیکھینگے "کلیاتِ وطنؒ" کی عام اشاعت کے وقت ہمیں بھی اپنے تنقیدی خیالات کے ظاہر کرنے کا موقعہ ملیگا۔ (مجلہ مکتبہ)

بس نامور بزیرِ زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بروئے زمیں یک نشاں نماند

اب اردو میں بھی ہر تصنیف کے ساتھ مصنف کو روشناس کرانا امر لازم ہوگیا ہے اور یہ بدعتِ حسنہ اہل علم کے مذہب میں فرائض کی حد تک پہنچ گئی ہے اس کا تارک ناقابل عفو مجرم گنا جاتا ہے۔

مقدمہ نگاری ایک وسیع فن بن گئی ہے۔ ہر مصنف کے متعلق کم سے کم اتنی چیزیں ضرور دکھانی پڑتی ہیں اس کا اور اس کے آباؤ اجداد کا نام۔ عرف یا کنیت۔ لقب یا خطاب۔ ملت و مذہب و مشرب۔ مولد۔ مسکن وطن۔ تعلیم و تربیت۔ ننہیالی علم اسلاف و اخلاف اساتذہ میں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہوں اُن کا نام۔ مرحوم ہو تو تاریخ و سنہ وفات۔ مدفن۔ باقیات الصالحات (اس کی تحت اولاد و آل، تصنیف و تالیف ان سب کا ذکر آسکتا ہے۔)

کتاب کی نسبت بھی چند ضروری چیزیں بیان کر دینا فن انشا کی خوش سلیقگی کا آئینہ ہوتی ہیں تصنیف ہے یا تالیف۔ انتخاب ہے یا اقتباس، اس سے پہلے کبھی چھپی یا نہیں چھپی۔ مصنف کی تصنیفات میں اس کا کیا پایہ ہے کتنی مدت کی محنت کا نتیجہ اور کتنی عمر کا سرمایہ ہے۔ کس کی خواہش اور کس کی فرائش سے چھپی۔ طباعت کا سنہ اور عہد۔

دیکھنے اور سننے میں تو یہ باتیں سرسری معلوم ہوتی ہیں مگر جب ایک زمانہ گزر جاتا ہے تو انھیں کو ڈھونڈھنا پڑتا ہے اور کوئی رستہ نہیں ملتا۔ چھان بین بے سود ہوتی ہے اور سوچ بچار بے فائدہ۔

اس وقت دیوان حضرتِ وطن کے ایک چھوڑ چار نسخے آنکھوں کے سامنے ہیں مگر کسی میں سرے سے کوئی ایسی بات ہی نہیں جو ایک مقدمہ نگار کے کام آئے اور وہ حرف کو داستان بنا کے اپنا جوہر دکھائے۔ ہاں یہ تو ہے کہ مختلف مطبعوں اور سنوں کے چھپے ہوئے ہیں۔ ایک دیوان قلمی ہے اس کا خط بہت اچھا ہے کاتب کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ جو کچھ بھی معلوم ہوا گو یا وہ نہ معلوم ہونے کے برابر ہے کہ مصنف کے متعلق کیا لکھا جائے جن کو واصل بحق ہو کر ابھی صدی کا ربع حصہ بھی پوری طرح گزرنے نہ پایا اور اب تک اُن کے دیکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اولاد و آل بقید حیات ہے مگر بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ "بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند"

ایسے مقام پر جوانِ صالح عالیجناب مولانا مولوی سید شاہ نور اللہ حسینی المدنی المتخلص بہ سیّد (نبیرۂ حضرت وطن) کا شکریہ ادا نہ کرنا ناحق کوشی ہے اور حق سے چشم پوشی۔ کیوں کہ میری ان مشکلوں کا بڑا حصہ صرف ان ہی کی بدولت آسان ہوا اور بہت سے معلومات ہوتے گئے جن کی وجہ سے حضرت وطن کے تعارف کرانے میں اتنی رکاوٹیں نہیں رہیں۔

اس خصوص میں جو کتابیں دیکھنی پڑیں ان کی فہرست درج ذیل ہے اگرچہ مقصد پورا پورا کہیں سے حاصل نہ ہوا۔

(۱) **بستانِ آصفیہ**۔ مولفہ مانک راؤ وٹھل راؤ مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن۔

(۲) تزکِ محبوبیہ۔ مولفہ غلام صمدانی خاں صاحب گوہر مطبوعہ نظام المطابع حیدرآباد ۱۳۲۱ھ۔

(۳) جانِ سخن شرح رسالہ سفر در وطن مصنفہ صاحبزادہ نواب وزیرالدین (آصف یاور الملک..) وزیر (نبیرۂ نواب صمصام الملک بن سکندر جاہ) مرید حضرت وطن مطبوعہ نظام المطابع مدراس ۱۲۹۰ھ۔

(۴) دبدبۂ نظام۔ مولفہ مولوی عبدالرؤف صاحب مطبوعہ قاسم پریس حیدرآباد۔

(۵) رسالہ سفر در وطن۔ مصنفہ حضرت وطنؒ مطبوعہ مطبع متین کرتان حیدرآباد ۱۲۹۲ھ۔

(۶) محبوب الزمن } مولفہ محمد عبدالجبار خاں صاحب صوفی ملکاپوری براری، حیدرآبادی
تذکرہ شعرائے دکن } صدر مدرس مدرسہ اعزہ سرکارعالی (۱۳۲۹ھ)

"جانِ سخن" کو چھوڑ کر کسی کتاب سے اتنا بھی تو نہ معلوم ہوسکا کہ آپ کے والدِ محترم و جدِ معظم کے نام کیا تھے۔ اور تو اور۔

"دبدبۂ نظام" سے ایک نئی بات یہ تو معلوم ہوئی کہ اس کے مصنف کو حضرت وطن سے مثنوی شریف کے درس سے مستفیض فرمایا[1] ہے۔ اب اسے کوئی اپنے معلومات کی فہرست میں لکھے یا نہ لکھے اختیار ہے!

"تزکِ محبوبیہ" کے نوادرات سے یہ جملہ دل پر لکھ رکھنے کے قابل ہے کہ" نواب آصف یاور الملک آپ کے مریدانِ باخلاص[2] سے ہیں۔

"خاموشم و گویانم چوں خط بکتاب اندر" کا سا حال ہے کہ بات ہے بھی اور پھر کچھ بھی نہیں۔

اتنی پریشانیاں اٹھانے کے بعد بھی جو کچھ ملا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ کسی زمانہ میں ایک سوانح نگار کے کام اس سے نکلیں۔ شاید اتنا مواد بھی کسی ایک کتاب سے نہ مل سکے۔

رہی اگر بدہد رسن کہ چو من   خامہ گیری و سخن نگاری

نام و نسب آپ کا نام" سید شاہ افتخار علی المدنی" اور آپ کے والد[3] کا نام حضرت میر کاظم علی الحسینی المدنی" یہ سلسلہ ۳۰ویں پشت میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ملتا ہے۔

سنہ ولادت کسی طرح معلوم نہ ہوسکا افسوس۔

تعلیم و تربیت آپ کے اساتذۂ علوم ظاہری کا کسی کتاب میں ذکر تو نہیں لیکن حضرت مصنف کی پوری تصنیفات نہ سہی کاش دو چار ہی کتابیں پیشِ نظر ہوتیں تو بڑی سہولت ہوتی۔ اب

---

[1] حصہ اول۔ باب العاشر مشائخین کبار صفحہ (۴)

[2] جلد دوم۔ دفتر سوم صفحہ ۱۴۶۔

[3] جانِ سخن صفحہ ۱۲ شجرۂ جدی اسی کتاب کے صفحہ ۶ پر مولوی عبدالستار صاحب نے دیباچہ میں آپ کا لقب "غریب الوطن" لکھا ہے۔

اس کلیات کے علاوہ صرف ایک رسالہ "سفر در وطن" پیش نظر ہے جس سے آپ کے تبحر علمی اور انداز انشاپردازی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اس کتاب کا سبب تصنیف حضرت مصنفؒ نے ایک بیس شعر کی مثنوی میں بیان فرمایا ہے۔ ذرا اصل ہی کا مزا چکھ لیجئے۔

کوئی اہل باطن سے ہے نیک حال — کیا اس نے اک روز مجھ سے سوال
جو کرتے ہیں مالک وطن میں سفر — ہوں مطلق میں اس رمز سے بے خبر
سمجھتا نہیں ہیں یہ نکتہ ہے کیا — وطن میں سفر کو علاقہ ہے کیا

اس کے بعد رسائل کے مقابل میں کچھ کسر نفسی فرمائی ہے (جو بزرگان سلف کا شعار تھا) اور لکھا ہے کہ میں نے یہ سرسری نقل کہی ہے اس کا عیاں اور ہے اور نہاں اور"

"یہ نقل صورت اصل" ہے قال نہیں حال ہے۔ پھر ہائے کس اچھے ابہام میں فرمایا ہے۔

زبانی غریب الوطن کی ہے یہ — کہانی غریب الوطن کی ہے یہ

" سفر در وطن کے لئے ہی غریب الوطن، نہیں لکھا بلکہ آپ کا لقب بھی غریب الوطن" تھا آج اگر ہم اپنے اسلاف کے ناریخی تعلیمی نصاب پر نظر ڈالیں تو فن انشا میں سب کی سب کتابیں مقفٰے اور مسجع ملینگی۔ گویا صنائع بلاغت کی جان ہیں اور بدائع معانی کا ایمان۔ قدما کا یہ خالص جوہر تھا اس طرز کو نباہنے کی داد ملتی تھی، لوگ سر پر بٹھاتے تھے دل میں جگہ دیتے تھے اور قبول عام کا یہ عالم تھا کہ اس رنگ کے رنگے ہوئے من گھڑت قصوں کو بھی فسانۂ عجائب سمجھ کر پڑھتے جاتے اور کیف و سرور پاتے (رہے نام اللہ کا)

ایک زمانہ میں منشی کا لفظ اکثر ایسوں ہی کے نام پر لکھا جاتا اور فن انشا، ایک قابل قدر فن کی حیثیت سے برتا جاتا تھا۔

رسالہ سفر در وطن کو پڑھنے کے بعد یہ رائے آسانی سے قائم کی جا سکتی ہے۔ کہ حضرت وطن اپنے زمانہ میں ایک اعلیٰ درجہ کے انشا، پرداز تھے ترصیع ہو یا تسجیع عبارت سے جانے نہیں پاتی اور قوافی کا لزوم ایک قدم پیچھے نہیں ہٹتا۔

اگرچہ کہ اس وقت ہمارا کام حضرت وطن کے دیوان کی مقدمہ نگاری ہے اور مقصود صرف ان کی شاعری سے متعلق ہے لیکن ہم کو آج بھی ایسا مواد دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔ جو مصنف کے روشناس کرانیکا سرمایہ بن سکے۔ توکل کے دن کیا امید ہو سکتی ہے اور انقلاب زمانہ سے جو کچھ ہو وہ کم ہے۔

ہم آپ کی نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں ہاں ذرا اس کا خیال رہے کہ "سفر در وطن" سلوک و معرفت کی کتاب ہے اور مصنف نے اپنی واردات (غریب الوطن کی کہانی) کو ایک فرضی نام (عدیم المثل) کی داستان بنا کر بیان فرمایا ہے، سارا قصہ اسی انداز مجاز میں ہے کہ "گفتہ آید در حدیث دیگراں"

اس رسالہ کا آغاز اسی طرح کیا گیا ہے اور وہی آداب ملحوظ ہیں۔ جو اہل اسلام کے لئے موجب خیر و برکت ہیں۔ حمد و نعت شریف ہے پھر مرشد کی منقبت ہے اس کے بعد سبب تالیف کتاب اور یہ سب منظوم ہیں۔

نثر کا آغاز یوں فرمایا ہے:۔

نخلبند[1] نرگستان مازاغ البصر وما طغیٰ و بہار پیوند چمنستان لقد رای من آیات الکبریٰ گلدستۂ نور ستہ فثم وجہ اللہ کو مشتاقان بہارستان قاب قوسین او ادنیٰ و شائقان سرائستان مقاماً محموداً کے پیشکش کرتا ہے کہ قبل بقائے عالم کے اور بعد فنائے آدم کے سرحد کن میں آمد سخن میں۔ دیدہ کے پہاڑ میں۔ نظر کی آڑ میں "خود را نگر" ایک بستی ہے جس میں مخفی گنج ہستی ہے۔ وہاں نابالغ ایک لڑکا تھا۔ پرچھائیں سے اس کو دھڑکا تھا گھر سے باہر نہ ہوتا تھا جاگتا بیٹھتا سوتا نہ تھا۔ آئینہ سے جھکتا رہتا، روشنی سے بھڑکتا رہتا۔ صورت سے منہ پھیر لیتا۔ آنکھ سے آنکھ چرا لیتا۔ دریچے میں ذات کے بیٹھا کرتا۔ بیرون میں صفات کی پھیرا کرتا۔ قدیم سے تنہائی کلیم تھی۔ یتیم سے بے پروائی ندیم تھی۔ بشر سے غرض تھی نہ خیر سے کام تھا۔ کہنے کو عدیم المثل اس کا نام تھا!

اسی رنگ اور اسی انداز میں کہتے چلے گئے ہیں کتاب کی کتاب ہی عبارت کے لحاظ سے مرصع اور مقفیٰ ہے۔ الفاظ کیا ہیں گویا نگینے جڑے ہوئے ہیں۔

یہ جو کچھ نقل کیا گیا نمونے کے لئے کافی ہے مگر صفحہ آدھا صفحہ اور پڑھ لیجئے تو خالی از لطف نہیں بلکہ یہ باتیں روح کا چارہ ہیں اور ایمان کا سہارا۔

آگے چل کر دو چار سطروں کے بعد ہی عدیم المثل کے عالم رویا کا عالم الفاظ میں یوں دکھاتے ہیں کہ

دیکھا[2] کہ ایک مدینہ منور و محمود ہے تمام اس کا دار الخلافت وجود ہے۔ سینۂ بے کینہ زمین ہے دماغ چرخ بریں ہے۔ نباتات بال ہیں۔ استخواں جبال ہیں آفتاب نظر تاباں ہے۔ نسیم نفس وزناں ہے۔ ہر رخ فضائے گلشن رخسار ہے، کھیت جس میں حسن کی بہار ہے۔ کہیں سبزۂ خط عیاں ہے۔ کہیں غنچۂ لب نمایاں ہیں۔ کہیں سنبل زلف پریشاں ہیں کہیں

---

[1] "سفر در وطن" صفحہ۔ [2] سفر در وطن صفحہ

نرگس چشم حیراں ہے کہیں چاہ زنخداں ہے کہیں سرو قد جیاں ہے۔ روشیں اشارات ہیں، دیواریں نکات ہیں۔ مکانات تصورات ہیں۔ باغباں خیالات ہیں وسط میں جس کے ایک محل حال کا بنا ہوا ہے دروازہ اس پر قال کا لگا ہوا ہے پردہ زبان ہے سخن دربان ہے۔ خلوت خود رفتگی ہے، تخت ٹکٹکی ہے۔ ابرو قوس ایوان ہے، شامیانہ جبیں تاباں ہے چلمن مژگاں ہے، خال دیدبان ہے۔ مسند دیدۂ پُرنور ہے اُس پر جلوہ فرما ایک رشک حور ہے۔ سیرت کو سوچو تو رب مفہوم ہو، صورت کو دیکھو تو عرب معلوم ہو۔"

یہ نثر حضرت مصنفؒ کے پایۂ ادب و انشاء کا نمونہ اور مرتبۂ سیر و سلوک کا آئینہ ہے اہلِ قال دیکھ کر پڑھیں اور اہلِ حال پڑھ کر سمجھیں۔

وہ جو ہیں نااہل سیکھیں جمع خاطر کے علوم ہیں وہی علامہ جن کو بھول جانا یاد ہے۔

بیعت و خلافت خلافت آبائی و جدی[۱۰] کے علاوہ بھی آپ حضرت اکبر علی شاہ صاحب کے خلیفہ و جانشین تھے۔

آپ کے پیر و مرشد کو سلسلہ چشتیہ[۱۱] میں حضرت شاہ شجاع الحق الحقانی سے اور طریق قادریہ[۱۲] میں حضرت سید شاہ نور الابصار غریب عالم قادری سے خرقۂ خلافت حاصل تھا لیکن حضرت کا مسلک چشتیہ ہی رہا۔ گوہر صاحب نے جو لکھا ہے کہ "آپ حیدر علی شاہ صاحب...... کے خلیفہ ہیں[۱۳]" مگر یہ غلط ہے کیونکہ آپ خود فرماتے ہیں۔

نام ہے بندوں میں گو اکبر علی — ہیں نشانِ حق مگر آثارِ شیخ[۱۴]

یہی نہیں سفر در وطن[۱۵] میں لکھا ہوا قصیدہ (منقبت) بھی اس کا شاہد ہے۔ اس کے علاوہ خاندانِ صابریہ میں بھی حضرت خواجہ محبوب علی شاہ صاحبؒ الہ آبادی سے اجازت خلافت حاصل تھی۔

تلمذ شاعری اس باب میں جس کی زبانی سُنا یہی سُنا کہ آپ کو حضرت فیض علیہ الرحمۃ سے تلمذ حاصل تھا مگر کہنے والوں میں زیادہ حصہ مریدین و معتقدین کا شامل تھا، اُن کے بیان پر ہر شخص کیوں آمنا کہتا اور اگر اسی بنا پر ہم بھی لکھ دیتے تو کوئی کیوں تسلیم کرتا۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن میں اس کا کچھ اثر آثار ہی نہیں۔ اگرچہ یہ کتاب حضرت وطن کے انتقال سے چھ سال بعد ہی لکھی گئی ہے۔

---

[۱۰] دیکھئے ص۲۹ ۲۲-۲-۹۴ء ص۱۱ [۱۱] شجرہ جدی ص۱۳ شجرۂ چشتیہ ص۱۲ [۱۲] شجرۂ قادریہ جان سخن۔ [۱۳] تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر ص۱۲۶ [۱۴] ملاحظہ ہو ص۱۲۳ [۱۵] ص۴۷ - ص۴۲ -

بڑی چھان بین کے بعد ہم نے آپ کے دیوان[۱] میں حضرت فیض کی ایک غزل پہ آپ کی تخمیس پائی۔ جس پر یہ لکھا ہے۔

"مخمس بر غزل استادی اعنی حضرت مولانا شمس الدین فیض نور اللہ مرقدہٗ" یہ سلسلہ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ پر اس طرح ختم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت وطن رح

(۲) حضرت فیض قدس سرہٗ العزیز۔

(۳) حضرت حافظ تاج الدین مشتاق نور اللہ مرقدہٗ۔

(۴) حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ۔

سخن از سخن می خیزد۔ استاد کا مسلم الثبوت ہونا بھی شاگرد کے مستند ہونے کی دلیل ہوتی ہے بلکہ سند۔ اس لئے یہاں یہ بات بھی واضح طور پر لکھ دینے کے قابل اور بیان کر دینے کے لائق ہے کہ حضرت فیض علیہ الرحمۃ اپنے عہد میں استاد کل کے لقب سے مشہور اور دولت فقر کے علاوہ علوم ظاہری سے بھی مالامال تھے تقریباً سارا دکن آپ کے فیوض قال و حال سے بہرہ مند تھا آپ نے اپنے اکثر شاگردوں کو استاد ہی نہیں بلکہ استاد گر بنا کے چھوڑا۔

حکیم منظفر الدین علیخاں مزاج۔ میر تراب علی زور۔ سید حفیظ الدین یاس۔ بنسی راجہ باقی۔ محمد فیاض الدینخان (شرف جنگ) میر احمد علی عصر۔ خواجہ محمود غور (مثنوی خواں) منشی حبیب اللہ ذکا[۲]۔ یہ سب اپنے فن کے مالک اور اپنا آپ جواب تھے۔ حضرت وطن بھی اسی باغ کے ایک نخل سایہ دار ہیں۔

خصوصیت عابد و زاہد و متقی و مرتاض ہونے کے علاوہ مثنوی شریف سے خاص طور پر شغف تھا۔ گنتی ہی کے ابیات ہوں گی جو کبھی یاد نہ آئی ہوں نہیں تو سب کچھ ازبر تھا گویا آپ کو حافظ قرآن العجم کہیں تو مبالغہ نہیں اور پھر ان دفتروں سے ایسے برموقع و برمحل اشعار پڑھ جاتے اور اس انداز خاص سے اس کے رموز و نکات بیان فرماتے تھے کہ مجلس وعظ و قال محفل وجد و حال بنجاتی تھی۔

وفات تخمیناً (۷۰) سال کی عمر پائی اور نویں رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ روز پنجشنبہ اس دنیائے فانی سے وطن حقیقی و جاودانی کی طرف مراجعت فرمائی[۳]۔

پل قدیم محلہ رازدار خاں پٹھیہ چشتی چمن میں مزار مبارک ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

---

[۱] "بستان التصوف" مطبوعۂ فیض الکریم ص۲۵ مطبوعہ "شوکت الاسلام پریس" ص۱۲ (حیدرآباد) ۱۳۱۵ھ۔ میر راس الال تھے جب حیدرآباد آئے تو حضرت فیض سے مشورہ لیتے رہے آخر میں اپنا کلام غالب دہلوی کی خدمت میں بھیجتے تھے (شعرائے دکن حصہ اول ص۱۲۲) کا اقتباس ہے۔

[۲] بستان آصفیہ حصہ دوم ص۲۲۔

باقیاتُ الصّالحات

آل و اولاد حضرتِ وطن کا نخلِ مراد ثمار اولاد بھی خوب لایا۔ اس خاندان سے عقیدت و ارادت رکھنے والوں کے لئے اس کو ایک حد تک مفصل لکھا جاتا ہے۔

۴۔ صاحب زادے

۱۔ حضرت سید معین اللہ حسینی معینؔ (ولادت ۱۲۹۰ھ۔ وفات ۱۳۳۹ھ) بعض معتبر و موثق ذریعوں سے معلوم ہوا کہ آپ کا کلام ایک مکمل دیوان کی صورت میں مرتب تھا وہ تلف نہیں ہوا بلکہ کسی متشاعر کی مِلک بن گیا۔

آپ کی یادگار ایک صاحبزادہ اور دو صاحبزادیاں موجود ہیں۔

(۱) مولوی سید شاہ ولی اللہ حسینی صاحب چشتی ولادت ۱۳۲۰ھ عالم ہیں واعظ ہیں۔ اور ارادت مندوں کے لئے اپنے والد مرحوم کا نعم البدل، آپ کے اردو شعر ہوں یا فارسی محفل قوالی میں سُنے گئے ہیں آپ کو آپ کے عمِ محترم حضرت سید شاہ ظہور عالم حسینی المدنی (خلف اصغر حضرتِ وطن) نے دستارِ خلافت بھی باندھی ہے اور آپ اس وقت مسندِ ارشاد و ہدایت پر متمکن ہیں۔

(ب) بڑی صاحبزادی اپنے پھوپھیرے بھائی مولوی محمد صدیق صاحب صدیقی حقانی (میر منشی اول تعلقداری اطراف بلدہ) سے بیاہی گئیں۔ مولوی صاحب نواب صدیق یار جنگ کے پوتے تھے ۱۳۴۵ھ میں انتقال ہوا۔

(ج) چھوٹی صاحبزادی کا عقد مولانا الحاج مولوی سید محمد بادشاہ حسینی صاحب قادری لئیقؔ واعظ مکہ مسجد سے ہوا آپ کا شمار بلدے کے باثر مشائخین میں ہوتا ہے آپ حضرت سید عمر صاحب خلیقؔ کے خلفِ اکبر و جانشین ہیں۔

(۲) حضرت سید فرید اللہ حسینی صفیؔ (ولادت ۱۳۰۰ھ وفات ۱۳۳۶ھ) آپ کا قلمی کلیات موجود ہے اور ایک مثنوی "اسرار فرید" کے نام سے طبع ہوچکی ہے۔ جو حضرت عطارؔ کے کسی قصیدے کا ترجمہ ہے (مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد) آپ کی یادگار ہیں ایک صاحبزادہ اور دو صاحبزادیاں ہیں۔

(۱) مولوی سید شاہ نور اللہ حسینی صاحب سیدؔ (ولادت ۱۳۲۲ھ) تحصیل علم میں مشغول ہیں وعظ کہتے ہیں۔ جوان صالح، منکسر مزاج، متشرع اور خوش اخلاق اور صورت سے فقر ہویدا ہے اور طبیعت سے حیا پیدا۔ کبھی کبھار کچھ نظم بھی کرلیتے ہیں۔ اردو سے زیادہ فارسی پر میلان ہے۔ آپ کو حضرت معینؔ مرحوم خلف اکبر حضرت وطن نے دستارِ خلافت باندھی ہے۔ ان کی اٹھان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک دن اپنے جدِ معظم کا ثنیٰ بن کر وطن کے لئے مایۂ ناز اور دکن کے لئے باعثِ افتخار ہوں گے۔ اِنشاءَ اللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

(ب) بڑی صاحبزادی (ولادت ۱۳۲۵ھ) جناب چشتی خلف حضرت معین مرحوم سے بیاہی گئیں۔

(ج) چھوٹی صاحبزادی (ولادت ۱۳۲۳ھ)

(۳) حضرت سید شاہ فرید عالم حسینی (وفات ۱۳۴۶ھ) آپ کی یادگار مولوی سید ولی الدین حسینی المدنی صاحب ہیں جو ایک نیک اور ہونہار نوجوان ہیں۔

(۴) حضرت سید شاہ ظہور عالم حسینی (ولادت ۱۳۰۵ھ) بقید حیات ہیں اور اسی مشائخانہ وضع میں بسر کر رہے ہیں۔

(۴) صاحبزادیاں

(۱) پہلی صاحبزادی (ولادت ۱۲۹۲ھ) مولوی غلام طاہر صاحب[1] مہتمم خزانہ صرف خاص سے۔

(۲) دوسری صاحبزادی حضرت سند المحققین علامۃ العصر مولانا مولوی محمد جمال الدین صاحب قبلہ مغفور (نوری) پروفیسر عربی نظام کالج سے بیاہی گئیں جو تادم تحریر زندہ اور سلامت ہیں۔

(۳) تیسری صاحبزادی (ولادت ۱۳۰۹ھ) جن کا عقد جناب مولوی سید عبد القادر صاحب قادری نبیرہ حضرت زرد علیشاہ صاحب قادری مغفور سے ہوا تھا۔ مدت ہوئی کہ انتقال فرما گئیں۔

(۴) صاحبزادی جو مولوی سید حسین علی صاحب سے منسوب ہوئیں۔ بفضلہ تعالی بقید حیات ہیں۔

اولاد معنوی

خلفاء حضرت وطنؒ کی ذریات صفاتی کا بھی حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ ایک کتاب علحدہ لکھی جا سکے اس لئے ہم یہاں بطور اختصار چند نام لکھ دیتے ہیں کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔

(۱) مولانا شیخ امام مرحوم کلیانوی مخمور تخلص آپ "شاعر بے مثل" کے لقب سے مشہور تھے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہوا آپ سب سے پہلے خلیفہ ہیں۔

(۲) مولانا شیخ عبد القادر چشتی (مغفور) مہاجر آپ مدینہ طیبہ میں تادم زیست "ثانی غوث" کے لقب سے مشہور رہے اور ممکن ہے کہ وہاں اب بھی آپ کا یہی لقب جاری ہو۔

(۳) مولانا نور الحق مرحوم۔ زندگی میں "قاتل ساحراں" کے لقب سے ملقب تھے وفات خاندیس (صوبہ برار) میں ہوئی حضرت وطنؒ آپ کو "مقبول بارگاہ احد" کے نام سے یاد فرماتے تھے۔

---

[1] نواب صدیق یار جنگ مرحوم معتمد دفتر ملکی کے فرزند تھے اور نواب صاحب مرحوم حضرت وطنؒ کے ہم زلف تھے۔

(۴) مولانا سید اسمٰعیل المعروف بہ ذبیح اللہ شاہؒ خلافت آبائی حاصل ہونے کے باوجود شوق سلوک میں سالہا سال اکثر فقرا و صالحین کی صحبت میں رہے یہاں تک کہ حضرت وطنؒ کے حلقہ مریدین میں داخل ہو کر اپنی بے نظیر ریاضت و مجاہدے سے بہت جلد فائز المرام ہوئے۔ چنانچہ ۱۸ رجب ۱۳۲۲ھ میں آپ اجازت خلافت پاکر مسند آرائے ارشاد ہدایت ہوئے۔ آپ کو اپنے پیر و مرشد سے جلہ ملبوس کے علاوہ اجازت نامہ کے ساتھ قرآن مجید۔ مصلّے۔ تسبیح۔ و دلائل الخیرات عطا ہوئے۔

(۵) مولوی شیر علی صاحب المعروف "بہ حق نما شاہ" آپ شاعر بھی تھے اور حق نما تخلص بھی فرماتے تھے۔

(۶) محمد انوار صاحب المخاطب "نور الانوار حقیقت نما شاہ صاحب" آپ بھی شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ اس وقت بقید حیات ہیں۔

(۷) مولوی حکیم عبد اللہ خاں قرب تخلص۔

(۸) مولوی قدرت علی بیگ صاحب قدرت نما شاہ۔

(۹) مولوی شاہ پیر شاہ پیر اولیا مرحوم۔

(۱۰) غلام احمد "دانی شاہ" مرحوم آپ کا مزار چشتی چمن میں حضرت وطنؒ کے پائین ہے۔

(۱۱) سرمد شاہ مرحوم۔

(۱۲) مصباح الاسلام مرحوم۔ آپ صاحب تصانیف کثیرہ مشہور ہیں۔ مگر ہم کو باوجود تلاش بھی کوئی کتاب نہ مل سکی۔

(۱۳) مولوی میر سلامت علی خاں مرحوم مؤلف حقائق و معارف القدر، یہ کتاب مسئلہ جبر و قدر پہ لکھی ہے۔

(۱۴) حبیب نما شاہ ساکن دلور کنڈہ۔

اے نام دلکشائے تو عنوان کارہا	خاک درِ تو آبِ رُخ اعتبارہا
وز بہرِ خواندنِ رقمِ قدرتت بہار	اوراقِ گل سشمردہ بانگشت خارہا

اے مالک بے نیاز و ذرہ نواز یہ بھی تیری نیرنگیٔ قدرت کی بہار ہے کہ میرا خار قلم اس چمن معرفت کے گلہائے مضامین کی اوراق شماری کرنا چاہتا ہے جو ایک حضرت وطنؒ جیسے حقیقت آگاہ باغباں کا لگایا

ف۵۔ آپ نے اپنے مسکن موضع چوپنہ تعلقہ دیگلور ضلع ناندیڑ (حیدرآباد دکن) میں ایک مدرسہ صوفیہ بھی قائم کیا ہے جس کی شاخیں کل ممالک محروسہ سرکار عالی کے علاوہ کاٹھیاواڑ تک بھی ہیں۔ آپ صاحب تصانیف بھی ہیں چنانچہ آپ کی ایک کتاب "آئین حزب اللہ" کے نام سے زیر طبع ہے۔

ہوا ہے اور یہ بھی تیری ہی بوقلمونی مشیت کا تماشا ہے کہ اس ناچیز ذرۂ بمقدار کو تو نے اس شرف مقدرسے مفتخر فرمایا ورنہ میری علمی وادبی بے بضاعتی پر نظر کرتے یہ دن کہاں نصیب ہوسکتا کہ یہ حقیر کلیات وطنؒ کی مقدمہ نگاری کو اپنے سر لینے کا حوصلہ کرتا کیونکہ یہ کام کسی ایسے شخص کا تھا جو اُن سے سوا نہ ہو تو کم ازکم ان کا ہم رتبہ تو ہوتا۔ بہرحال یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ع قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ کسی زمانہ میں غزل کلیتہً عشقیہ شاعری کے لئے مختص تھی جیسا کہ خود اس کے نام سے نمایاں ہے اور اب بھی بڑی حد تک حُسن وعشق۔ ناز وانداز۔ وفا وجفا۔ گل وبلبل۔ ساقی ودل ہی سے اس کا تعلق ہے۔ لیکن عرصہ دراز سے اس میں اخلاقی اور حکیمانہ وصوفیانہ مضامین بھی لکھے جانے لگے ہیں۔ چونکہ تصوّف اور عشق دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں اور عرفان، بے تعشق ایک لفظ ہے بے معنیٰ یا ایک قالب ہے۔ بے جان کیوں نہ ہو جبکہ جلوۂ حُسن دونوں جگہ موجود ہے البتہ ایک فانی اور زوال پذیر ہے۔ دوسرا باقی اور ابدی اور اسی لحاظ سے دلدادگان حسن فانی اور دار فتگانِ جمال ابدی دونوں اگرچہ اپنے دلوں میں حرارتِ عشق رکھتے ہیں۔ اور حُسن فانی بھی اُسی جمالِ ابدی کا ایک پرتو ہے اور اس حرارت کا منبع بھی وہی شعلۂ طور ہے مگر پھر بھی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ع

جس کا جتنا ظرف تھا اتنے اُسے ساغر ملے۔

فنِ شاعری پر صوفیائے کرام نے جس قدر احسان کیا ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا رنگِ تصوف سے نہ صرف شاعری میں چار چاند لگائے بلکہ اس کو عالم ملکوت کی سیر کرائی۔ اور معراجِ کمال پر پہنچایا۔ حضرت وطنؒ کا بھی سارا کلام سراپا تصوف اور معارف وحقائق یا اخلاق وحکمت پر مشتمل ہے یا پھر آیاتِ قرآنی واحادیثِ نبویؐ کا ایسا صاف اور سلیس ترجمہ ہے کہ ایک عامی بھی اُسے بے تکلف سمجھ لیتا ہے۔

صوفیائے کرام کی شاعری صرف شاعری نہیں ہوتی بلکہ ان کو ان ہی نازک خیالی ندرت طرازی وغیرہ کے ساتھ ساتھ اپنے واقعات وحالات وواردات قلبی ومکاشفات وغیرہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہ اس سے اہلِ مذاق کیف وسرور حاصل کریں۔ عام شاعر تخیلات کی الجھنوں میں پھنسے رہتے ہیں اور ان حضرات کو کسی معنی ومضمون کی تلاش وجستجو نہیں ہوتی بلکہ اِن پر فضل الٰہی سے وقتاً فوقتاً جو کیفیات طاری ہوتی ہیں انھیں کو بلاایچ پیچ کے وہ موزوں فرمادیتے ہیں۔ تاکہ اُن کے ارادتمندوں اور معتقدوں کے لئے باعثِ رفع شکوک والتفاتِ مسائل وموجبِ ترقی منازل ومدارج تصوف وتوحید ہوسکے۔ خواہ عام مذاق کے لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ اسی مضمون کو حضرتِ وطنؒ ایک جگہ اپنے مقطع میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ

خوش سخن سے مرے ارباب طریقت ہیں وطن
اہلِ تقلید کو کب ہے مرے اشعار سے انس

زبان حضرت وطنؒ کی نسبت ہم نے تذکرہ ہی میں یہ عرض کردیا ہے کہ آپ ٹھیٹ دکھنی ہیں اس لئے آپ کی زبان بھی دکھنی ہونی چاہیئے اور آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اپنی اصلی زبان ہی میں فرماتے ہیں اور اس کو اسی لحاظ سے دیکھنا چاہیئے مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت کے کلام میں بہت کم ایسے الفاظ ہیں جن پر دکھنی الفاظ کا اطلاق ہوسکتا ہے حالانکہ وہ آج سے تخمیناً ایک صدی قبل پیدا ہوئے تھے اور ابتدا سے اُن کا تعلق ایسی صحبت سے رہا جو قدامت پسند اور ٹھیٹ دکھنی تھی اور وہ تمام اثرات جو داغ۔ امیر۔ ظہیر وغیرہ کی تشریف فرمائی کے بعد دکھنی زبان پر پڑے ہنوز دور تھے مگر پھر بھی آپ کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں گزرتی۔ چنانچہ بطور نمونہ بعض اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں جن سے یہ تمیز دشوار ہے کہ یہ شعر کسی دکھنی کے ہیں یا کسی اہلِ زبان کے۔ ملاحظہ ہو۔

ہو کے بے سدھ سو رہا ہوں گوشۂ تربت میں میں　　لیٹتا ہے جس طرح تھک کر مسافر دور کا

بے ساختہ کہتا ہوں نہیں اس میں بناوٹ　　سب مارے ہوئے ہیں ترے بیساختہ پن کے

مٹ گیا آئینۂ دل سے جو زنگارِ خودی　　کھل گئی قلعی کہ یہ شانِ خدا ہے کہ نہیں

اس کے علاوہ بعض ایسے محاورات و الفاظ بھی حضرت کے کلام میں ملیں گے جو اس وقت دکن میں غیر مستعمل ہیں مگر اس اختلاف سے خوبیٔ کلام میں کوئی فرق نہیں آتا جو ظاہر بیں قدیم الفاظ یا محاورات یا متروک تراکیب دیکھ کر شعر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہی الفاظ یا ترکیب جو آج متروک ہے کل مستعمل تھی اور اب بھی اس شعر میں اس نے ایک خاص لطف پیدا کردیا ہے یا کم سے کم وہ اس وقت شعر کے حسن میں ہارج نہیں ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کو مولانا عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اُردو نے اپنے مقدمہ انتخاب کلام میر میں نہایت وضاحت سے تحریر فرمایا ہے۔ ع مستند ہے ان کا فرمایا ہوا ہمیں اسی لحاظ سے کلامِ حضرتِ وطنؒ میں بھی ایسی چند مثالیں ملیں گی، ہم خود حضرت کے بعض ایسے ہی اشعار ذیل میں نقل کردیتے ہیں۔ تاکہ ہمارے مطلب کی وضاحت کے ساتھ دکھنی زبان کی تحقیق و تلاش کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ آج سے تیس ۳۰ سال پہلے دکن کے خواص کی زبان کیا تھی اور اس قلیل عرصہ میں کیا سے کیا ہوگئی۔

اہلِ جنت کو جہاں ہو خارِ بن　　دیکھ لیں گر نزہتِ گلزارِ شیخ

بکڑ بیٹھے! اسیچ پیچانتا ہوں میں　　برقع نہ رخ پہ لیجئے پہچانتا ہوں میں

چلو کے اس گلی سے مری لاش لیچلو　　ورنہ رہے گا بوجھ مرا سر پہ یار کے

مغز اتنا ہے کہاں سر کہ جو اسرار کو پائے　　گولہ گٹھڑی ہے سراسر یہاں عقلِ دوسرا

دھن میں اس سہ کے ہے اوجیالا دل صد چاک میں　　چھت جو ہو بوسیدہ شب گرتی ہے چھن کر چاندنی

ٹیڑھیاں کرتے تھے کیا کیا عالم امکان میں　　خانہ تربت نے ہم کو خود بخود سیدھا کیا

گرہ دل کے تئیں اپنے وطن واں لے جا　　ہیں جناب شہ اکبر بھی ترے عقدہ کشا

اہل انصاف جانتے ہیں کہ حضرت وطن ہی پر کیا موقوف ہے کسی اور کے کلام میں بھی صرف متروک الفاظ کا ہونا شاعر کو مورد الزام نہیں قرار دیتا کہ جو الفاظ آج متروک ہیں ممکن ہے کہ وہ اس زمانہ کے روزمرہ میں داخل ہوں بلکہ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ کا انداز بیان نہایت صاف و ستھرا ہے اور جو خیال کہ دل میں آتا ہے اس کو بلا ایچ پیچ اور بغیر کسی تصنع کے سلیس اور عام فہم زبان میں ظاہر فرما دیتے ہیں البتہ بہ اقتضائے دیگر معاصرین رعایت لفظی کو کسی قدر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

میں وہ ہوں ایک در بحر معنی سراغ صورت کا میرے پانی

کیا ہے بادل نے زہرہ پانی جو دل کو اپنے گھٹا گھٹا کر

طاق ہیں قصر عبادت میں وہی لوگ وطن　　طاق ابرو کو جو محراب دعا کہتے ہیں

کھلتے ہیں درمیان کے سب پیچ یک بیک　　رکھ دیجے پائے یار پہ پگڑی اتار کے

اس کے سوا عاشقانہ اسلوب کے بھی بیان سے آپ کا کلام عاری نہیں اور آپ نے کہیں کہیں ایسے رنگ میں بھی فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کس رشک گل نے پہنی ہے بر میں قبائے سرخ　　کانٹے کھٹک رہے ہیں جگر میں بہار کے

چاند ہوتا ہے اسی دن مذہب عشاق میں　　بھولے بھٹکے جب نظر آ جائے ہے ابروئے دوست

دیکھیں چشم و لب و جاناں تو خیر ہو سب کو　　زیست کہتے ہیں کسے کس کو قضا کہتے ہیں

آپ نے ہوش سنبھالا اور شعر گوئی شروع کی تو پہلی ہی پرواز اوج حقیقت تک تھی اس لئے آپ کی شاعری کو آپ کے معاصرین سے خاص امتیاز رہا مگر قادر الکلامی کی شان دیکھو جب معاصرین کی صف میں ہوتے ہیں تو اس رنگ میں بھی کسی سے آپ پیچھے نہیں رہتے بلکہ اس خاص انداز میں بھی جو کچھ فرماتے ہیں وہ بھی خالی از بانکپن نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

آنکھیں انھیں دکھلائے جو تو ناز سے تن کے　　رم جان کرے تن سے غزالان ختن کے

دار کھا کر تیغ ابرو کا نہ تاب رخ کو دیکھ　　حق میں زخمی کے مضر ہوتی ہے اکثر چاندنی

نکات و معرفت کے علاوہ پند و موعظت بھی فرمائی ہے جو بزرگان سلف کا طریقہ تھا چنانچہ بے ثباتی عالم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

کہاں مرتے ہیں مرنے والے حق پر　　جہاں جینے پہ ہاں جی دے رہا ہے

طرہ و جبغہ پہ اپنے سر اٹھا منعم نہ تو ٹھوکروں میں رہروؤں کے افسر فغفور ہے
گور میں لپٹے کفن سے کل رہو گے اے وطن آج تو بیٹھے ہو تم گھر میں بچھا کر چاندنی

حضرتِ وطنؒ اگرچہ چشتیہ و قادریہ دونوں سلسلوں کے صاحب اجازت تھے مگر غلبہ آپ پر ہمیشہ چشتیہ رنگ کا ہی رہا۔ اور آپ کا مسلک توحیدِ وجودی ہے۔ مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ موجودہ دورِ ابتلا میں جبکہ اور تو اور خود مدعیان وحدت الوجود کا بھی یہ عالم ہے کہ وجود موجود کی تمیز باقی نہیں رہی اور ہر شخص بہ بانگ دہل خدائی کا دم مارتا ہے اور بجائے خود فرعونِ بے سامان بنا ہوا انا ربکم الاعلےٰ کا آوازہ بلند کرتا ہے اور اپنے آپ کو منصور وقت خیال کرتا ہے لہذا حلقہ بگوشان حضرتِ وطن و ارادتمندان خاندان افتخاریہ ذیل کے اشعار بنظرِ تامّل دیکھیں تاکہ افراط و تفریط سے بچ کر جادۂ اعتدال پہ گامزن ہو سکیں۔

لفظ انا تو کہتے ہیں اربابِ معرفت معلوم ہو جو غور کریں دار کی طرف
پایا نہ آپ کو یہ ہمہ اوست کہتی ہے پوچھو خدائی سے کہ خدا ہی خدا ہے کیا
سمجھی اگر بہت تو ہمہ اوست کہتی ہے خلقت کے ذہن میں یہی عالم خدا ہے کیا

(حق طبع محفوظ)

غزل

از جناب میرزا علی رضا ماہر شیرازی لکچرار فارسی سٹی کالج

پھر آئی عقل مرکز پر مکاں سے لامکاں ہو کر گلی نے یار کی چکر میں ڈالا آسماں ہو کر
چھپانے سے چھپا ہے حسن ذاتی کب عیاں ہو کر نقاب رخ اڑے گا میرے مہرو کا کتاں ہو کر
وفورِ گریہ نے سننے دیا ان کو نہ دکھ اپنا زباں پر رہ گئیں مطلب کی باتیں ہچکیاں ہو کر
نہیں ہیں جھریاں اپنے بدن پر عہدِ پیری میں اترتا ہے لباسِ جسم تن سے دھجیاں ہو کر
خدا جانے کہ سر پر کس کے یہ طوفان ٹوٹے گا چمکتی ہیں نگاہیں آج ان کی بجلیاں ہو کر
عدم اور زندگی اپنی فقط دھوکا ہی دھوکا ہے کہاں تھے ہم کہاں آئے کہاں پہنچے کہاں ہو کر
کھچا جاتا ہوں جس جانبِ اشارہ ان کا ہوتا ہے پڑا ہے عشق کا پھندا گلے میں ریسماں ہو کر
نہ گرتے اشک آنکھوں سے نہ اڑتا رنگ رخ اپنا کیا رسوا انہیں دونوں نے آخر ہم زباں ہو کر
چراغ ایسا جلایا اس قدر سوزِ جدائی نے اڑا جاتا ہوں خود میں اپنی آہوں سے دھواں ہو کر
شرارہ تھے تجلی تھے خدا جانے کہ ہم کیا تھے عناصر نے پھنسایا ہم کو رازِ کن فکاں ہو کر
تری شیریں کلامی سے پسیجا دل نہ اس بت کا ہوا کیا فائدہ دنیا میں ماہر خوش بیاں ہو کر

علاماتِ وقف

از جناب زبید احمد ایم اے پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی کالج، حال ریسرچ اسکالر لندن (یونیورسٹی)

میں اپنے لائق دوست سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے کہ آپ کی بدولت۔ اس ہزاروں کوس کی روح فرسا غربت میں جہاں ہر چیز ایسی ہی اجنبی ہے جیسی کہ قفس کی تیلیاں طائر نو گرفتار کی نگاہ میں جہاں عزیز ہندوستانی ایسے ہی خال خال نظر آتے ہیں جس طرح بحیرۂ عرب کے وسط میں چند پرند اڑتے ہوئے جہاں آفتاب اُردو کی روزانہ ضیاپاشی و دماغ افروزی سے اس زبان لطیف کے عاشقوں کو ایسا ہی بُعد ہے جیسا کہ مئی و جون کے مہینوں میں ہندوستان کو سردی سے۔ یا ماہ دسمبر و جنوری انگلستان کو گرمی سے۔ اُردو کے بہترین رسائل و مجلات مطالعہ کے لئے مل جاتے ہیں۔ غلام محی الدین قادری صاحب محتاج تعارف نہیں۔ آپ اُن چند سعادت مند۔ صاحب فضل اور ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جن کے ابتدائی زمانہ طالبعلمی کے کارنامے۔ اُن کے مستقبل قریب میں اُردو کے مایۂ ناز جید عالم ہونے پر بداہتہً دلالت کر رہے ہیں۔ آپ اس کم عمری میں کئی ایک مفید اور علمی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں سے روح تنقید میری تنقید و تعریف سے بالاتر ہے آجکل آپ یہاں جس مستعدی و جوش۔ ہمت و استقلال تندہی و جانفشانی کے ساتھ دادِ تحقیق و تجسس دے رہے ہیں وہ سزاوار صد تحسین و آفرین ہے۔

مجلہ مکتبہ بابتہ مئی ۱۹۲۸ء موصوف کی بدولت میرے مطالعہ سے گزرا دلچسپ پرچہ ہے اور ہونہار۔ اِس میں ایک مضمون جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین کا 'اشاراتِ اعجام' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو کافی دلچسپ اور جاذب توجہ ہے۔ میں جناب موصوف کی پیش کردہ اصطلاحات کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ان علامات کی ضرورت سے فی الواقع کوئی سلیم العقل انسان انکار نہیں کر سکتا۔ افسوس ہے کہ اب تک اِن کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی۔ جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد یہ علامات نہایت پابندی و سختی کے ساتھ

مروج ہو جانے چاہئیں۔

قابل مضمون نگار نے جو اصطلاحات پیش کی ہیں مجھے اکثر سے اتفاق ہے۔ صرف دو تین کی بابت کچھ اختلاف ہے جسے سطور ذیل میں عرض کرتا ہوں۔

۱۔ اشارات اعجام۔ غیر مانوس ترکیب ہونے کے علاوہ معنے کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں۔ اعجام عربی میں حروف منقوطہ پر نقطے لگانے کو کہتے ہیں۔ مثلاً جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ لگا دینا یا یائے تحتانی کے نیچے دو نقطے لگا دینا۔ اعجام ہے۔ میرے نزدیک علامات وقف زیادہ مانوس اور صحیح ہے۔ لفظ وقف کو کسی دوسرے معنی سے اشتباہ نہیں۔ شرعی اصطلاح 'وقف' سے اشتباہ ہو دوازکار ہے کہ وہ دوسرے فن کے متعلق ہے ایک ہی فن کی اصطلاحوں میں اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے۔ حروف منقوطہ کے نقطے اور وقف کے علامات ایک ہی فن یعنے فن املا کی اصطلاحات ہیں۔ لہٰذا اس اشتباہ کو دور کرنے کے لئے 'علامات وقف' بہتر ہے۔ علاوہ بریں یہ ترکیب بمقابلہ 'اشارات اعجام' کے بہت مانوس ہے۔

۲۔ "فل سٹاپ" کے لئے وقفہ بہتر ہے۔ قاطعہ سے قطع نظر کیجئے۔

۳۔ "سمی کولن" کے لئے نیم وقفہ مناسب ہے۔ "مفررہ" سے اردو کو گراں بار نہ فرمایئے اس کے لئے 'رابطہ' بھی موزوں نہیں۔

۴۔ "کولن" کے لئے بجائے 'شارحہ' کے مفسرہ بہتر سمجھتا ہوں۔ کہ لفظ 'شارحہ' کے مقابلہ میں شگفتہ ہے۔ حائے حطی اور ہائے ہوز کا اجتماع ثقالت سے خالی نہیں۔ علاوہ بریں 'مفسرہ' کی اصطلاح نحو میں پہلے سے موجود ہے اور وہ اسی قبیل سے ہے دونوں میں اتنا فرق نہیں۔ جتنا نقطوں اور علامات وقف میں ہے۔ لہٰذا آخر الذکر صورت میں دونوں کے لئے ایک اصطلاح نہیں ہونی چاہیئے۔ دوسرے 'جملہ مفسرہ' نحو کی اصطلاح ہے اور محض 'مفسرہ' علم املا کی۔

۵۔ "کاما" کے لئے سکتہ بہتر ہے۔

۶۔ "ان ورٹیڈ کاماز" کے لئے بجائے 'ممیزہ' یا 'ناقلہ' کے 'واوین' مناسب ہے کہ عرصہ سے مروج ہے اور اپنے مفہوم پر پوری طرح دلالت کرتا ہے۔

۷۔ "کوئیری" کے لئے۔ استفہامیہ بہتر ہے۔

۸۔ "ڈیش" کے لئے۔ میری یہ گزارش ہے کہ اسی لفظ کو قبول کر لیا جائے کہ سہل التلفظ اور سہل الاملا ہے۔

۹۔ "انٹرجکشن" کے لئے بجائے 'انجذابیہ' یا 'فجائیہ' کے محض 'جذبیہ' پیش کرتا ہوں۔
۱۰۔ "ہائی فن" کے لئے رابطہ موزوں ہے۔
۱۱۔ "اکویشن" کے لئے متساویہ ٹھیک ہے
۱۲۔ "بریکیٹ" کے لئے بیانیہ وتفریقیہ کے مقابلہ میں 'قوسین' بہتر ہے کہ عرصہ سے مروج ہے اور مفہوم پر بالذات دلالت کرتا ہے۔
۱۳۔ "ڈاٹس آف اومیشن" کے لئے 'تقدیریہ' مناسب ہے۔
میری ناچیز ترمیم کے بعد علامات وقف حسب ذیل ہوئے۔

علاماتِ وقف

اُردو نام	انگریزی نام	علامت
۱۔ وقفہ	فل سٹاپ	۔ ، ٠
۲۔ نیم وقفہ	سمی کولن	؛
۳۔ مفترہ	کولن	:
۴۔ سکتہ	کاما	،
۵۔ وادین	ان ورٹیڈ کاماز	" "
۶۔ استفہامیہ	کوئری	؟
۷۔ ڈیش	ڈیش	—
۸۔ جذبیہ	انٹرجکشن	!
۹۔ رابطہ	ہائی فن	-
۱۰۔ متساویہ	ایکویشن	=
۱۱۔ قوسین	بریکٹیس	( )
۱۲۔ تقدیریہ	ڈاٹس آف اومیشن	......

اردو شاعری اور جدید عروض

از جناب محمد سراج الدین صاحب طالب

(۲)

اب ہم شاعری اور عروض کے ان اعتراضات سے گزر کر اُن اصلاحات کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو لائق افراد زبان نے پیش کی ہیں۔

مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے شاعری سے متعلق سب سے پہلی اصلاح یہ پیش کی ہے کہ "شاعری کو قافیہ کے استبداد سے نجات دلوائی جائے .... اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے۔ اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان ماردی جائے"۔ اس میں دو اصلاحوں کا ذکر ہے اول تو یہ کہ قافیہ کو شاعری سے خارج کردیا جائے دوسرے یہ کہ غزل کو بھی سلام ہو۔ خاں صاحب غزل سے اس واسطے بیزار ہیں کہ اس میں مسلسل نظم نہیں لکھی جاسکتی اور قافیہ سے اس وجہ سے متفق نہیں ہیں کہ شاعر کے خیالات اس کی اتباع میں مقید و پابند ہوجاتے ہیں ہم نے قبل ازیں یہ بتا دیا ہے کہ مسلسل گوئی کا ارادہ ہو تو غزل کو چھوڑیے اور کسی اور صنف میں شاعری کیجیے۔ یوں تو شعرا غزل میں بھی کچھ اشعار قطعہ بند کرکے کسی مختصر واقعہ کو بیان کرجاتے ہیں لیکن در اصل یہ اس قسم کی مسلسل گوئی کے لئے موضوع نہیں ہوئی ہے۔ مسلسل گوئی قطعہ میں یا مثنوی میں یا کسی اور صنف میں کی جاسکتی ہے۔ اب رہا قافیہ اس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ قافیہ شعر کہنے میں مخل نہیں ہوسکتا اس واسطے کہ مبتدی شاعر کے تخیلات قافیہ پر پھل پھول نکالتے ہیں۔ لائق اور کہنہ مشق شاعر کو زبان و بیان پر اتنا عبور ہوجاتا ہے کہ سینکڑوں ہم قافیہ الفاظ اس کے ذہن میں آناً فاناً پھر جاتے ہیں۔ کم علم اور مختصر معلومات والے شعرا کے لئے قافیہ البتہ بڑی کڈھب چیز ہے ان کو ہم ضرور یہ رائے دیں گے کہ وہ اس تکلیف میں نہ پڑیں اور اس کے عوض اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش کریں۔ اگر قافیہ مخل متصور ہو تو آج ہزار بلکہ سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے اسلامی دنیا کی عربی، فارسی زبانوں میں قافیہ والی شاعری ہوتی نہ آتی۔ اس کے ترک و لزوم کے متعلق ہم نے اپنے 'مقدمۃ العروض' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے یہاں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک حصہ نقل کردیں:۔

"ہمارے پاس قافیہ اور اس کا استعمال شاعری کا ایک جزو لاینفک ہے اور ہماری

طبیعتوں کو اس کے ساتھ ایک خاص لگاؤ بھی ہے جس سے ہیں وہ ایسا ذو بھر نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ مغربی اقوام کو ہمارے منھے منھے بچے جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں تو اکثر سنا ہوگا کہ گفتگو میں قافیے بولتے ہیں یا الفاظ کو خواہ مخواہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم قافیہ بنا لیتے ہیں اور ان کے اس انسٹنکٹ میں (Instinct) زیادہ جوش اس وقت ہوتا ہے جبکہ آپس میں تند و تلخ گفتگو ہو۔ ہماری بعض بے علم عورتیں چکی پیستے ہوئے یا کسی شادی بیاہ کے رسوم مناتے ہوئے جو گیتیں گاتی ہیں اور جن میں اکثر ان کے طبعزاد ہوتے ہیں مقفیٰ ہوتی ہیں حالانکہ وہ یہ امر تک نہیں جانتیں کہ قافیہ ہے کیا چیز اور روی ہے کیا بلا۔ مگر آواز کے رکاؤ اور بہاؤ کو خوب سمجھتی ہیں اسی امتیاز پر وہ قافیہ کا استعمال کر جاتی ہیں........"

دوسری اصلاح جو پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ "غزل کے ساتھ موجودہ شعر و سخن کے اور سانچے اس قابل ہیں کہ ان کو بے دردی کے ساتھ اردو شاعری سے نکال دیا جائے"۔ اور اس کے عوض "اپنی نظم کے لئے انگریزی شعرا کی طرح اپنا اپنا سانچہ اپنے اپنے خیالات کی ضرورت اور رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے" اختراع کرکے استعمال میں لائیں ہمارے شعر و سخن کے سانچوں کو خدا جانے اس قدر برا کیوں سمجھا جارہا ہے اگر کوئی شاعر عشقیہ مضامین کے سوائے اخلاقی یا ادبی مضامین نظم نہیں کرتا ہے تو شاعر کی غلطی ہے۔ سوسائٹی عام عشقیہ اشعار کے علاوہ اگر فلسفیانہ یا اخلاقی یا علمی اشعار کو پسند نہیں کرتی ہے تو یہ سوسائٹی کی غلطی ہے کوئی شاعر اپنے خیالات کے موافق اگر اپنی نظم کے لئے کوئی مناسب وزن اختیار نہیں کرتا ہے تو اس میں موزونیت یا وزن پر کیا الزام آسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے علم عروض کی عدم واقفیت اس خیال کیلئے وجہ تحریک ہوئی ہو تا کہ ....

.................اس سے تنفر ظاہر کرکے ان غلطیوں سے بچیں جن کے واقع ہونے کا اپنی عدم واقفیت کے باعث احتمال و امکان ہے یا ممکن ہے کہ یہ خیال ہو کہ ہمارا عروض و شاعری سائنٹی فک اصول کے موافق نہیں جس کا اظہار ایک جگہ اس طرح کیا گیا ہے "ہندی عروض میں بھی قدامت پسندی اور سانچے معین کر دینے کے رجحان نے ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے اور جس نہج پر پنگل بدرن کیگئی ہے وہ نہایت فرسودہ اور غیر سائنٹی فک ہے۔ ہندی عروض کے اصول سائنٹی فک مطالعہ اور تجربہ کے بعد اردو کے نئے عروض کی نیو قرار دیئے جائیں عربی عروض کی جو بحریں ان اصول کے مطابق ثابت ہوں وہ رکھی جائیں"

اگر ہمارے عروض کو غیر سائنٹی فک سمجھا جاتا ہے تو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ یہ سوءِ ظن خود غیر سائنٹی فک ہے۔ تقریباً ہر زبان میں بناء وزن جزو لفظی پر قائم ہے اور اشعار مرکب ہوتے ہیں الفاظ سے پس دریافت وزن شعر کے متعلق ہر زبان کا ابتدائی اصول ایک ہے البتہ کسی زبان میں تجزیہ کی کوئی مخصوص ترتیب لازمی قرار دی گئی ہے۔ ترتیب کا لزوم ایک ذیلی اضافہ ہے جو اُن لوگوں کے مذاق کے اعتبار سے جو اُس زبان کے بولنے والے ہیں قائم ہوا ہے جب ابتدائی اصول سب کا ایک ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک زبان کا عروض سائنٹی فک ہو اور ایک کا غیر سائنٹی فک اگر میں انگریزی عروض سے ناواقف ہوں تو یہ بالکل ممکن ہے کہ میں یہ کہدوں کہ انگریزی شاعری کے اوزان بالکل بے اصول ہیں اور اس امر کا لحاظ کئے بغیر کہ اُس زبان کے بولنے والے کن اوزان میں شاعری کرتے ہیں یہ تحریک کردوں کہ انگریزی شاعری ہمارے عروضی اوزان میں بالکل سائنٹی فک ہو جائیگی تو یہ بالکل بے اصول بات ہوگی اگر ہمارا عروض کچھ ٹیڑھا ہے تو یہ ممکن ہے کہ اس کی اصلاح و درستی اس طرح کی جائے کہ اس کی اصلیت میں فرق نہ آئے۔ لیکن یہ کس طرح درست ہوسکتا ہے کہ اس کی خاطر شاعری کے اوزان اور سانچے سرے سے بدل دیئے جائیں یا بہ الفاظ دیگر سارے زبان بولنے والوں کو مجبور کیا جائے کہ اُن پرانے اوزان میں شاعری نہ کیجائے۔ شعرا سانچے اور اوزان وہی استعمال کرتے ہیں جو مقبول عام ہوں یا ہوگئے ہوں اور اسی میں ان کی کامیابی مضمر ہوتی ہے ورنہ ہمارے شعرا نے اختراع اوزان میں کوتاہی نہیں کی ہے اور نہ ہمارا عروض اس قسم کی ایجاد و اختراع میں ہارج و مانع ہے۔ فارسی شعرا نے بہت سے اوزان ایسے اختراع کئے جو عام مذاق کے موافق نہ تھے اور اردو کے بھی بعض شعرا نے بھی ایسی جدت کی لیکن وہ اوزان قبولیت عام حاصل نہیں کرسکے چنانچہ فیض علیہ الرحمۃ نے ایک ایسی بحر میں جو قدیم بحروں سے بالکل الگ ہے ایک غزل لکھی جس کا مطلع ہے۔ ؎

جو شکل تری نگار میں نے دیکھی تو زیست تک نہ بہار میں نے دیکھی

یہ وزن گو بالکل نامانوس نہیں ہے تاہم مقبول نہ ہوسکا اس ایک غزل کے سوائے کوئی قطعہ یا شعر اس وزن میں اب تک کہا یا سنا نہیں گیا۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ سائنٹی فک مطالعہ کے بعد ہندی عروض کو اردو عروض کی نیو قرار دیا جائے اور اسی خیال کو دوسری جگہ ان الفاظ میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے "اُردو عروض کی بنیاد ہندی پنگل پر رکھی جائے" اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تجزیہ لگھو اور گرو پر کیا جائے اور تقطیع میں ایسے تین اجزائے استعمال کئے جائیں جیسا کہ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے کیا ہے وہ ایک

دو اور تین اجزا والے ارکان تقطیع کے لئے لیتے ہیں جن کی جملہ تعداد چودہ ہوتی ہے تفصیل یہ ہے (یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ ایک حرف متحرک نہ زبان ہندی میں رکن کہلاتا ہے نہ انگریزی میں نہ عربی میں۔ حرف کو محض تجزیہ کے لئے لیا گیا ہے اس طرح تو ہمارے عروض میں بھی حرف متحرک موجود ہے مگر چونکہ تقطیع میں اس سے کوئی کام نہیں پڑتا اس لئے اس سے قطع نظر کیجاتی ہے اور اس کے مرکبات سے کام لیتے ہیں جیسا کہ قبل ازیں ایک جگہ بیان کیا جا چکا ہے) :-

نمبر شمار	ہندی علامت	انگریزی علامت	[illegible]	انگریزی نام	نمبر	
۱	ا	⏑	فَ	UNACCENTED SYLLABLE.	I	علامات کو داہنی طرف سے پڑھیے۔
۲	ऽ	—	فَع	ACCENTED " "	2	
۳	ऽऽ	— —	فعلن	SPONDEE	3	
۴	ऽا	—⏑	فَعَل	LAMBUS	4	
۵	اऽ	⏑—	فعلُ	TROCHEE	5	
۶	اا	⏑⏑	فَعَ	PYRRHIC	6	یہ انگریزی میں اعاریض وضروب (یعنی مصرعوں کے آخر) سے مخصوص ہے
۷	ऽऽऽ	— — —	مفعولن	MOLOSSUS (Cr.)	7	
۸	ऽऽا	— —⏑	فعولن	BACCHIUS.	8	
۹	ऽاऽ	—⏑—	فاعلن	CRETICUS.(INLATIN)	9	
۱۰	ऽاا	—⏑⏑	فعلن	ANAPAEST.	10	
۱۱	اऽऽ	⏑— —	مفعولُ	ANTIBACCHIUS.	11	
۱۲	اऽا	⏑—⏑	فعولُ	AMPHIBRACH.	12	
۱۳	ااऽ	⏑⏑—	فاعلُ	DACTYL	13	
۱۴	ااا	⏑⏑⏑	فعلُ	TRIBRACHYS.	14	حسب ذیل کے لئے خالصاً یہاں اجزا ہیں اور اجزا زائد ہمارے اضافے ہیں
۱۵	ऽऽऽا	— — —⏑	مفاعیلن	EPITRITES.	15	
۱۶	ااऽऽ	⏑⏑— —	مستفعلُ	" " MAJOR.	16	انگریزی اور لاطینی زبانوں میں ان میں سے بعض مستعمل نہیں ہیں
۱۷	ऽऽاا	— —⏑⏑	فعلاتن	" " MINOR.	17	

خانصاحب نے چار یا پانچ یا اس سے بھی زیادہ اجزا والے ارکان کو یہ کہکر چھوڑ دیا ہے کہ "چار اور پانچ اور اُن سے بھی زیادہ ارکان والے الفاظ بھی انہیں ارکان سے مرکب ہوتے ہیں مثلاً (۱) مستفعلن یہ ان اجزا سے مرکب ہے فعْ لُن فَ عِلُن = - - س — یا ۲ ۲ ۱ ۲" یہی خیال ہے تو اُن چودہ ارکان میں سے جو بتائے گئے ہیں۔ مفعولن فعولن فاعلن وغیرہ کب مرکب نہیں ہیں ان کو کیوں شمار کیا جاتا ہے اس میں تو اور زیادہ آسانی تھی کہ صرف ایک لگھ اور ایک گر پر تجزیہ کا دار و مدار رکھکر ورنک طریقہ تقطیع سے قطع نظر ہی کر لیجاتی۔ جس طرح ہندی میں لگھ اور گر سے ارکان بنتے ہیں اسی طرح ہمارے پاس اسباب و اوتاد سے رکن بنتے ہیں جملہ ارکان دس ہیں اگر ان میں سے فاعِ لاتن اور مستفع لن منفصل کو خارج کر دیا جائے تو صرف آٹھ ہی ارکان رہتے ہیں ان میں سے کوئی بھی تین اجزا سے زیادہ پر مشتمل نہیں (یوں اگر ایک حرف متحرک کو بھی جزو شمار کیا جائے تو یہی ارکان چار اجزا کے بھی ہو جاتے ہیں اور پانچ کے بھی) مذکرۂ بالا ارکان میں سے تین صرف ایسے ہیں جو ہمارے عروض میں مستعمل نہیں ہیں باوجود ان ارکان کو شمار میں داخل کرنے کے اشعار کی تقطیع میں ان میں سے اکثر کو خانصاحب لیتے نہیں بلکہ اور تحلیل کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ رکن فاعلن آتا ہے اس کو نہیں لیتے بلکہ اُس کو تحلیل کر کے فعْ فَعَلُن کر لیتے ہیں
اس میں تین کمزوریاں ہیں (۱) ہر وزن میں ترتیب اجزا کا بالتفصیل و علی الترتیب ازبر رکھنا۔ (۲) یہ معلوم کرنا کہ بشرام یا یاز یا وقفہ ہے یا نہیں اگر ہے تو کس رکن پر واقع ہے (۳) اگر اس میں وقفہ نہیں ہے تو آیا اس وزن میں اس کا ہونا جائز ہے یا نہ ہونا۔ ہمارے علم عروض میں بشرام یا وقفہ سے کوئی بحث ہی نہیں، ترتیب اجزا کی تسہیل اس طرح کی گئی ہے کہ کئی اجزا کو ایک جگہ کر کے ایک رکن بنا لیا اور اس ایک رکن سے اُتنے اجزا کے لفظ کو تول لیا۔ ہمارے عروض میں مشکل پوچھو تو یہی ہے کہ حرکات و سکنات الفاظ کے لحاظ سے اُن کا ہم وزن کوئی رکن ہر ایک لفظ کے مقابل رکھا جائے اور یہ دشواری اس وقت تک رفع نہیں ہو سکتی جب تک کہ بحور کے اوزان اصلی کو یاد نہ رکھا جائے اور اس میں کامیابی اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ طالب علم دائرے کے اصول کو سمجھ لے۔ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کی طرز تقطیع میں زیادہ دشواری اُس وقت پڑیگی جبکہ کسی ایسی نظم کا وزن معرض فیہ ہو۔ جس میں مختلف تبدیلیوں کی وجہ سے اشعار ایک وزن پر قائم نہ ہوں جیسا کہ بحر متقارب یا بحر ہزج مسدس اخرم یا اخرب میں ہوا کرتا ہے۔ اس کو صاف طور پر سمجھنے کے لئے مولوی امداد علی صاحب بحر کی ایک غزل کا یہ شعر لیجئے ؎

عرض[1] یہ ہے نقاشِ ازل سے — حب[2] کے نقش میں یار کو گھر دو

بلحاظ عروض اس کی تقطیع یہ ہوگی:-

(۱) عرض ۔فعلُ / یہ ہے نق ۔فعولن / قاش ۔فعلُ / ازل سے ۔فعولن۔

(۲) حب کے فعلن / نقش فعلُ / میں یار ۔فعولُ / کو گھر دو ۔فعولن۔

اِس کی اصل چونکہ فعولن آٹھ بار ہے اس لئے یہ بحرِ متقارب مثمن کے نام سے موسوم ہوگی مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کے بتائے ہوئے طریقہ کی تقطیع یوں ہوگی۔

عرض یہ ہے نق قاش ازل سے

ملہ ۲ ۱ ۱ ۲ ۲ ۲ ۱ ۱ ۲ ۲

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰

حب کے نقش میں یار کو گھر دو

۲ ۲ ۲ ۱ ۱ ۲ ۱۱ ۲ ۲

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰

اس تقطیع پر سے کوئی معیار صحت مقرر نہیں کیا جاسکتا اس واسطے کہ گو دونوں مصرعے دس دس ماتراؤں پر مشتمل ہیں لیکن لگھ اور گر کی ترتیب اِن دونوں مصرعوں میں ایک نہیں ہے۔ چنانچہ پہلے مصرعہ میں دوسری تیسری اور ساتویں اور آٹھویں ماترا لگھ ہے باقی گر اور دوسرے مصرعے میں چوتھی پانچویں اور ساتویں اور آٹھویں ماترا لگھ ہے۔ یہی فرق نہیں بلکہ اس وزن میں اس سے بھی زیادہ اختلاف آ آ ہے چنانچہ اسی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

جی جلتا ہے آہ کے جھو کو　　شمعِ محبت کو گُل کردو

اس کی عروضی تقطیع ان ارکان سے ہوگی۔

فعلن فعلن فعلُ فعولن　　فعلُ فعولن فعلن فعلن

اور اس کی ماترک تقطیع یہ ہوگی ؎

جی جل تا ہے آ ہ کِ جھو کو

۲ ۲ ۲ ۲ ۲ ۱ ۱ ۲ ۲

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹

شمع محب بت کو گل کر دو

۲ ۱ ۱ ۲ ۲ ۲ ۲ ۲ ۲

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹

اس کا خلاصہ تقطیع یہ ہوگا:۔ نو ماترا کا پہلا مصرع جن میں چھٹی اور ساتویں ماترا لگھ باقی گرا ور دوسرا مصرعہ بھی نو ماترا کا جن میں دوسری اور تیسری ماترا لگھ باقی گر ایک ہی غزل کے دو شعروں کے لئے بلکہ دو شعروں کے چار مصرعوں لے لئے چار معیار یاد رکھنے پڑے آئیں

ملہ۔ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے دو کی عدد گر کے لئے اور ایک کی عدد لگھ کے لئے استعمال کی ہے یہاں شعر کے تحت انہیں اعداد کو لیتے ہیں اور سب سے نیچے جو اعداد لئے ہیں وہ ہر مصرعہ کے ماتراؤں کی جملہ تعداد بتانے کے لئے مسلسل نمبر ہیں۔

چار پر اکتفا نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اختلاف اس وزن میں آتے ہیں چنانچہ اسی غزل کے اس شعر کو لیجیے ؎

ضعف کی راہ سے ہیں یہ سفر دو — دم کی آمد شد کیا کہیے

اس کی عروضی تقطیع ان ارکان سے ہوتی ہے ؎

فعلن فعلن فعلن فعلن — فعلُ فعولُ فعولُ فعولن

اور ماترک تقطیع یہ ہوگی ؎

دم	کی	آ	مد	شد	کیا	کہیے	
۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸

ضعف	کی	راہ	سے	ہیں	یہ	سفر	دو			
۲	۱	۱	۲	۱	۱	۲	۱	۱	۱	۲
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ پہلا مصرعہ آٹھ ماتراؤں کا جن میں سب کے سب گر اور دوسرا مصرع گیارہ ماتراؤں کا جن میں دوسری اور تیسری اور پانچویں اور چھٹی اور آٹھویں اور نویں ماترائیں لگھ باقی گر۔ اس کا معیار متذکرہ بالا اشعار کے معیار تقطیع سے بالکل الگ ہوا پس ماترک اور ورنک طریقہ سے اس ایک غزل کے صرف متذکرہ بالا تین اشعار کی تقطیع کے لئے حسب ذیل معیار یاد رکھنے پڑے:-

پہلے شعر کے دو مصرعوں کے علی الترتیب یہ دو اوزان ہیں :-

(۱) فعلُ فعولن فعلُ فعولن (۲) فعلن فعلن فعولُ فعولن ۔

ان دونوں اوزان کی ماترک تقطیع کا معیار یہ ہوگا۔

(۱) فع[1] ۔ ف ۔ ف ۔ فع ۔ فع ۔ فع ۔ ف ۔ ف ۔ فع ۔ فع ۔

(۲) فع ۔ فع ۔ فع ۔ فع ۔ ف ۔ ف ۔ فع ۔ ف ۔ ف ۔ فع ۔ فع

پھر اسی وزن کی ورنک ثنائی[2] تقطیع یہ ہوگی۔

(۱) فع ف / ف فع / فع ف / ف ف / فع فع /

یا تبدیل حروف یوں ۔ فعلُ / فعل / فعلُ / فَعَ / فعلن

---

[1] ۔ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے ماترک تقطیع میں یہی الفاظ و حروف استعمال کئے ہیں ہم بجنسہ انہیں کے الفاظ لئے ہیں ۔

[2] ۔ ورنک ثنائی اور ورنک ثلاثی اور ماترک تقطیع کے یہ سب طریقے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں جن کو ہم یہاں اپنے پیش کئے ہوئے اشعار کی تقطیع میں استعمال کر رہے ہیں جن کو اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا ہو وہ رسالہ اردو کے متذکرہ صدر نمبروں کا مطالعہ کریں ۔

(۲) فع فع / فع ف / ف فع / ف ف / فع فع یا بہ تبدیل حروف یوں:-

فعلن / فعلُ / فعل / فع / فعلن

اسی وزن کی ورنک ثلاثی تقطیع یہ ہوگی۔

(۱) فع ف ف / فع فع ف / ف ف فع / فع یا بہ تبدیل حروف یوں:-

فاعلُ / مفعولُ / فعلن / فع

(۲) فع فع / ف ف فع / ف ف فع / فع یا بہ تبدیل حروف یوں: مفعولن / فعلن / فعلن / فع

اب دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں کے اوزان لیجئے۔

(۱) فعلن فعلن فعلُ فعولن (۲) فعلُ فعولن فعلن فعلن

ان کی ماترک تقطیع کا معیار یہ ہوگا۔

(۱) فع فع فع فع ف ف فع فع۔ (۲) فع ف ف فع فع فع فع فع فع

اسی وزن کی ورنک ثنائی تقطیع یہ ہوگی۔

(۱) فع فع / فع فع / فع ف / ف فع / فع یا بہ تبدیل حروف یوں:-

فعلن / فعلن / فعلُ / فعل / فع

(۲) فع ف / ف فع / فع فع / فع فع / فع یا بہ تبدیل حروف یوں:-

فعلُ / فعل / فعلن / فعلن / فع

اسی وزن کی ورنک ثلاثی تقطیع یہ ہوگی۔

(۱) فع فع فع / فع فع ف / ف فع فع یا بہ تبدیل حروف یوں:-

مفعولن / مفعولُ / فعولن۔

(۲) فع ف ف / فع فع فع / فع فع فع یا بہ تبدیل حروف یوں:-

فاعلُ / مفعولن / مفعولن

اب تیسرے شعر کے دونوں مصرعوں کے اوزان لیجئے۔

(۱) فعلن فعلن فعلن فعلن (۲) فعلُ فعولُ فعولُ فعولن۔

ان کی ماترک تقطیع یوں ہوگی۔

(۱) فع فع فع فع فع فع فع فع (۲) فع ف ف فع ف ف فع ف ف فع فع

اس کی ورنک ثنائی تقطیع یہ ہوگی۔

(۱) فع فع / فع فع / فع فع / فع فع یا بہ تبدیل حروف یوں:۔

فعلن / فعلن / فعلن / فعلن

(۲) فع ف / ف فع / ف ف / فع ف / ف فع / فع

یا بہ تبدیل حروف یوں:۔ فعلُ / فعلُ / فَعَ / فعلُ / فعلُ / فعْ

اسی کی ورنک ثلاثی تقطیع یہ ہوگی۔

(۱) فع فع فع / فع فع فع / فع فع یا بہ تبدیل حروف یوں:۔

مفعولن / مفعولن / فعلن۔

(۲) فع ف ف / فع ف ف / فع ف ف / فع فع یا بہ تبدیل حروف یوں:۔

فاعلُ / فاعلُ / فاعلُ / فعلن

اس طومار کا خلاصہ یہ ہوا کہ ان تین شعر کے چھ معیار یاد رکھنے پڑے اور ماترک اور ورنک طریقہ کے دو حدائی ثنائی اور ثلاثی طریقوں کے الگ ایسے جملہ اٹھارہ اوزان ہوئے ان میں سے ہر ایک کے متعلق مخصوص قواعد الگ یاد رکھنے لازم ہیں اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ہمارے عروض کے چند زحاف کا یاد کرلینا اس عمل محال سے زیادہ آسان ہوگا کہ سب میں وزن اصلی ایک ہی ہے اور تغیرات ذیلی کا عقدہ چند زحافات کے علم سے ہوجاتا ہے اور یہ تمام مختلف اوزان جو ایک غیر فطری شاعر کے نزدیک بالکل متغائر ترنم کے نظر آتے ہیں درحقیقت ایک ہی وزن اور لے کے تابع نظر آئیں گے۔

اس امر کے متعلق کہ " ہندی عروض کے اصول سائنٹفک مطالعہ اور تجربہ کے بعد اُردو کی نئی عروض کی نیو قرار دئے جائیں"، ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ہر ایک زبان کے اصول اُسی زبان کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور وہ اُسی زبان کی حد تک سائنٹی فک اور معقول مانے جاتے ہیں۔ اگر ایک زبان کے ایسے مخصوص اُصول دوسری زبان میں لیئے جائیں تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ اس زبان کو صفحہ ہستی سے محو کرنے کی بناء ڈالی گئی۔ ایک زبان کے اصول پر دوسری زبان کے اصول کے لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو بہ اعتبار اختلاف مذاق فرق ضرور ہوگا۔ اِس فرق کو سائنٹی فک یا غیر سائنٹی فک اسی صورت میں کہا جاسکتا ہے جبکہ ہر ایک زبان کے اصول پر اُس زبان کے بولنے والوں کے مذاق عام کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے۔ (باقی دارد)

جیسی کرنی ویسی بھرنی

از جناب ڈی گرودداس متعلم بی اے عثمانیہ کالج

(۱)

مسٹر رام لال جب شانتی نگر کے منصف بن کر آئے تو وہاں کے لوگوں نے سمجھا کہ ہمارے لئے پرماتما نے ایک دیوتا کو بھیجا ہے کیونکہ رام لال ایک شریف فرض شناس نوجوان تھے۔ ان کے پاس سعی، سفارش، رعایت، رشوت کو مطلق دخل نہ تھا۔ خوشامدی، زمانہ ساز، اور بدمعاش ان کے روبرو جاتے ہوئے ڈرتے تھے، لیکن یہ سب کچھ "عصمت بی بی۔ از بے چادری" کے مصداق تھا۔ حکومت کے احساس اور روپیہ پیسوں کی جھنکار نے ان کو بے حس بنا دیا۔ ابھی پورے دو سال بھی نہیں گزرے کہ اپنے اصول سے ہٹ گئے۔

سفارش پر بیجا رعایت کر جاتے تھے اگر کوئی شخص تحفے تحایف لاکر دیتا تو شکریہ کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ طبیعت میں خوشامد پسندی پیدا ہو رہی تھی۔

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن رشوت کے شیطان نے ان کو کہیں کا نہ رکھا، پہلے پہلے اہل غرض کی خوشی اور مرضی پر اس کا انحصار تھا۔ لیکن بعد کو انصاف تعین قیمت پر فروخت ہونے لگا۔

نگر کے شریف لوگوں نے منصف صاحب کے طرز عمل کو دیکھا تو افسوس ہوا کہ ایسا دھرم آتما آدمی رشوت کے شیطانی پنجے میں کس طرح پھنس گیا، اب چھٹکارے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

ایک روز صبح کے وقت چند لوگ خوشحال داس زمیندار کی بیٹھک میں جمع ہوکر چلم اور تمباکو کا دور چلا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ تمباکو کے دھوؤں کے ساتھ ایک آدھ قہقہہ بھی سنائی دیتا تھا۔

منشی رام نارائن مختار نے کہا کہ ہمارے منصف صاحب اپنے فیصلوں کی قیمت دن بدن بڑھا رہے ہیں۔
رام سہائی کہنے لگے ارے بھئی گرہستی ہے رشوت نہ لے تو یہ فیشن کا خرچ کس طرح نکلے۔
(کھانس کر) رشوت لیتا ہے تو اپنا کیا آپ پائے گا........

بوڑھے ہرشچندر نے غصہ سے کہا رشوت کھانے سے جانور گاؤ بریا........ کھانا اچھا ہے یہ کیا اندھیر ہے جب حاکم رشوت لے تو پھر انصاف ہی کیا رہا"........

لالہ دونی چند چلم زمین پر رکھتے ہوئے ہنس کر کہنے لگے۔ اجی! یہ تو کلجگ ہے بھگوان رام چندر کا ست جگ ہے نہیں پھر ان کو کیوں دوش دیتے ہو؟ ....

بوڑھے خوشحال داس خوشی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے دونی ہمیشہ سے تمھاری عادت خوشامد کرنے کی رہی ہے منہ دیکھی بات ہمیں پسند نہیں ان کے سامنے تو جی حضور۔ سرکار کہتے ہو اور یہاں بیٹھ لگے ست جگ کو یاد کرنے ....

(سب سے مخاطب ہوکر) رام رام نکالو۔ اس پاپی کا ذکر صبح صبح رشوت لینے والے چنڈال کا نام لینا اور صورت دیکھنا مہاپاپ ہے۔

دونی چند نے خوشحال داس کی طرف ایک زہر آلود نگاہ ڈالی اور غصہ سے ہونٹ چبا کر رہگیا۔

یہ مجمع برخاست ہوگیا۔

رام لال منصف کے لئے نگر کے شرفا کے دل میں جو عزت محبت تھی وہ نفرت سے بدل رہی تھی خوشامدی (بدمعاش) خود غرض خوش ہو رہے تھے کہ اب ہماری چاندی ہی چاندی ہے۔

―――――(۲)―――――

رشوت کا روپیہ انسان کو نت نئی خواہش سکھاتا ہے۔ یہ کوئی محنت اور گاڑھے پسینہ کی کمائی تو ہے نہیں۔ کہ انسان ایک ایک پائی کی حفاظت کرے۔ ناجائز آمدنی کے ساتھ زندگی کی ضروریات بڑھ جاتی ہیں تنگ دستی میں تندرستی کا خیال بھی کم رہتا ہے مفلسی میں فیشن یاد نہیں آتا۔

رام لال نے اصول حفظان صحت کے مدنظر انگریزی وضع کی کوٹھی تعمیر کرائی۔ سواری کے لئے عمدہ عربی نسل کے گھوڑے کی ضرورت تھی۔ مکان میں عمدہ فرنیچر۔ اقسام کے پھول چمن بندی کا انتظام ہو رہا تھا ان کاموں کے لئے سب روپیہ .... رشوت کا جو کہ ایمان بیچ کر وصول کیا جا رہا تھا صرف ہو رہا تھا۔

نگر میں مقدمہ بازی اب کثرت سے ہونے لگی۔ منصف صاحب کی قسمت بھی چمک رہی تھی۔ دو سال پیشتر رام لال کی زندگی سیدھی سادھی تھی، لیکن اب حکومت کے سبب اس میں نمائش اور فیشن کو بہت کچھ دخل ہو چلا تھا۔

آج تعطیل کا دن تھا۔ منصف صاحب اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا سگریٹ پی کر اس کے دھوئیں کو بادلوں کے مقابلہ کے لئے آسمان کی طرف اڑا رہے تھے۔ حاشیہ کے اشخاص جن میں کچھ اہل معاملہ، خود غرض، زمانہ ساز خوشامد پسند تھے۔ گنجفہ کی بازی میں منہمک نظر آتے تھے۔ بعض بے فکرے بے پر کی اڑا رہے تھے اس وقت

آنند مندر میں یہ مجمع قابل دید تھا۔

اتنے میں لالہ دونی چند آئے۔ منصف صاحب نے ان کا تپاک سے خیر مقدم کیا، تھوڑی دیر کے لئے گنجفہ ہاتھ سے رکھ کر بازو کے ایک پُر تکلف کمرے میں لالہ جی کو ساتھ لیتے گئے۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"آپ کی پرائیوٹ چٹھی ملی کہیئے ایسا کون سا اہم معاملہ ہے جس کا تعلق میری ذات سے ہوسکتا ہے"؟

لالہ دونی چند۔ معاف فرمایئے میں آپ کی تفریح میں مخل ہو رہا ہوں وہ معاملہ نہایت ہی اہم ہے لیکن مجھے آپ سے عرض کرنا لازمی ہے"۔

رام لال۔" فرمایئے آخر کون سا معاملہ......"

لالہ جی۔" مجھے خوف ہے کہ آپ سُنکر ناراض ہوجائیں گے اور آپ کو بڑی تکلیف ہوگی"۔

رام لال۔" ارے بھائی! کچھ کہو گے بھی، یا یوں ہی پریشان کرو گے"۔

لالہ جی۔" بات یہ ہے۔ وہ بوڑھا خوشحال داس زمیندار آپ کی شان میں گالیاں بک رہا تھا"۔

رام لال۔" آخر کس معاملہ میں۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا؟"۔

لالہ جی۔" سرکار! وہ آپ پر رشوت لینے کا الزام لگاتا ہے اپنے دوستوں اور بھائی بندوں میں آپ کو ذلیل کرنا چاہتا ہے"۔

یہ سنتے ہی رام لال کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ جوش کو دباتے ہوئے کہنے لگے اور کون کون اس کے ساتھ ہیں؟۔

لالہ جی۔ ہیں تو بہت سارے لیکن نگر والوں پر اس کا اثر ہے اس کی زبان جلد بند کروا دیجے ورنہ یہ سانپ ایسا زہریلا ہے کہ اس کے کاٹے کا منتر نہیں"۔

رام لال نے جوش سے کہا" ہوگا میرا کیا بگاڑے گا اس کو مجھ پر الزام لگانے کا کیا حق ہے میں اپنے قول و فعل کا آپ مختار ہوں"۔

لالہ جی۔ سچ ہے لیکن حضور اچھے آدمیوں کے دنیا میں دشمن بہت ہوتے ہیں۔ ان کو ہمیشہ برائی فکر رہتی ہے"۔

رام لال نے بات کاٹ کر کہا" خیر میں اس کو دیکھ لونگا آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے وقت پر اطلاع دی۔ آپ دیکھ لیں گے کہ میں اس گستاخی کا مزا اس کو کیسا چکھاتا ہوں"۔

مونچھوں پر بل دیتے ہوئے منصف صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ادھر لالہ دونی چند گر بہ مسکین بنے

کمرے سے باہر نکلے۔ دل میں خوش تھے کہ تیر نشانہ پر لگا اب لوہا لوہے کو اچھی طرح کاٹے گا۔

(۳)

نگر کے قریب گاؤں میں موہن لال سیٹھ کے پاس ڈاکہ کے ساتھ قتل عمد کی واردات ہوئی۔ پولیس کی رپورٹ تھی کہ ڈاکوؤں کا سرغنہ خوشحال داس زمیندار ہے جو کہ واردات کے بعد اپنے گھر پر بھلے مانسوں کی طرح رہتا ہے۔ ڈاکہ کے وقت قتل عمد کا واقعہ بھی وقوع میں آیا ہے۔ مفرور ڈاکوؤں کی تلاشس جاری ہے۔

پولیس کی تفتیش میں خوشحال داس نے اقبال جرم کیا اور خانہ تلاشی کرنے پر بہت کچھ مال مختلف مقامات سے برآمد ہوا اور کچھ ابھی برآمد ہونے کی توقع ہے۔

مفرور بدمعاشوں کے نام وارنٹ اجرا کرنے کی ضرورت ہے جو کس کی رائے تھی کہ خوشحال داس کی مزید تفتیش کے لئے مہلت درکار ہے۔

عدالت میں خوشحال داس ہتکڑی پہنے نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ چپ چاپ کھڑا سب کچھ سن رہا ہے۔

جب نگر والوں کو یہ خبر ملی لوگ حیران تھے کہ خوشحال داس پر ایسا سنگین الزام! دل میں سمجھ رہے تھے کہ یہ سب پولیس کی چالبازی ہے۔ بعض کی رائے اس کے خلاف تھی معاملہ پیچیدہ ہو رہا تھا۔

سیٹھ موہن لال حاضر عدالت تھے بظاہر پریشان لیکن غور سے ان کے چہرے پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب فرضی واقعہ ہے۔

موہن لال خوشحال سے نظر ملاتے ہوئے گھبراتے تھے منشی رام نارائن مختار نے دیکھا۔ عدالت میں [illegible] کر رہے ہیں۔ خوشحال داس کے بعض دوستوں نے ضمانت پر رہائی کی درخواست پیش کی۔ لیکن وہ اس عذر پر نامنظور ہو گئی کہ جرم سنگین ہے۔ سرکاری گواہ پیچیدہ مسئلے پیچ اپنے اپنے داؤں پر تھے۔

نگر میں سنسنی پھیل گئی۔ خوشحال داس کے دوست پریشان اور دشمن خوش تھے۔ دونوں چند بظاہر ہمدردی کے لئے عدالت میں ادھر ادھر پھرتے نظر آ رہے تھے رام لال منصف متین چہرہ بنائے مقدمہ کے واقعات پر غور کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیر اختیاری اثر سے وہ کبھی کبھی یکایک چونک پڑتے تھے۔ ان کا دل مختلف متضاد حالات کی کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ لیکن ان کا آخری فیصلہ یہ تھا انتقام! انتقام!!

خوشحال داس کی ضعیف بیوی ایک طرف بلک بلک کر رو رہی تھی اور اپنے شوہر کی بے گناہی کا سب کو یقین دلا رہی تھی اپنے لڑکے کشن لال کو وکیلوں کے پیروں پر ڈالکر ہاتھ جوڑے ہوئے کہتی تھی کہ ایشور کے لئے

ہمارے حال پہ دیا کرو۔ اور ان کو اس دوش سے مکت کراؤ۔"

لیکن وہاں کون تھا جو ایک بیکس عورت، اور معصوم بچے کے رونے پر دھیان دیتا اگر کسی کو خیال آیا بھی تو پولیس کے خوف سے یہ کہکر خاموش ہو جاتے کہ پرائی آگ کون اپنے پلو میں باندھے۔

کشن لال بارہ برس کا بچہ لاکھ ناسمجھ سہی، لیکن وہ بھی اپنے ماں باپ کی تکلیف کو محسوس کر رہا تھا اس کو صرف پرماتما کا بھروسہ تھا۔

———— (۴) ————

عدالت کا وقت ہو گیا۔ کچہری برخاست ہو چکی، سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو مختلف خیالات کے ساتھ واپس ہوئے۔

شام بھی ہو گئی۔ خوشحال داس کی ضعیف بیوی اپنے اکلوتے بچے کو لیکر منصف صاحب کے بنگلہ پر داد خواہی کے لئے گئی۔ اس وقت منصف صاحب باغ میں ٹہلتے ہوئے چمن بندی کروا رہے تھے، ان کے ضمیر نے کہا کہ

"آج تو نے بوڑھے زمیندار پر ناحق مقدمہ قائم کیا۔"

خود غرضی نے طنزاً کہا کہ،

مجھ پر رشوت خواری اور بے ایمانی کا الزام کیوں لگایا اور مجھے بدنام کرنے کی کیوں کوشش کی"؟

ضمیر کا جواب تھا۔ "کیا اس کا ایسا کرنا یا کہنا جھوٹ تھا اگر اس نے محض صداقت اور نیک نیتی سے ایسا کیا اور ایسا کہا تو تجھے لازم تھا کہ تو نیک چلن بننے کی کوشش کرتا لیکن ایک گناہ کی خاطر تو دوسرے گناہ کا مرتکب کیوں ہو رہا ہے"؟

اتنے میں خوشحال داس کی بیوی کشن لال کو لئے ہوئے آئی اور منصف صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ "مہاراج آپ دھرم مورت ہیں۔ آپ کے زمانہ میں ہم پر یہ بپتا آئے۔ تو اس نگر میں کیسے نباہ ہو۔ یہ تو بچہ ہے اور میں عورت ذات، وکیل، کچہری ہم کیا جانیں، آپ دیا کیجئے کشن لال کا باپ بے قصور ہے سارا گاؤں جانتا ہے اور آپ بھی جانتے ہیں"۔ . . . .

"پولیس کا ظلم ہے اور وہ زبردستی پکڑے گئے ہیں۔ . . . .

" اس کو خلاصی دیجئے"۔

منصف صاحب اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہاں کیا ہے کچہری میں انصاف ہوگا وہاں آؤ . . . . بوڑھیا قدم پکڑنے کے لئے آگے بڑھی . . . . . . اس کو ٹھکرا کر

پہرہ دار کو حکم دیا۔

"اس دیوانی پاگل کو باہر کردو"

اور خود بالاخانے کی راہ لی۔

ضعیفہ مایوس ہو گئی۔ بچہ نے آسماں کی طرف دیکھا اس وقت ان کی مظلومی دیکھکر تارے بھی بادل کی آڑ میں چھپ رہے تھے۔ دنیا امید پر قائم ہے ضعیفہ کا خیال تھا کہ منصف صاحب کی بیوی سے کہوں گی، عورت۔ عورت سے ضرور ہمدردی کرتی ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ زنانخانہ میں گئی۔

روتی ہوئی شریمتی تارا دیوی کے قدموں پر جھک گئی۔

ماتا جی۔ بھگوان کے لئے سہائتا کرو۔ میرے پتی کو اس آفت سے بچالو۔ مہاراج سے بولو۔

تارا ستی نے گھُرک کر کہا

"اری چڑیل سر شام میرے بھرے گھر میں کیوں روتی ہے۔ چلی جا۔ خوشحال کو ڈاکہ ڈالتے ہوئے شرم نہ آئی۔ بڑی سفارش کرنے آئی ہے"۔

"جا نکل یہاں سے۔ مردوں کے معاملہ میں کچھ نہ کہوں گی"۔

"بوڑھیا آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگی"۔ بی بی۔ جی۔ وہ ڈاکو نہیں ہیں سارا گاؤں جانتا ہے۔ پرماتما جانتا ہے ہم لوگ غریب ہیں لیکن عزت دار"

"اپنی عزت رہنے بھی دے، میں سب جانتی ہوں، چلی جا۔ اپنا منہ کالا کر۔ . . . . سرِ شام میرے گھر پر رونے آئی ہے میرا بچہ بیمار ہے۔ بھرے پُرے گھر میں تیرا یہ منحوس قدم کیوں آیا؟"

بوڑھیا سے یہ ذلت برداشت نہ ہو سکی بچے کا ہاتھ پکڑے گھر سے باہر چلی گئی۔ دل میں کہتی تھی پرماتما . . . . کیا تیری دنیا میں انصاف نہیں ہے۔

(۵)

صبح یہ خبر حیرت انگیزی کے ساتھ مشہور ہوئی کہ خوشحال داس حوالات میں رات کے وقت یکایک مرگیا۔ خوشحال داس کی موت وہ بھی پولیس کے حوالات میں بھرا جانک یہ خبر آگ کی طرح نگر میں پھیل گئی جو سنتا مبہوت سا ہو جاتا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس روز نگر کے کل کاروبار بند ہو گئے۔

لوگوں کے دل جوش سے بھڑک رہے تھے . . . . . . مگر پولیس کا خوف ایسا تھا کہ کسی کے منہ سے ایک بات بھی نہیں نکلتی تھی۔

جب رام لال نے یہ خبر سُنی۔ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گئے۔ سب انسپکٹر کی سازش سے محض بدلہ لینے کی خاطر اس مقدمہ کا پلاٹ تیار کیا گیا تھا لیکن معاملہ نے دوسری شکل اختیار کی۔ الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔

اگر یہ راز فاش ہو جائے تو............ ان پریشان کن خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جبکہ ان کی بیوی تارامتی نے آکر کہا کہ موہن کی حالت خراب ہو رہی ہے جلد ڈاکٹر کو بلوائیے۔

ڈاکٹر صاحب خوشحال داس کے پوسٹ مارٹم کی تیاریوں میں مصروف تھے پھر بھی منصف صاحب کی خاطر آ گئے۔

ڈاکٹر نے مریض کو غور سے دیکھا۔

مایوسی سے سر ہلا کر کہنے لگے بیمار کی غشی خطرناک ہے میرے خیال میں مریض زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹہ کا مہمان ہے۔

یہ سنتے ہی تارامتی چیخ کر رونے لگی ۴ بچے داغ دے گئے۔ آنکھوں کا تارا گھر کا اُجالا جو کچھ تھا یہی موہن تھا۔ ۶ سال کی کمائی آج وہ بھی ہاتھ سے چلا، رام لال کی حالت یہ تھی کاٹو تو لہو نہیں۔ دیوانہ وار پھر رہے تھے گزشتہ واقعات سینما کے فلم کی طرح دماغ میں گھوم رہے تھے۔

ایک وقت تھا کہ میں راست باز، ایمان دار، شریف، اور انصاف پسند انسان تھا اس کے بعد محض دولت کمانے کی خاطر رشوت خواری شروع کر دی، بے انصافی کا تیز خنجر غریبوں کی گردن پر پھیرا صداقت کے ہیرے کو پھینک کر گناہ اور بے ایمانی خود غرضی کے کانچ کا ڈھیر جمع کر رہا ہوں۔

لیکن یہ کمائی کس کام کی تھی؟

پھر............ غریب خوشحال داس کی موت کا باعث کون تھا۔ اس کے خاندان کو تباہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ایک شریف، دیانت دار، اور سچے آدمی کی زبان کو ہمیشہ کے لئے بند کرانے والا میرے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

کیا اس بوڑھے کی بد دعا اور اس کے خاندان کا شراپ تو نہیں ہے کہ آج موہن بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔

مایوسی کے ساتھ رام لال نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب.......... زبان بند ہو گئی۔

ڈاکٹر نے ہمدردانہ لہجہ میں یہ کہا کہ رائے صاحب صبر کیجئے۔ ممکنہ علاج ہو چکا اب خدا پر بھروسہ رکھیے۔ مجھے اجازت ہو خوشحال ڈاکو کا پوسٹ مارٹم کرنا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر باہر چلا گیا۔

تارامتی کی بیقراری بڑھ رہی تھی۔ آخر ماں تھی ماتا کا جوش رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ موت کا خطرہ! .... چند گھنٹوں کے بعد رام لال کے پیش نظر خوشحال داس کی تصویر تھی۔ اس طرح کہ عدالت میں ہتکڑی پہنے استقلال کے ساتھ چپ چاپ کھڑا ہے اس کی ضعیف بیوی ڈاڑھیں مار مار کر روتی ہوئی ہر کس و ناکس سے شوہر کے بچانے کی التجا کر رہی ہے۔ رام لال نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "میں منصف ہوں انصاف اسی کا نام ہے کہ ایک بیگناہ کا خون اس وجہ سے کیا کہ اس نے حق بات کہی تھی یہ کہتے ہوئے ہنسنے لگا.........."

——— (۶) ———

تارامتی شوہر کی مجنونانہ حالت دیکھکر اور بھی سہم گئی۔

بیمار بیہوش تھا۔ ڈاکٹر کے اشراب (انجکشن) سے کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ خوشحال داس کی ارتھی سمشان بھومی کو چلی میت کے ساتھ سارا نگر تھا منصف صاحب کے گھر کے سامنے سے جب لاش گزری ایک ساتھ سینکڑوں آدمیوں نے کہا کہ

رام نام ست ہے۔ رام نام ست ہے۔

منصف صاحب اور تارامتی نے یہ نظارہ دیکھا۔ خوشحال داس کی لاش پر بوڑھے، جوان، بچے سب آنسو بہارہے ہیں چھوٹا کشن آگ کی ہانڈی لیئے ہوئے ان کے بنگلہ کی طرف حسرت سے دیکھ رہا ہے۔

منصف صاحب کو دیکھکر بعض لوگوں نے کہا کہ

"اب اس کا انصاف بھگوان کے پاس ہوگا!"

"جتنے منہ اتنی باتیں.........."

یہ جلوس بھی گزر گیا۔ لیکن دیوار کی گھڑی اس خاموشی میں "ٹک ٹک" کرتے ہوئے موہن کی زندگی کے چند لمحے جلد جلد ختم کر رہی تھی۔ بیمار کا دل کمزور ہو رہا تھا۔

تارامتی کے سامنے کل رات والی بوڑھیا کی تصویر تھی......... جو رو رو کر التجا کر رہی تھی۔

کیا اس غریب کی آہ کا اثر ہے؟

موہن کے چہرے پر اب خوبصورتی کا نام و نشان نہ تھا مردنی چھارہی تھی..........

رام لال نے بچے کی طرف دیکھا اور پھر تارامتی کو..........

ایک بار اس کو خیال آیا...... آہ یہ ثروت، دولتمندی، یہ کمائی، یہ گھر مال، متاع سب رشوت لیکر

بیچ کیا لیکن یہ کمائی آج میرے کس کام کی ؟ موہن کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہونا چاہیئے۔ ......

دیواروں سے ایک آواز گونجتے ہوئے آئی کہ۔

رام نام ست ہے۔

تارا بے سُدھ ہو رہی تھی۔

موہن نے ہچکی ـ صرف ایک ہچکی۔ لی۔ رام نام ست ہے۔ رام لال کا خلف سلف سے جا ملا۔

دیوانی ماں اس پر جھک گئی اور بے جان گر پڑی۔

یہ دونوں روحیں ایک ساتھ خوشحال کی روح کو منانے جا رہی تھیں !

رام لال پر اس نظارہ کا گہرا اثر ہوا اور ان بیجان لاشوں کو دیکھا۔

شمشان بھومی سے ایک گرجتی ہوئی آواز آئی کہ

"رام نام ست ہے"

حالت جنوں میں رام لال نے مٹی کا تیل کپڑوں پر ڈالا اور گھر کو آگ لگا دی اور نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد شعلے بلند ہونے لگے۔

اُدھر خوشحال داس کی لاش چتا پر جل رہی تھی ؛ ادھر آگ رام لال کے گھر اور بیوی بچے کو جلا کر خاک کا ڈھیر بنا رہی تھی۔ گھر اسباب کے ساتھ جل رہا تھا۔ نگر خالی تھا۔

(۷)

خوشحال داس کو مرے پورے تین سال گزرے۔ شانتی نگر والے اس خاندان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں۔ فرضی ڈاکہ کے مقدمہ میں حقیقی مجرموں کو انتہائی سزا ملی۔ جس میں دونی چند بھی شریک تھا۔ نگر کے شمشان میں ندی کے کنارے پر ایک پاگل برہنہ دیوانہ وار پھرتا ہے۔ اور اس کی ڈراؤنی راتوں میں زور زور سے چیختا ہے کہ

رام نام ست ہے۔ رام نام ست ہے

دیوانہ راکھ اور کیچڑ میں لت پت ہے۔ نگر والیوں نے اس کا نام پشاچ (شیطان) رکھ چھوڑا ہے اس کے نزدیک کوئی نہیں جاتا۔ یہاں تک کہ اس کی صورت دیکھکر شمشان کے کتے بھی بھاگ جاتے ہیں دوپہر کی کڑی دھوپ ہو یا موسلا دھار بارش ایک بوڑھیا اور اس کا پندرہ سال کا لڑکا ہر روز کچھ کھانے پینے کا سامان لیجا کر اس دیوانے پاگل کو دے آتے ہیں۔ اس کے میلے کچیلے بدن سے مٹی غلاظت صاف کرتے ہیں۔ محبت سے بوڑھیا سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور کہتی ہے کہ :۔ بھیا رام لال گھر چلو ..... جو ہو چکا اسکا رنج نہ کرو۔

بادۂ دکن

مثنوی خسرو وشیریں

(شیر محمد خاں ایمان)

(۵)

ایمان کی مثنویات کے سلسلے میں پہلے یہ مثنوی پیش کرنی تھی، لیکن بات پر بات یاد آنے کی وجہ سے مثنوی "برق تاباں" پہلے پیش کردینی پڑی، ان کی مثنویاں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، شاعر کی فکر شعر کا ایک یہ بھی بڑا میدان ہے۔ میر حسن، حسن دہلوی کو دیکھیے کہ دیگر اصناف سخن پر قدرت رکھنے کے باوجود، مثنوی "بدر منیر" نے ہی انھیں آسمانِ شہرت پر چمکایا۔ مثنوی "خسرو وشیریں" کو ایمان نے بڑی خوبی کے ساتھ لکھا ہے (۱۲۱) شعر کی مثنوی ہے مگر شاعر کے دل کی بھڑاس جب اس سے بھی نہیں نکلتی ہے تو وہ "چولی دامن" کے ساتھ کے طور پر ؎

(ایمان چل اب بوادئ نجد ؎ تا دل کو سرور ہووے اور وجد)

"قیس ولیلا" کے فسانے کو ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ "خسرو وشیریں" کے ساتھ "قیس ولیلیٰ" کی مثنوی جزو لاینفک ہو گئی ہے۔ اس کے انجام میں کنایتاً اُس کا آغاز ہے۔ اور دیوان میں ترتیب بھی یہی ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں اکثر مکالمت و مخاطبت کے مقام آگئے ہیں یہ شاعر کے لئے بڑی کٹھن منزل ہے ایسے وقت میں بڑے سے بڑے شاعر کے قدم بھی لڑکھڑاتے ہیں لیکن حضرت ایمان ہیں کہ ان تمام دشوار گزار گھاٹیوں سے اپنے زور کلام کے باعث نہایت آسانی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

(عمر یافعی)

اے دلبر خوبرو بد اطوار ! جوں ایک گل اور ہزار ہوں خار
نرگس ہے بعینہ اگر چشم پر اس میں حیا نہیں بجز چشم
گیسو جو ہیں سب بسے معنبر جز دورِ سیہ نہ لائیں بر پر
مژگاں جو ہیں مثلِ ناخنِ باز خوں خواری سے رہیں نہ تک باز
ہر چند جبیں ہے لوحِ سیمیں ہے نقشِ وفا سے سادہ آئیں
ہیں گرچہ وہ گوش بہتر از گل پر سنتے ہیں کب فغانِ بلبل
ابرو ہیں اگرچہ وہ دلاویز شمشیر کی شکل پر ہیں خوں ریز
ہے مثلِ سحر اگر بنا گوش کردے ہے چراغِ عقل خاموش

زلفیں ہیں اگرچہ مشک تاتار   پر صرف گزندہ جوں سیہ مار

چنپے کی کلی ہے گرچہ بینی   خود بینی سے ہے ستم گزینی

جوں غنچہ اگرچہ وہ دہاں ہے   پر زیر زبان سوز ناں ہے

ہیں سلک گہر اگرچہ دنداں   الماس سے تیز ہیں دو خنداں

شیریں لب ہیں یہ ہے یہی قہر   دیں تلخ جواب بدتر از زہر

ہے وہ جو ذقن مشابہ سیب   پہنچائے ہے دل کو آہ آسیب

گردن وہ جو ہے صراحی خوب   پینا اُسے خون دل ہی مرغوب

شاخ گل میں جو دست و بازو   شمشیر کف ہیں عربدہ جو

خورشید اگرچہ ہے وہ پنجہ   دست غربا کرے ہے رنجہ

ہے پشت بھی رگ موز ہر چند   پر اُفعی جعد سے ہے پیوند

سینہ ہے اگرچہ آب شفاف   دل اُس میں ہے سنگریزۂ صاف

قاقم سے بھی نرم گر شکم ہے   گنجایش راز اسمیں کم ہے

گردیدۂ حور ناف ہے وو   پہنچائے ہے چشم زخم دل کو

وہ موئے میاں ہے گرچہ باریک   کرتی ہے نگاہ عقل تاریک

ہے ران سے تا بساق ہر چند   خوش تر ہے نہال موز مانند

پر چشم ہے سرد مہری اُس پر   بھاگے کافور وہاں سے اکثر

بے راست اگرچہ سرو قامت   رفتار میں ہے کجی قیامت

شایاں نہیں اختصار ہر چند   لیکن قصہ ہے چند در چند

فرماں فرمائے ہفت کشور   خسرو نامی شہ دلاور

نادیدہ ہوا وہ عاشق اس کا   یہ پہنچا ارمن کے ملک تنہا

کی ہے شیریں نے چند مدت   انواع انواع کی ضیافت

گہ ہے بزم کباب و مے تھی   آواز سرود و چنگ و نے تھی

گاہے چوگاں و ترک تازی   گہ ہے اشعار و نرد بازی

چاہا خسرو نے وصل جس دم   اُس شوخ غزال نے کیا رم

کی عرض وہیں کہ اے جہاندار   بے عقد نہ ہو یہ کام زنہار

خسرو سنتے ہی اس سخن کے   ناکام پھرا طرف وطن کے

دولت میں خلل ہوا جو ناگاہ   لی ہے ناچار روم کی راہ

وصلت کر اس سے ساتھ لے فوج   آیا پھر اپنی یہاں بصد اوج

عمہ شیریں کی واں گزر گئی   اس کہنہ جہاں سے کوچ کر گئی

شیریں کو ہوا نہایت اندوہ   انبوہ ملال کوہ در کوہ

ناسفتہ تھا بس کہ وہ دُر پاک   مانند صدف کیا جگر چاک

کوئی نہ عزیز اسے نے برادر   جوں کوہ گرا غم اس کے سر پر

شیریں کے بھی عشق نے کیا جوش   عیش و طرب ہوا فراموش

ناچار غلام کو دیا راج   ارمن کا ہوا وہ صاحب تاج

جس کا حق تھا سو اسکو دیکر   باقی سب مال ساتھ لے کر

پھر لی خسرو کے شہر کی راہ   القصہ وہاں پہنچ کے ناگاہ

جنگل میں بنا کے اک محل نو   قصر شیریں ہے جو ہے مشہور

کی ہے ناچار واں اقامت   اور اپنے ہی ہمرہوں سے صحبت

خسرو نے یہ سُن نوید فرحت   بھیجا شاپور بہر خدمت

باوصف شکوہ بادشاہی   کی لاکھ زباں سے عذر خواہی

یعنی یہ سُن کے کامیابی   حاضر ہوتا وہیں شتابی

ہے قیصر روم کی جو دختر   ضابطہ ہے وہ ملک و سلطنت پر

اس عذر کو اب معاف رکھنا   خاطر کو ادھر سے صاف رکھنا

شیریں نے سنا یہ جبکہ پیغام   رکھا دل کو بہر نمط تھام

لیکن اتنا کہا بہ ناچار   شیریں ایسی بھی تو نہیں خوار

جس دم کہ نقاب ٹک اٹھا دے   لاکھوں عاشق وہیں بنا دے

لازم یہ ہے کہ خوش رہیں آپ   شیریں سے بات کچھ کہیں آپ

شاپور سے پھر کہا کہ ایک کام   بہتر ہے جو ہو سکے سر انجام

اس دشت کا آب صرف ہے زہر   افعی کی گیاہ میں بھی ہے لہر

رکھا ہے دو اب دوریاں سے   شیر آئے ہے دیر کر وہاں سے

پیتے ہیں بجائے آب یاں شیر   آنے کی شتاب کچھ ہو تدبیر"

شاپور نے یہ کہا کہ فرہاد   کاریگر ہے بڑا ہی اُستاد

طیار کر یگا اس طرح نہر   جس میں جاری ہو شیر کی لہر"

لایا ہے چنانچہ کوہ کن کو   یعنی اُس مرد تیشہ زن کو

شیریں نے کیا پھر اُس کو مامور   طیاری نہر پہ بدستور

فرہاد نے جا جہاں تھا گلہ   نہر نادر کا نقشہ باندھا

ڈالا گر اُس میں قطرۂ شیر   گھر میں پہنچا بدون تاخیر

اب تک وہ ہے نہر عشق معمور   عالم میں ہے "جوئے شیر" مشہور

شیریں خوش وقت ہو نہایت   آئی ہے بر سر عنایت

گھر میں فرہاد کو بلا کر   بخشا گوش و گلو کا زیور

اور کی ہے نوازش زبانی   شیریں سخنی و قدر دانی

شیریں کے سنے سخن جو دلکش   فرہاد گرا زمیں پہ کھا غش

شیریں از بس تھی اُس کی آنا   انعام سے ہی تھی وہ (جگ میں) ممتاز

آیا جس دم غشی سے باہر   انعام نثار کر کے یک سر

کوہ و صحرا کی لی ہے پھر راہ   با اشک رواں بنالہ و آہ

کلبے بے ہو وہ رہ نوردی   خارہ خارا میں دشت گردی

پھر اُنس کیا ہے دام و دد سے   صوا کے ہر ایک نیک و بد سے

مرغ و ماہی سے تا دد و سور   ڈالا شیریں کے نام کا شور

خسرو پہ ہوا یہ جب ہویدا   شیریں کا ہوا ہے کوئی شیدا

کی ہے پہلے تو قتل کی فکر   مشہور نہ ہووے تا کہ یہ ذکر

آخر کر کے کا عدل کر یاد   جائز نہ رکھا یہ ظلم و بیداد

اُس کو پھر کر اور فسوں سے   اٹکایا کوہ بے ستوں سے

یعنی کہ تراش کر یہ کہسار   کر دے اک رہ ہین دہرا

شیریں کے ہو تب ہی محل شاد   وحشت برباد و خانہ آباد

فرہاد نے پھر اٹھا کے تیشہ   لی وجد و طرب سے راہ پیشہ

تھا کوہ وہاں سے چند فرسنگ   جوں چرخ بلند و سنگ در سنگ

اک دست اُسے تراش ڈالا   لے کر پائیں سے تا بہ بالا

کھودی شیریں کی پھر وہ تصویر   جس میں پرواز دار تحریر

اس نقش کو دیکھ بر سر سنگ   صورت گر چیں بھی ہو گیا دنگ

گلگوں پہ کہیں سوار شیریں   خسرو سے کہیں دو چار شیریں

اُس کوہ میں تھا بلا تحاشہ   بت خانۂ چین کا تماشا

شیریں سُن کر یہ صنع کاری   کی پھر لا خطہ سواری

دیکھا وہ تمام کوہ سنگیں   ہے نقش و نگار ہی سے رنگیں

دیکھا ہے کہ جو کوہ کن دلگیر   بخشا خاصے کا ساغر شیر

اُس تلخیٔ ہجر ہیں مسلّم   شیریں کا می جی ہے اک دم

گھر کا جس دم کیا ارادہ   فرہاد جلو میں تھا پیادہ

ناگاہ فرس سمند ری کھا   دو تونرا تو یہ آ رہا تھا

اُس عاشق پیل تن نے وہیں   لے دوش پہ اسپ اور شیریں

رہ میں نہ لیا کہیں ذرا دم   لایا تا قصر شاد و خرم

پہنچی خسرو کے تئیں خبر جب   دانشمندوں کو جمع کر سب

پوچھا "کہو اب صلاح کیا ہے   کیا منع ہے اور مباح کیا ہے

فرہاد تو کر چکا جو چاہا   اپنے اقرار کو نباہا"

دانشمندوں نے یہ کہا تب   باقی تدبیر ایک ہے اب

فرہاد کے پاس جا کے دو چار   تھے خانہ خراب وہ جو مکار

یہ اس سے کہا کہ "تو کدھر ہے؟   شیریں کی بھی کچھ تجھے خبر ہے!

تھی کتنے دنوں سے وہ جو بیمار   پہنچی خسرو کو آج اخبار

صد حیف گئی ہے جان شیریں   سنسان ہوا مکان شیریں"

فرہاد نے سنتے ہی اسی آن   گر کر کہسار سے دیا جان

شیریں نے یہ واقعہ کو سُن کر   جھٹ زلفوں کو کھول بکھیر

پہنچی ہے وہاں باہ و فریاد   جس جائے پڑی تھی نعش فرہاد

۱؎ فقرہ ہے (؟)   ۲؎ شاہراہ   ۳؎ گھوڑے کا ٹھوکر لینا

تار کا ہر شش پہ دارز خمہ — رکھا اس کو میان دخمہ[1]
طیار کیا بلند گنبذ[2] — رکھے ہر سو ہوا کے منفذ
ہر چار طرف گل و ریاحیں — سوسن ہے کہیں کہیں ہے نسریں
کہسار پہ لالہ زار اُدھر کو — ہے رشکِ ارم زمیں ادھر کو
دختِ قیصر رہ تھی جو مریم — اُس کو بھی دیا کہ سہنے وال سم
بعضے کہتے ہیں بہر شیریں — مریم کو دیا ہے زہر شیریں

ملہ ہمراہاں

جب دونوں طرف ہوئی صفائی — شادی شاہانہ تب رچائی
خسرو پرویز اور شیریں — ہم خواب ہوئے بہ رسم کابیں
آخر بیہر چاک کر جگر کو — مارا فرزند نے پدر کو
دیکھی بے جان جو نعش شوہر — شیریں بھی مری ہے کھا کے جوہر
ہے بس کہ جہاں یہ ہیچ در ہیچ — قصے اس کے ہیں پیچ در پیچ
ایمان چل اب بوادیٔ نجد — تا دل کو سرور ہووے اور وجد

مثنوی قیس و لیلیٰ

اپنے دل کی تجھے کہوں میں — دیوانۂ عشق قیس ہوں میں
تھا ملکِ عرب میں اک جواں مرد — جوں دفترِ جاں کی منتخب فرد
اللہ نے دیا تھا مالِ موفور — تھا سید عامری سے مشہور
خلاقِ جہاں نے بعدِ مدت — فرزند کیا اُسے عنایت
بے تابیٔ مہد و خونِ دل شیر[3] — الفت بنیاد و عشق تخمیر
باغِ جاں کا گلِ شگفتہ — بیج دل کا مہِ دو ہفتہ
تھا بس کہ قیاس کا معما — کیوں کر نہ ہو قیس سے مسما
جس دم وہ ہوا چہار سالہ — پڑھنے لگا عشق کا رسالہ
یعنی مکتب میں اس کی مائل — تھی اک دختر پری شمائل
زلف اُس کی تھی بسکہ لیلۃ القدر — لیلیٰ نام و مشابہِ بدر
دونوں ہم درس تھے شب و روز — باہم غمخوار اور دل سوز
یہ انس ہوا ہے رفتہ رفتہ — رہتے اک جا تھے ہفتہ ہفتہ
دہ سالہ ہوا وہ ماہ جس دم — مشتاق ہوا تمام عالم
آئی لیلیٰ کو بھی جوانی — جیسے کہ بہار بوستانی
تھا قیس اگرچہ سروِ خوبی — لیلیٰ بھی تھی ایک تودۂ خوبی
مل کر بیٹھیں تو ہو یہی سج — دونوں جیسے کہ چاند سورج
کچھ فرق نہ تھا انھوں کے مابین — گویا کہ ہوا قرانِ سعدین

تھا درسِ کتاب اک بہانہ — پڑھنا اشعارِ عاشقانہ
تھے تیغِ ادا کی بس کہ مجروح — قالب دو تھے اور ایک تھی روح
دو چار گھڑی اگر جدا ہوں — روتے روتے غرض فنا ہوں
یہ پیرِ فلک ہے بس کہ بے مہر — پوشاک سفید و نیلگوں چہر
خوش آئی نہ اس کو ان کی صحبت — پھینکا ناگاہ سنگِ فرقت
لیلیٰ کے پدر کو طنز کی راہ — لوگوں نے کہا ہے جا کے آگاہ
سنتے ہی یہ بات اُسنے بیڈھب — موقوف کیا ہے درسِ مکتب
رکھا گھر میں۔ کر اس کو قدغن — فانوس میں جیسے شمع روشن
لیکن جوں شمع اشک باری — شعلے کی طرح ہے بیقراری
یاں قیس ہوا ہے بے خور و خواب — پروانہ مثال بلکہ بیتاب
پڑھنے لگا عشق کا رسالہ — گلزارِ جنوں نظر میں پھولا[عہ]
ہر اک کوچہ میں ارد بازار[عہ] — پڑھتا عشق و جنوں کے اشعار
کوئے لیلیٰ میں جا شب و روز — پڑھتا ابیات و غزل جگر سوز
گرد اُسکے ہوں جمع جب کہ اطفال — کرنے لگے وجد ہو کے خوشحال

عہ رسالہ، پھولا۔ آپس میں قافیہ نہیں ۱۲ عہ ارد بازار کے ساتھ اوڑ کا جوڑ یہاں تو کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ البتہ دکن والوں کی زبان میں ایک محاورہ "رعق بازار" ہے جو سر راہ کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ شاید اسی میں ضاد (رعق) کو دال سے بدل کر ارد بازار لکھا ہو۔

[1] پارسیوں کا قبرستان۔ [2] عام تلفظ (گنبذ کا) گنبد ہے اور حسب قاعدہ دال ذال سے بدل جاتی ہے۔

دیکھ اُس کے تئیں کمال مفتوں ۔۔۔ لڑکوں نے رکھا ہے نام "مجنوں"
لیلیٰ غزنہ سے کر نگاہیں ۔۔۔ بھرتی تھی خموش سرد آہیں

تب سید عامری ہو ناچار ۔۔۔ کر جمع عزیز اپنے اک بار
اظہار کیا غمِ دروںی ۔۔۔ اور قیس کی دولت درزبونی

"یہ" سب نے کہا کہ رسم ہے ہاں ۔۔۔ پیوند ہو نخل سے یاں
کیجیے اب چل کے ایک باری ۔۔۔ لیلیٰ کے پدر سے خواستگاری
شاید وہ بھی سمجھ غنیمت ۔۔۔ راضی ہو وے برسمِ وصلت"

لیلیٰ کے پدر نے سن یہ پیغام ۔۔۔ بولا کہ "نہ ہووے مجھ سے یہ کام
دیوانہ کو کر کے اپنا داماد ۔۔۔ ننگ و ناموس دوں میں برباد
ہوتا ہی نہیں یہ کام ہرگز ۔۔۔ کیجیے نہ خیالِ خام ہرگز"

پھر قیس کو لے پدر نے ہمراہ ۔۔۔ کعبے میں گیا بنالہ و آہ
محرابِ حرم کے پاس جا کر ۔۔۔ بیٹے سے کہا کہ "ہاتھ اٹھا کر
کر عرض جنابِ کبریا میں ۔۔۔ سو عجز و نیاز سے دعا میں
یارب میں ہوں ہمیشہ ہی رنجور ۔۔۔ رکھ آفتِ عشق سے مجھے دور"

مجنوں نے کہا کہ "یا الٰہی ۔۔۔ دے عشق و جنوں مجھے کماہی
لیلیٰ سے کبھی جدا نہ کیجو ۔۔۔ خالی الفت سے دل نہ کیجو"

پھر باپ نے ساتھ لے پسر کو ۔۔۔ آیا نومید اپنے گھر کو
سوجھی ناچار پھر یہ تدبیر ۔۔۔ ڈالی مجنوں کی پاؤں میں زنجیر

مجنوں ایک شب تمام جاگا ۔۔۔ زنجیر توڑ کے گھر سے بھاگا
پہنچا جس دم بوادیٔ نجد ۔۔۔ کرنے لگا رقص فرحت و وجد
بیٹھا کوہِ بلند پہ جا ۔۔۔ خورشید فلک کی طرح تنہا
زنجیر ہلا ہلا کے اُس جا ۔۔۔ اک بار کیا ہے شور برپا
کوچۂ لیلیٰ میں روز جانا ۔۔۔ سنگ طفلاں خوشی سے کھانا
پھرتا ہے وہ دشت و در میں ۔۔۔ کانٹے کف پا میں خاک سر میں

نوفل نامی کوئی سپہ دار ۔۔۔ تھا صاحبِ خلق و فیض آثار
آیا ہے پئے شکار ناگاہ ۔۔۔ برِ مجنوں میں بھول کر راہ
دیکھا مجنوں کو بر سرِ کوہ ۔۔۔ با آہ و فغاں و درد و اندوہ
پڑھتا وہ شعر درد آمیز ۔۔۔ مضمون جن کا ہو عشق انگیز
تنہا مجنوں کے پاس جا کر ۔۔۔ مہر و اشفاق سے منا کر
لایا گھر میں یہ کر کے اقرار ۔۔۔ "تجھ سے تیرا ملاؤں دلدار"
گرم آب سے کر کے سب بدن پاک ۔۔۔ پہنائی ہے پھر لطیف پوشاک
کھانے الوان کے کھلائے ۔۔۔ شربت اقسام کے پلائے
صحبت مجنوں ہی سے شب و روز ۔۔۔ اشعار کی گفتگو دل افروز
لیلیٰ کے پدر کو لے کے خامہ ۔۔۔ لکھا وصلت کا پھر تو نامہ

اُس نے یہ جواب صاف بھیجا ۔۔۔ قاصد سے کہا کہ "جلد لے جا!
دیوانہ سے کیجے کیونکہ وصلت ۔۔۔ رہتی ہے کہاں جہاں میں عزت؟
خورشید ہوا ہے جبکہ روشن ۔۔۔ پہنائی صبا نے بر میں جوشن
اپنی ملت میں ہے یہ ناموس ۔۔۔ مر جائیے کے بعد جا ناموس"

نوفل نے سپاہ کر فراہم ۔۔۔ مجنوں کو بھی ساتھ لیکے اُس دم
اک بارگی کر کے منزلیں طے ۔۔۔ پہنچا لبِ سر قبیلۂ حے
نوفل کی سپہ سے جبکہ ہوئی جنگ ۔۔۔ مجنوں ہی لگا ہے مارنے سنگ

پوچھا یہ کسی نے "اے جنونی ۔۔۔ فوج اپنی کی چاہے ہے زبونی"
بولا "لیلیٰ کی میں طرف ہوں ۔۔۔ تیرِ آفات کا ہدف ہوں"
لیلیٰ کے پدر نے یہ کہا ہے ۔۔۔ "باقی اب ہم میں کیا رہا ہے!
گذرے سر پر اگر قیامت ۔۔۔ جیتے جی تو نہ ہو یہ وصلت
خاطر اگر نہ ہووے لیلیٰ ۔۔۔ بھیجوں سر بے شعور لیلیٰ"

نوفل نے یہ سنتے ہی حقیقت ۔۔۔ کھینچی دل میں کمال خجلت
سمجھا کہ جدال حرف ہے پوچ ۔۔۔ واں سے اُس آن ہی کیا کوچ
مجنوں کو بھی دے کے اسپ و خلعت ۔۔۔ ناچاری سے کیا ہے رخصت

مجنوں وادی میں پھر جب آیا ۔۔۔ اک ابرِ سیاہ سا گھر آیا

سہ (۹) نقل ہے۔

نالاں گریاں بسانِ سیلاب — ہر لمحہ مثالِ برق بے تاب

ایک دن صیاد نے تھا مارا — پکڑا ہے غزالہ چکارا

مجنوں جا کر ہوا ہے سائل — "یہ بخش مجھے پڑے ہے شمائل"[ملہ]

تب اس نے کہا کہ مول لیجے — پھر دام سے اسکو کھول لیجے

گھوڑا صیاد کو دیا ہے — مول اس سے غزالہ کو لیا ہے

پھر اسکو گلے لگا کے رویا — لیلیٰ کی ہے چشم تیری گویا

رفتار بھی ویسی ہو بہو ہے — لیلیٰ کے سگوں میں آہو تو ہے

سبزہ خاصہ کھلا کے تھوڑا — نامِ لیلیٰ پر اس کو چھوڑا

پھر اک دن اک گوزن[عہ] گمراہ — پکڑا صیاد نے جو ناگاہ

اپنی دیکر تمام خلعت — اس کو بھی رہا کیا امانت

مارا الفت کا اس قدر دام — وحشی صحرا کے سب ہوئے رام

رہتے تھے مدام اسکے ہمراہ — شیر و آہو پلنگ و روباہ

صحرا سے اداس ہو کے تنہا — اک دن اک باغ میں گیا تھا

دیکھا یہ وہاں کہ باغباں ہے — اک سرو کے کاٹنے کے درپے

مجنوں نے کہا ہی یہ تکرار — "تیشہ نہ چلائیو خبردار"

تیغ ایسے نہال پر چلانا — "قدِ لیلیٰ سے جو ہو ہمانا[عہ]"

بولا اس وقت یہ کدیور — "دے مجھے قیمت میں زر کہ زیور"

بازو پہ بندھا تھا لعل رنگیں — دانہ سے انار کے بھی رنگیں

وہ لعل گراں بہا دیا کھول — اس سرو سہی کو پھر لیا مول

کر یاد وہیں خرامِ لیلیٰ — آزاد کیا بنامِ لیلیٰ

اس دن ہی سے کہتے ہیں سب استاد — "مشہور ہوا ہے سروِ آزاد"

آیا اک بار موسمِ گل — تھے نغمہ سرا چمن میں بلبل

دامانِ جبال و دامنِ دشت — تھا قابلِ سیر و طیر و گلگشت

لیلیٰ کو ہوئی ہے بیقراری — ناقہ پہ کسا کے وہ عماری

زریں جس کا ہر اک جرس تھا — خوش تر، خورشید سے کلس تھا

ہمراہ تھیں اور بھی پریزاد — ہر ایک تھی ان میں رشکِ شمشاد

محملِ لیلیٰ کا پیش آہنگ — اور پیچھے شتر قطار خوش رنگ

آوے جوں فصلِ نوبہاری — اتری اک باغ میں سواری

تھے خوار فقط نہ سرو و سنبل — پامال ہوئے ہیں لالہ و گل

لیلیٰ کو قریبِ سروِ موزوں — آیا نظر ایک بیدِ مجنوں

اک بار اٹھائی نالۂ درد — گلگوں چہرہ ہو گیا ہے زرد

مجنوں کا بندھا غرض تصور — ٹپکے آنکھوں سے اشک کے دُر

ایسے میں کوئی جوانِ قابل — ناگاہ ہوا وہاں مقابل

پڑھنے لگا طبع زادِ مجنوں — جی میں تھی یہ مرادِ مجنوں

یہ کہیو صبا شتاب جا کر — اس شوخ غزال کو جتا کر

میں تیرے لیے ہوں سر بصحرا — خوار و زار و غریب و تنہا

معلوم نہیں کہ تو کدھر ہے — اور میری بھی کچھ تجھے خبر ہے؟

دل کو کب تک کوئی سنبھالے — دیدار کبھو تو ٹک دکھا لے

سوئے مجنوں خود لگا ہے — "یہ ہم گرنیست گاہے گاہے"

لیلیٰ کو ہوئی ہے سن کے وحشت — بھولی خویش و پدر کی نسبت

اک بار کیا ہے جوشِ خوں نے — گھیرا ہے طرح سے جنوں نے

اس باغ سے ہر طرح اٹھا کر — لائے گھر میں خدا خدا کر

تشخیصِ جنوں ہوا ہے اک بار — تجویز ہوئی ہے فصد ناچار

قیس و لیلیٰ تھے بس کہ توام — قالب وہ تھے اور ایک تھا دم

رگ زن نے کیا جو فصد کا قصد — وہاں قیس کی کھل گئی وہیں فصد

تھا ابن سلام ایک ذیجاہ — لیلیٰ کے جمال سے ہوا آگاہ

بھیجا بخوشی پیام وصلت — چاہا دلخواہ کامِ وصلت

لیلیٰ کے پدر نے مصلحت جان — شادی کا وہیں کیا ہے سامان

محمل میں بٹھا عروس کو آہ — داماد کے کر دیا ہے ہمراہ

عہ۔ گوزن۔ ہرنا بارہ سنگا۔ عہ ہمانا۔ مانند، مشابہ، مماثل۔

ملہ۔ نقل ہے۔ ممکن ہے کہ "پڑی" ہو۔

گریاں محمل میں ہے وہ نومید — برج آبی میں جیسے ناہید
محمل میں گئی ہے جبکہ لیلیٰ — ہر سو اک روشنی سی پھیلی
چاہا شوہر نے کامیابی — لیلیٰ آگاہ ہو شتابی
ابرو کو چڑھا کے جوں کمانچہ — مارا اک زور سے طمانچہ
اور اتنا کہا ہے ہو کے بیزار — یہ سمجھو کہ "ہے یہ نقش دیوار
نظارہ یہ خوش رہو تو بہتر — ورنہ یہ گلو ہے اور یہ خنجر"
تب اس نے وہ ترک کر کے قربت — جانا ہے نظارہ ہی غنیمت
اک مرد عزیز اور ہوشیار — رکھتا تھا نہایت ہی ذوق اشعار
کہتے تھے جہانیاں اسے "زید" — تھا وہ بھی کمند عشق کا صید
مجنوں کے سنے کہیں جو اشعار — آیا مشتاق ہو کے اک بار
دیکھا تو ہر اک درندہ واں ہے — مجنوں ان سب کے درمیاں ہے
گاہے ہوتا ہے گرگ تکیہ — گاہے ہے شیر ببر تکیہ
بچے ہیں غزال کے بغل میں — صرف اوقات ہے غزل میں
اک شیر درندہ نے یہ چاہا — کھا جاؤں پہنچ کے اسکو جیتا
مجنوں نے اسے وہیں ڈانٹا — سب کو نزدیک سے ہٹایا
اور زید کو پھر کیا اشارا — کہیے مقصد جو ہو تمہارا
بولا کہ "نیازمند ہوں گا — مشتاق ہزار چند ہوں گا"
تب پاس بلا اسے بٹھایا — اور شعر جنوں اسے سنایا
پوچھا پھر زید نے کہ "اس جا — سرکار کی ہے کہو غذا کیا!"
مرغوب ہے گاہ گاہ اپنا — شیریں صمغ ام غیل صحرا
رخصت پھر واں[1] سے زید ہو کر — آیا لیلیٰ کے گھر کے باہر
دیکھا تو ہے اک ہجوم طفلاں — مجنوں کا ہر ایک ہے غزل خواں
لیلیٰ انعام دے رہی ہے — اشعار وہ مول لے رہی ہے
اس نے بھی پڑھے جو تازہ اشعار — لیلیٰ کو ہوا ہے وجد اک بار
تب زید سے یہ کہا کہ بھائی! — مجنوں سے تمہیں ہے آشنائی!

دیکھا نہیں اسکو مدتوں سے — جاں آئی ہے لب پہ فرقتوں سے
ایسا ہووے کہ بیٹھ باہم — خالی کریں اپنے دل کو اک دم
تب زید نے یہ کہا کہ "بہتر — لایا جا تو آئے میسر"
لی ہے یہ کہہ کے دشت کی راہ — پہنچا مجنوں کے پاس ناگاہ
کر کے شوہر سے ایک حیلہ — آئی جنگل میں وہ جمیلہ
رستے سے الگ میان صحرا — نخلستان تھا بہت ہی گہرا
ناقہ جھاڑوں میں باندھ کر واں — بیٹھی گوشہ میں آپ پنہاں
اتنے میں ادھر سے زید آیا — مجنوں کو بھی اپنے ساتھ لایا
دونوں جس دم ہوئے مقابل — عالم تھا وہ دیکھنے کے قابل
ٹپکی نرگس سے شبنم ادھر — ژالہ ابر سیہ سے اودھر
کرتا جو قبا تھا جب ادھر گل — فریاد میں تھی ادھر کو بلبل
تھی شمع ادھر باشک باری — پروانہ ادھر بہ بے قراری
پھر جب کہ کچھ ایک ہوش آیا — ہر اک نے درد دل سنایا
جس دم ہونے لگی ہے رخصت — مجنوں نے کہا یہ کر کے رقت
"تم نے مجھ کو بلا کو سونپا — میں نے تم کو خدا کو سونپا"
ہر چند کہ چاہتا نہ تھا دل — لیلیٰ ہو کر سوار محمل
آئی گھر میں بصد تب و تاب — گزری وہ رات بے خور و خواب
مجنوں پہنچا جب اپنے بر کو — سیلاب بہا دیا ہے رو رو
بیٹھا جس جا تو بن گیا نخل — ہوش و حرکت کو کچھ نہ تھا دخل
آخر کو طیور نے کئی بار — کر جمع ہزارہا خس و خار
باندھا سر پہ ہے آشیانہ — بچوں کو دیا ہے آب و دانہ
وہ ابن سلام شوئے لیلیٰ — تھی جس سے کہ آبروئے لیلیٰ
ناگاہ ہوا وہ سخت بیمار — ہر چند کیئے علاج دتیا۔
چارہ نہ چلا قضا سے ہرگز — صحت نہ ہوئی دوا سے ہرگز
لیلیٰ کو برسم اضطراری — دو سال رہی ہے سوگواری

[1] (ؤ)

لہ (گہنا)

باہر نکلی ہے سوگ سے جب   خرگاہِ حجاب دُور کر سب
گھر میں آئی ہے جب پدر کے   شوہر کی طرف کے لوگ سر کے
استاد کیا سیاہ خیمہ   جیسے جنگل میں گنجِ ہیشہ[۱]
جب دل میں نہ ہو سکی سمائی   تب آتشِ عشق واں چھپائی

اور زید کو پھر وہاں بلایا   اپنا احوال سب سنایا
بولی اب ذرہ اے برادر   ہے خوفِ پدر نا اک مادر
لا کر خز و حریر[۲] و دیبا   پوشاک ہو جس کی خوب زیبا
یہ زید کو وہ لباس دی سب   بولی "مجنوں کے پاس جا اب
اور اس کے بدن کو دھو سراپا   پوشاک یہی پھر اس کو پہنا
میرے نزدیک لا شتابی   تا ہووے یہ دُور سب خرابی"
یہ سن کے تو یہ زید ہشیار   پہنچا مجنوں کے پاس اک بار
یہ مژدہ جو ہیں اُسے سنایا   مجنوں وجد و طرب میں آیا
کھایا پھر جیسے چرخ ہفت باری   جوں ہفت فلک بجاں نثاری
پہنا ہے لباس جب نہا دھو   پھیلی جنگل کے بیچ خوشبو
جتنے تھے وہاں وحوشِ صحرا   حاضر ہو کیا ہے سب نے مجرا
سوئے لیلیٰ ہوا روانہ   با شوکت و حشمتِ شہانہ
شیر و گرگ و پلنگ تھے گرد   مجنوں کو یہی تھا دم بدم ورد
ہو پھر بھی ادا نہ شکر باری   گر کیجیے صد ہزار باری
چل کر القصہ اس طرح سے   آیا لیلیٰ کے ہاں فرح سے
نکلی لیلیٰ بھی ہو کے بیتاب   آنکھوں سے بہا لہو کا سیلاب
دونو باہم گلے لپٹ کر   میداں ہی میں گر پڑے زمیں پر
اطراف ہجوم دام و دد تھا   مشتاق ہر اک نیک و بد تھا
چاہا بعضوں نے دخل جب واں   دوچار ہوئے ہلاک انساں
دو پہر تلک یہی سماں تھا   حیراں جسے دیکھ آسماں تھا
چھڑکا ہے گلاب زید نے جب   دونوں آئے ہیں ہوش میں تب

لیلیٰ جس دم ہوئی ہے ہشیار   مجنوں تھا گر یہ نقشِ دیوار
ڈال اُس کے گلے میں ہاتھ اپنے   لایا خیمہ میں ساتھ اپنے
بیٹھے آپس میں رو برو ہو   برجِ جوزا کی شکل دونو
از بس کہ تھا اتحاد داخل   تھا فرق نہ درمیان حائل
ہوتے ہی دوچار ہو گئے واصل   دل سے دل اور جان سے جاں
دو آئینے جیسے ہوں مقابل   تھی ایک صفائے محض حاصل
ہوتا تھا نہ عکس جلوہ گر واں   اور شخص کو بھی نہ تھا گذر واں

آخر کو وہ دونو یار خود کام   اک پوست میں جیسے دو مغز بادام
غش کھا کے گرے ہیں ہم آغوش   یک لخت دوئی ہوئی فراموش
عصمت بھی اُدھر ادھر کو عفت   یہ دونو کنیز تھیں بخدمت
باہر ہی رہا کھڑا عسس بھی   پر مار سکی نہ واں مگس بھی
بیٹھا خاموش زید یا سر   اور گرد تھے دام و دد برابر
جس دم کہ ہوئی ہے پیر سحر گاہ   اور چلنے لگی نسیم دلخواہ
قیس و لیلیٰ ہوئے ہیں بیدار   نظّارہ سے پھر ہوا سروکار
لیلیٰ گفتار کی تھی مائل   مجنوں خاموش تھا مقابل

پوچھا لیلیٰ نے "کیا سبب ہے   اے دوست خموش تو جو اب ہے"
بولا "کہ ملی ہے دولتِ وصل   لعلِ نوشیں سے لذتِ وصل
جس شیشہ میں ہو شربتِ قند   منہ اس کا تو چاہیے کہ ہو بند
ہووے جس گھر میں مال اور زر   لازم کہ ہو قفل اس کے در پر
جس جائے کہ مخفی ہو اک کنز   کیجیے نہ طلسم کا وہاں طنز
ہے قیس کدھر کدھر ہے مجنوں   لیلیٰ باقی ہے میں کہاں ہوں
پہنچا جب مہر استوا کو   سایہ اک بار گئی فنا کو
جیدھر دیکھو اُدھر ہے خورشید   سایہ ہستی سے تب ہے نومید
قطرہ ملتا ہے بحر سے جب   پھر اُس کو کہیں گے بحر ہی سب
دریا دریا ہی چو طرف ہے   گوہر ہے کہاں کہاں صدف ہے

۱ (۹) ۲ قسم پارچہ

یہ کہہ کے کیا ہے چاک جامہ اور فرق سے بھی اتار عمامہ٥ پایا صحرا میں گنج آخر باقی نہ رہا ہے رنج آخر

وہ ڈر اصحرا کی سمت اک بار پڑھتا ہوا عاشقانہ اشعار کہتا تھا جو کچھ کہ شعر حالی یا کوئی قصیدہ وصالی

کرتا تھا وہ زید سب قلم بند
مجنوں ہوتا تھا دیکھ خورسند

دردِ دل

از جناب میر ثامن علی صاحب نیساں

کیا کہیں ہم آج کیوں آئے ہیں کیا کہنے کو ہیں قوم کے حالِ زبوں کا ماجرا کہنے کو ہیں

صفحۂ کاغذ کو تر کر دے نہ اشکوں کی جھڑی نظم ہے یہ مرثیہ بربادیوں کا قوم کی

ہو چکی دنیا کی وہ اب دین سے کیا کام ہے جوشِ مذہب قوم کے دل میں برائے نام ہے

اب نہ وہ اگلی محبت ہے نہ ہے وہ اتفاق قوم کے ہر فرد میں گر ہے تو پیدا ہے نفاق

دردِ قومی دل میں ہو تو اشک افشانی بھی ہو خون کی بوندیں ہوں کچھ آنکھوں میں کچھ پانی بھی ہو

عہدِ ماضی یاد کر کے اشک برسائیں گے آج پی کے ہم خونِ جگر کچھ لختِ دل کھائیں گے آج

وہ ہمیں ہیں جن پہ پڑتی تھیں نگاہیں چار کی دھاک تھی عالم میں اپنی تیغ جوہر دار کی

کیا عرب کیا روم کیا ہندوستاں زیرِ نگیں وہ ہمیں ہیں جن کے تھا سارا جہاں زیرِ نگیں

پاتے ہیں معمورِ غم سے دل کی آبادی کو ہم دیکھتے ہیں سلب اب تو اپنی آزادی کو ہم

دیکھ راہ و رسمِ غیر اقوام اور اُن کا نباہ ہم مسلماں اک کو اک آپس میں کرتے ہیں تباہ

غیر قوموں کا تخیل ہے ترقی کی طرف اور ہم مائل نظر آتے ہیں پستی کی طرف

حیف اگلی سی وہ ہم میں حکمت و دانش نہیں نام دنیا میں رہے اس کی کوئی خواہش نہیں

گو شرابِ عیش سے ہم مست ہیں سرشار ہیں لڑکھڑاتی چال کا ایما یہ ہے ہشیار ہیں

دہر میں پھر بھی بہت سے کام کر سکتے ہیں ہم شمع کے مانند روشن نام کر سکتے ہیں ہم

لیکن اس صورت میں جب آپس میں کریں اتفاق دور کر دیں دل سے اپنے رشک اور بغض و نفاق

اے خدا دے آج تو نیساں کی باتوں میں اثر
قوم پر ہو جائے اُس کی یہ نصیحت کارگر

---

٥ ۔ "ع" سا فقط جو قدما کے پاس جائز۔ مگر عمامہ بلا تشدید ثانی ہے ۱۲

لوگ

از جناب صفی اورنگ آبادی

صفی صاحب نے ہمیں اطلاع دی ہے، کہ بعض رسائل میں جدت طراز حضرات نے آپ کے نام کے ساتھ "لسان الاثر" کا خطاب پیوستہ کر دیا تھا جس کی اتباع مکتبہ میں بھی اتفاقاً کر لی گئی صفی صاحب اپنے نام کے ساتھ اس قسم کے خطابات لگائے جانے کو پسند نہیں کرتے اس لئے لکھا ہے کہ آئندہ سے صرف صفی اورنگ آبادی (حیدرآبادی) لکھا جائے۔ غالباً آپ نے "مکتبہ" کے لئے اپنے کلام کو مختص فرمادیا ہے۔

"مکتبہ"

عاشق بنا بھی لیتے ہیں اپنے کو یار لوگ
دنیا میں ہیں ہزار طرح کے، ہزار لوگ

دی جان کوہکن نے مگر آن تو نہ دی
گزرے ہیں عاشقوں میں بھی کیا وضعدار لوگ

اب عشق و عاشقی کو ہمارا سلام ہے
اس کام کو بگاڑ چکے ہیں گنوار لوگ

وہ ہم کہیں جو بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں
کیا ان کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

تیر نظر سے ان کے حسیں بھی نہ بچ سکے
کرتے ہیں اس طرح کا بھی دیکھو شکار لوگ

ہم سے ہزار چھپیں تو پوچھے نہ ایک بھی
وہ ایک کو بلاؤ تو دوڑیں ہزار لوگ

موقوف ہے جو آپ کا دیدار حشر پہ
بس آج ہی سے مر گئے امیدوار لوگ

لوگوں سے اٹھتی جاتی ہیں ایمانداریاں
دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں ایماندار لوگ

میں بدگماں ہوں میری سمجھ کا قصور ہے
بے اعتبار آپ، نہ بے اعتبار لوگ

رونے پہ آ تو آنکھ سے آنسو اٹھا نہ رکھ
کرتے ہیں ایسے کام کفایت شعار لوگ

جس سے نہ مل سکے اسے بدنام کر دیا
کیا کیا تماشے کرتے ہیں دنیا میں یار لوگ

دل کیا لگاؤں حسن فروشوں سے اے صفی
ملتے ہیں روز ایسے تو باون ہزار لوگ

ہندوستان کے مذاہب دسویں صدی عیسوی میں

(علامہ ابن الندیم کی " الفہرست " کا ایک باب)

مترجمہ مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل

علامہ ابو الفرج محمد بن اسحاق ابن ابی یعقوب الندیم، دسویں صدی عیسوی کی وہ مہتم بالشان جامع العلوم ہستی ہیں جن کا لازوال قلمی کارنامہ " الفہرست " کی صورت میں علمی دنیا کو محو حیرت بنا رہا ہے۔ اسلامی علوم و فنون کے بڑے دلدادہ ڈاکٹر ای، جی، براؤن آنجہانی نے " الفہرست " کو غزنوی دور سے پہلے کے اسلامی کارناموں میں سب سے بڑا رتبہ دیا ہے ان کے قول کے مطابق اس دور کی علمی ترقیوں کا لُبِ لباب صرف ان کتابوں میں ملتا ہے جن کے نام یہ ہیں " رسائل اخوان الصفا " " مفاتیح العلوم " " کتاب المعارف " اور " الفہرست "

" الفہرست " کیا ہے؟ ایک علوم و فنون کا خزانہ ہے اس سے کئی ایک ایسے مصنفین اور مصنفات کا پتہ چلتا ہے۔ جو اس وقت موجود تھے لیکن اب مفقود ہیں۔ ڈاکٹر براؤن تو اس کے دیباچہ کو ایجاز و اختصار کی جان سمجھتے تھے۔

" الفہرست " کل دس مقالوں پر مشتمل ہے اور ہر مقالے میں تقریباً تین تین فن (فصلیں) ہیں جن کی تفصیل یہاں درج کیجاتی ہے تاکہ قارئین اس کتاب کی اہمیت کا ایک سرسری خاکہ قائم کر سکیں۔

مقالۂ اوّل۔ متفرق لوگوں کی زبانیں اور ان کے رسم الخط کی خصوصیات۔

مقالۂ دوم۔ نحو اور لغات۔

مقالۂ سوم تاریخ سیر اور ادب۔

مقالۂ چہارم۔ فن عروض وغیرہ،

مقالۂ پنجم۔ فن کلام اور متکلمین۔

مقالۂ ششم۔ فقہ اور فقہا اور محدثین کے احوال۔

مقالۂ ہفتم۔ فلسفہ اور قدیم علوم (لاطینی اور یونانی علوم سے مراد ہے)

مقالۂ ہشتم۔ قصص، حکایات، شعبدے اور جادوگری۔

مقالۂ نہم۔ مذاہب اور اعتقادات

مقالۂ دہم۔ کیمیا کے متلاشی۔

اس عجیب و غریب کتاب نے یورپ کے اکثر مستشرقین کو محو حیرت بنا دیا ہے۔ جرمنی کے ایک مشرق شناس فلوجل نے اس کتاب کو ۱۸۷۱-۲ء میں مرتب کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر مُلر کی سعی سے دوبارہ زیادہ اہتمام کے ساتھ شایع ہوئی۔

تعجب ہے کہ ہم مشرقی مشرق کی اس مہتم بالشان کتاب اور اس کے مصنف سے، بہت کم واقف ہیں۔ مولوی میر منظر علی صاحب نے اس کے اکثر مقالوں کا اردو میں ترجمہ کر لیا ہے۔ اس کی ایک قسط "تحفہ" مرحوم (حیدرآباد دکن) کی دوسری جلد شمارہ (۸، ۹) میں شایع ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے اپنی مہربانی سے اس کا دوسرا حصّہ "مکتبہ" کے لئے عنایت فرمایا ہے جو نویں مقالے کی دوسری فصل کا ترجمہ ہے اور مذاہب و اعتقادات پر مشتمل۔ اس کے اور حصے بھی جو مستقل مقالوں کی حیثیت رکھتے ہیں آئندہ ہدیۂ ناظرین کئے جائیں گے۔ "الفہرست" کا مروجہ ایڈیشن جرمنی کے مشرق شناس فلوجل آنجہانی کا مرتبہ ہے جس پر تمام نوٹ اور مقدمہ جرمنی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے قدیم ہم جماعت ڈاکٹر سید جعفر حسین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی (جرمنی) سابق متعلم کلیہ جامعۂ عثمانیہ کی جرمنی زبان میں مہارت مولوی صاحب کی بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ہے ہمیں یقین ہے مولوی صاحب، ڈاکٹر صاحب کی معاونت سے بہت جلد اس ترجمہ کو مکمل فرما کر اردو دنیا سے روشناس کردیں گے۔ "المکتبہ"

میں نے ایک کتاب دیکھی جس پہ یہ لکھا ہوا تھا (ہندوستان کے مذاہب و ادیان کی کتاب) میں نے اس کو جس کتاب سے نقل کیا ہے وہ ۴ محرم ۲۴۹ھ روز جمعہ کی لکھی ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کتاب کس کی مرتبہ ہے۔ البتہ کتاب کی تحریر یعقوب[1] ابن اسحاق کندی کے ہاتھ کی تھی۔ اس کتاب کے کاتب کے قلم سے ترتیبہ کے

---

[1] ان کی کنیت ابو یوسف اور نام یعقوب بن اسحاق بن الصباح بن عمران بن اسماعیل بن محمد بن الاشعث بن قیس الکندی ہے یہ بڑے فاضل اور اپنے زمانہ میں علوم قدیمہ کے علامہ تھے تبحر کی وجہ سے "فیلسوف العرب" ان کو خطاب دیا گیا تھا فیل کے ہر فن میں کثرت سے ان کی تصانیف ہیں فلسفہ، منطق، حسابیات، کریات، موسیقیات، نجومیات، ہندسیات، فلکیات، طبیات، احکامیات، سیاسیات احداثیات، ابعادیات، تقدمیات، انواعیات۔ جدلیات نفسیات۔ ۱۲)

پیچھے یہ لکھا ہوا تھا کہ بعض متکلمین سے منقول ہے کہ یحییٰ[1] بن خالد برمکی نے ایک شخص کو ہندوستان روانہ کیا تھا تاکہ بعض جڑی بوٹیاں جو وہاں اُگتی ہیں لے آئے اور ہندوستان کے مذاہب کو بھی قلمبند کرے اسی شخص نے یہ کتاب لکھی۔ محمد[2] بن اسحاق کا قول ہے کہ عربی حکومت میں یحییٰ ابن خالد اور برمکیوں کی ایک جماعت نے ہندوستان کی طرف توجہ کی اور یہاں کے اطبا و حکما کو طلب کیا۔[3]

ہندوستان کے دیولوں کے تمام مندروں کی کیفیت اور بدُوں کے احوال

سب سے بڑا دیول مانکیر میں ہے جس کا طول ایک فرسخ ہے۔ مانکیر وہی شہر ہے جہاں بلہرا[4] ہے۔ اس شہر کا طول چالیس فرسخ ہے جس میں ساگوان اور اقسام کی لکڑیوں کا جنگل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں عام لوگوں کے پاس بار برداری کے لئے دس لاکھ ہاتھی ہیں۔ بادشاہ کے فیلخانہ میں سات ہزار اور دھوبیوں کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار ہاتھی ہیں۔ اس دیول میں تقریباً بیس ہزار بُدھ ہیں جو اقسام کے جواہرات جیسے سونا چاندی۔ لوہا۔ پیتل۔ تانبہ۔ ہاتھی دانت اور اقسام کے مصنوعی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں اور قیمتی

۱؎ یحییٰ بن خالد بن جعفر برمکی یہ سنہ ۱۱۹ھ کے آخر یا سنہ ۱۲۰ھ کے ابتدا میں پیدا ہوئے۔ ہارون رشید کے مشہور وزیر تھے انکو علم ادب، فصاحت، بلاغت میں کامل دستگاہ تھی۔ اخلاق، ایثار، فیاضی، قدر دانی، عالی ہمتی میں بے نظیر تھے۔ علاوہ ان خوبیوں کے علم کے بے حد قدرداں تھے۔ انہوں نے ۳ محرم سنہ ۱۹۰ھ میں بمقام رقہ انتقال کیا۔

۲؎ ان کی کنیت ابوالفرج اور نام محمد بن اسحاق الندیم المعروف بابن یعقوب الوراق ہے۔ یہی کتاب الفہرست کے مؤلف ہیں انہوں نے یہ کتاب شعبان سنہ ۳۷۷ھ میں تالیف کی اور ۲۰ شعبان سنہ ۳۸۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کتاب کو جرمنی کے تین علما یعنی فلوگل، رودیگر، میولر نے ایڈٹ کر کے سنہ ۱۸۷۱ء میں طبع کروایا۔

۳؎ یحییٰ برمکی کے علمی کارناموں کی جتنی بھی قدر کیجائے کم ہے عربی زبان میں دوسری زبانوں سے علوم منتقل کرنے کی جو کوششیں انہوں نے کی ہیں وہ بے حد قابل ستائش ہیں انہوں ہی نے سب سے پہلے ہارون کو بیت الحکمۃ کے افتتاح کی رائے دی اور اس میں ہر زبان کے نامور علما و فضلا کو ترجمے کے لئے فراہم کیا جو یونانی، شامی، سنسکرت کی کتابوں سے طب وغیرہ کے ترجمے کیا کرتے تھے۔ یہی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے نامی گرامی پنڈت اور حکیموں کو بلوایا۔ جن کے ذریعہ سے بیت الحکمۃ میں علمی سرمایہ کا بڑا اضافہ ہوا اس نے ہندوستان سے سب سے پہلے منکہ اور صالح بن بہلہ نامی پنڈت بلوائے جب انکی یہاں غیر معمولی قدر ہوئی تو ہندوستان کے اور پنڈت جیسے کنکہ، صنجھل، جودر شاناق خود بخود بغداد پہنچے اور ہندوستان کے نامور طبیبوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

۴؎ بلہرا ملک کا اور بادشاہ کا بھی نام ہے۔ مشقی نے اکثر جگہ جبال بلہرا یا بلاد بلہرا لکھا ہے۔ پروفیسر رینالڈ کا خیال ہے کہ یہ لفظ بالوا راجہ سے ماخوذ ہے

جواہر سے مرصع ہیں۔ یہاں کا بادشاہ ہر سال اس دیول کو اپنے محل سے پیدل جاتا ہے اور سواری میں واپس آتا ہے۔ اس دیول میں سونے کا گنبد ہے۔ جو موتی جواہر اور رنگ برنگ کے یاقوت سے مرصع ہے۔ اس گنبد کے وسط میں سونے کے تخت پر ایک سونے ہی کا بت ہے جس کا ارتفاع بارہ گز ہے۔ اس بت کو بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں ان کے پاس خصوصیت کے ساتھ تقرب کے لئے سال میں ایک خاص دن مقرر ہے۔ ایک[1] دیول مولتان (ملتان) میں ہے کہا جاتا ہے کہ سات[2] دیولوں میں سے یہ بھی ایک دیول ہے اس میں ایک بت لوہے کا وسط گنبد میں ہے جس کا طول سات گز ہے۔ اس بت کو ہر طرف سے سنگ مقناطیس اپنی متفقہ قوتوں سے روکے ہوئے ہیں بعض کا قول ہے کہ کسی آفت کی وجہ سے یہ بت ایک طرف ہٹ گیا ہے۔ یہ دیول پہاڑ کے دامن میں ہے اس پر ایک گنبد ہے جس کا ارتفاع ایک سو اسی گز ہے ہنود دور دراز ممالک سے خشکی و تری کا سفر طے کر کے یہاں زیارت کے لئے آتے ہیں۔ بلخ[3] سے اس دیول کا راستہ سیدھا ہے کیونکہ سوادِ ملتان سوادِ بلخ سے ملا ہوا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر اور اس کے دامن میں عابدوں و زاہدوں کے لئے مکان بنے ہوئے ہیں یہیں بھینٹ چڑھانے کے بھی مقامات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک گھڑی بھی زائرین سے یہ مندر خالی نہیں رہتا۔ یہاں کے ہنود کے دو بت ہیں ایک کا نام جلبکت ہے اور دوسرے کا زنبکت۔ ان دونوں کی مورتیں پتھر کی تراشی ہوئی ہیں جو ایک بڑی وادی کے دو کناروں پر واقع ہیں۔ ہر ایک کا ارتفاع اسّی گز ہے۔ یہ دونوں مسافتِ بعیدہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہنود ان کی زیارت کو آتے ہیں اور ان کے لئے اپنے ساتھ بھینٹ چڑھانے کے جانور اور دھونی کے لئے خوشبودار چیزیں لاتے ہیں۔ جب آنے والے کی دور سے اُن پر نظر پڑے تو اس پر لازم ہے کہ اُن کی عظمت کے اظہار میں اپنا

---

[1] امام شہرستانی نے جہاں مختلف معبدوں کا ذکر کیا ہے وہاں لکھتے ہیں کہ مولتان میں ایک مندر ہے جس میں بہت سے بُت ہیں جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا ہندوستان میں سدوسان کا مندر ہے جس میں بہت سے بڑے بڑے عجیب و غریب بُت ہیں۔ سال میں خاص اوقات مقرر ہیں جس میں ہنود ان مندروں کی زیارت کو آتے ہیں۔

[2] دنیا میں ستاروں کو پوجنے والے متعدد گروہ ہیں۔ ہر گروہ سبع سیاروں میں سے کسی ایک سیارے کو اپنا معبود سمجھتا ہے۔ اور اسی کے نام کا بُت بنا کر پرستش کرتا ہے۔ انھیں سات ستاروں کے دیول سبع بیوت کہلاتے ہیں۔

[3] بلخ میں منوچہر نے چاند کے نام پر مندر نوبہار تیار کیا تھا جب یہاں اسلام پہنچا تو یہ مندر ویران ہو گیا۔ (ملل و نحل)۔

سر جھکالے اگر اتفاقاً یا سہواً بلا سر جھکائے ہوئے دیکھ لے تو لازم ہے کہ وہ اس مقام تک واپس جائے جہاں سے یہ بُت نظر نہ آتے ہوں پھر وہاں سے سر جھکائے ہوئے اُن کی طرف دوبارہ روانہ ہو یہ صرف اُن کی اظہار شان کے لئے ہے۔ جس شخص نے ان بتوں کو دیکھا ہے مجھ سے بیان کیا کہ یہاں کثرت سے بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں اس شخص نے یہ بھی بیان کیا کہ بسا اوقات ایک شخص اپنی جانب سے پچاس ہزار یا اس سے زیادہ بھینٹ چڑھاتا ہے واللہ اعلم۔ ایک دیول بامیان میں ہے۔ یہ مقام سجستان سے متصل واقع ہے جب یعقوب بن لیث فتح ہند کے خیال سے آئے تھے تو اسی مقام تک پہنچے تھے۔ مدینۃ السلام (بغداد) میں جو مورتیں ہیں وہ بامیان فتح ہونے کے بعد یہیں سے بھیجی گئی ہیں۔ یہ دیول بہت بڑا ہے اکثر عابد و زاہد آتے رہتے ہیں۔ اس میں بہت سے سونے کے مرصّع بُت ہیں جن کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ہنود دور دراز ممالک سے خشکی اور تری کا سفر طے کر کے اس دیول کی زیارت کو آتے ہیں۔ سونے کے دیول کے وسط میں ایک اور دیول ہے۔ لوگوں نے سونے کے دیول کے متعلق اختلاف کیا ہے۔ بعضوں کا قول ہے کہ دراصل یہ دیول تھیر کا ہے جس میں بہت سے بدھ ہیں جب عربوں نے حجاج کے زمانہ میں اس مقام کو فتح کیا تو یہاں سے سو بہار[1] سونا لے گئے۔ اسی لئے اس کا نام سونے کا دیول رکھا گیا۔ ابو دلف ینبوعی[2] نے جو بڑے سیاح ہیں مجھ سے بیان کیا کہ سونے کا دیول جو مشہور ہے وہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ دیول ہند کے جنگلوں میں مکران و قندھار کی جانب ہے جہاں ہند کے عابدوں اور زاہدوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ یہ دیول سونے کا بنا ہوا ہے جس کا طول سات گز اور عرض بھی اتنا ہی ہے۔ البتہ ارتفاع بارہ گز ہے اقسام کے جواہر سے مرصّع ہے اس میں بدھ ہیں جو سُرخ یاقوت اور دوسرے قیمتی اور نادر پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور بیش بہا موتیوں سے

---

[1] یہ ایک باٹ ہے جس کا مختلف وزن ہے۔ اس کو کسی نے تین سو کسی نے چار سو کسی نے چھ سو کسی نے ہزار رطل کا وزنی قرار دیا ہے۔

[2] ان کا نام مسعر بن مہلہل الخزرجی الینبوعی ہے۔ بجائے ینبوعی کے کسی نے بنیرغی کسی نے منیرغی۔ کسی نے نیسرغی وغیرہ لکھا ہے یہ شاعر اور سیاح ہیں سنہ ۹۴۲ء میں بخارا سے واپس آنے والی سفارت کے ساتھ قیصر کے دربار میں گئے تھے انھوں نے اپنا سفرنامہ لکھا تھا۔ جس کا اقتباس یعقوت اور قزوینی نے لیا ہے۔ قزوینی کی عجائب المخلوقات میں ابودلف کے سفرنامہ کا اقتباس تھا لیکن پروفیسر ڈیوسٹن فلڈ نے عجائب المخلوقات کا جو اڈیشن شایع کیا ہے اس میں ان اقتباسات کو خارج کر دیا ہے۔ آثار البلاد میں بھی وہی اقتباسات ہیں جو قزوینی نے عجائب المخلوقات میں درج کئے تھے۔ (جرمن نوٹس)

مرصع ہیں جن میں کا ایک ایک موتی پرندے کے انڈے کے مساوی یا اس سے بڑا ہے۔ ابودلف کا قول ہے کہ بعض اہل ہند نے مجھ سے بیان کیا کہ اس دیول پر اوپر سے اور داہنے اور بائیں جانب سے پانی برستا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ دیول پر نہیں پڑتا۔ اسی طرح سیدھے اور بائیں جانب سے سیلاب کا پانی دیول سے ہٹ کر بہتا ہے۔

یہ بھی بیان کیا کہ بعض ہنود نے مجھ سے کہا ہے کہ کسی مرض کا بیمار کیوں نہو اگر اس دیول کو دیکھ لے تو خدا اس کو شفا عطا فرماتا ہے اور کہا کہ جب میں نے اس دیول کے متعلق دریافت شروع کی تو بحید اختلاف پیدا ہوا۔ بعض براہمہ[۱] (برہمنوں) نے کہا کہ یہ دیول آسمان و زمین کے مابین بلا کسی علاقہ کے معلق ہے۔ ابودلف نے بیان کیا کہ مقام قمار میں ہنود کا ایک مندر ہے۔ جس کی دیواریں سونے کی اور چھت چندن کی لکڑی کی ہے۔ جس کی ایک ایک لکڑی کا طول ۵۰ گز سے زیادہ ہے اس مندر کے بد محراب اور قبے قیمتی موتیوں اور بیش بہا یاقوتوں سے مرصع ہیں۔ یہ بھی بیان کیا کہ بعض ثقہ کا قول ہے کہ شہر صنف میں اس کے سوا ہنود کا ایک اور قدیم مندر ہے۔ جس کے تمام بُد اپنے پرستاروں سے گفتگو کرتے ہیں اور جو بھی ان سے پوچھا جائے اس کا جواب دیتے ہیں۔ ابودلف کا بیان ہے کہ میں جس وقت ہند میں تھا اس وقت صنف کا بادشاہ لاجین تھا۔ راہب نجرانی نے مجھ سے بیان کیا کہ اس وقت یہاں کا بادشاہ لوقین نامی ہے جو صنف کو تاخت و تاراج کر کے بادشاہ بن بیٹھا ہے۔

بُد[۲] کا بیان

یہ اُس کتاب کی نقل ہے جو کندی کے سوا کسی اور شخص کی لکھی ہوئی ہے۔

ف۱۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ براہمہ وہ لوگ ہیں جن کا انتساب ابراہیمؑ سے ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ براہمہ نبوت کے قائل ہی نہیں۔ ایسی صورت میں ابراہیمؑ کی طرف ان کو کس طرح منسوب کیا جا سکتا ہے البتہ ان کی نسبت ایک دوسرے شخص کی طرف ہے۔ جس کا نام براہام تھا اسی نے ان کو نبوت کی تکذیب کا سبق پڑھایا۔

ف۲۔ امام شہرستانی لکھتے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلے جو بُد ظاہر ہوا اس کا نام شاکین تھا جس کے معنی شریف سردار کے ہیں۔ اس بُد کے ظہور اور ہجرت نبوی میں پانچ ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ ہنود کا بیان ہے کہ مختلف اشکال میں ان کے پاس بہت سے بد نمودار ہوئے۔ اور ان کو علوم کی تعلیم دی۔ یہ اپنے شرف کی وجہ سے بادشاہوں کے مکانوں ہی میں ظہور پذیر ہوئے ۱۲ م۔

اہلِ ہند نے بُد کے متعلق اختلاف کیا ہے ایک گروہ کا بیان ہے کہ بُد باری تعالیٰ کی صورت ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بُد اللہ کے اُس رسول کی صورت ہے جو ان کے پاس بھیجا گیا تھا۔ پھر یہاں سے ایک دوسرا اختلاف شروع ہوتا ہے ایک جماعت کہتی ہے کہ رسول فرشتوں سے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ بشر ہیں اور ایک کا بیان ہے کہ عفریتوں سے ہیں ایک جماعت کا قول ہے کہ بُد یوذاسف حکیم کی صورت ہے جو اللہ کی طرف سے اِن کے پاس مبعوث ہوا تھا۔ ہر گروہ کے لئے بُد کی تعظیم و عبادت کا خاص طریقہ ہے بعض ثقہ کا بیان ہے کہ ہنود کے ہر مذہب کے لئے ایک خاص مورت ہے جس کی یہ تعظیم و عبادت کرتے ہیں۔ بُد اسم جنس ہے اور صنم یعنی بت نوع ہے۔ بڑے بُد کی شکل ایک انسان کی ہے۔ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے چہرہ پر بال نہیں ہیں۔ ٹھوڑی مُنہ میں گھسی ہوئی ہے کمبل اوڑھے ہوئے متبسمانہ انداز سے ہاتھ کی انگلیوں سے تیس کا "عقد" باندھے ہوئے ہے۔ بعض ثقہ کا بیان ہے کہ ہر گھر میں بُد کی مورت رہتی ہے اور یہ گھر والے کے حسب استطاعت مختلف اشیاء سے بنائی جاتی ہے یا تو سونے کی ہوتی ہے اور اقسام کے جواہر سے مرصع رہتی ہے یا چاندی۔ پیتل۔ پتھر۔ لکڑی کی ہوتی ہے جس طرف اس کا رُخ ہو اسی طرف متوجہ ہو کر پوجا کرتے ہیں یا مشرق سے مغرب کی جانب یا مغرب سے مشرق کی جانب۔ لیکن اکثر بُد کو مشرق کی طرف پیٹھ کر کے بٹھلاتے ہیں جس کی وجہ سے پوجا کے وقت پرستاروں کا رُخ مشرق کی جانب ہوتا ہے۔ منقول ہے کہ ہنود کے پاس بُد کی صورت ایک سر میں چار طرف بنی ہوئی ہے۔ یہ مہندسانہ اصول سے بڑی صنعت کے ساتھ بنائی گئی ہے۔ جس طرف سے بھی اس مورت کو دیکھا جائے کامل چہرہ نظر آتا ہے۔ ہرگز کوئی جز چھپا نہیں رہتا۔ مولتان میں جو بت ہے اُس کی یہ تصویر ہے (اصل کتاب میں تصویر نہیں ہے) یہ تصویر کندی کے قلم کی ہے۔

مہاکالیہ [1]

ہنود کا ایک بُت ہے جس کو مہاکال کہتے ہیں اس کے چار ہاتھ ہیں اور رنگ نیلگوں ہے۔ سر کے بال گھنے اور چھدری داڑھی ہے۔

---

[1] مہاکال کی صورت کا ایک بڑا بت ہندوستان کے ایک موضع میں ہے جس کا نام اختر ہے۔ ہر سمت سے ہنود یہاں آتے ہیں اُس کو سجدے کرتے ہیں اور اس سے اپنی دنیاوی مرادیں مانگتے ہیں حتی کہ بعض اپنی دعا میں اس بت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ فلاں عورت سے ہماری شادی کرا دے۔ اور اتنا روپیہ ہمکو عطا کر۔ بعض یہاں آکر دنوں تک مقیم رہتے ہیں اور فاقے کر کے آہ و زاری سے اپنی مراد مانگتے ہیں بسا اوقات ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ (ملل و نحل)

دانت باہر نکلے ہوئے ہیں۔ پیٹ کھلا ہوا ہے۔ پیٹھ پر ہاتھی کا چمڑا ہے جس سے خون ٹپکتا ہے اس بُت کے سامنے کی جانب ہاتھی کے ہاتھ کے چمڑے سے گرہ دی گئی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا اژدہا منہ کھولا ہوا ہے دوسرے ہاتھ میں عصا۔ تیسرے میں انسان کا سر ہے۔ چوتھا ہاتھ اٹھا ہوا ہے۔ اس کے دونوں کانوں میں بالیوں کی طرح دو سانپ ہیں۔ دو بڑے اژدہے اس کے جسم سے لپٹے ہوئے ہیں۔ سر پر کھوپڑی کے ہڈیوں کا تاج ہے اور اسی کا ایک ہار بھی ہے۔ ہنود کا خیال ہے کہ یہ شیاطین سے ہے۔ چونکہ یہ عالی مرتبہ ہے اور اس میں خصائل محمودہ جیسے عطا و احسان اور خصائل مذمومہ جیسے بخل و برائی دونوں موجود ہیں اس لئے مستحق پرستش ہے یہی مصائب میں ان کا پشت پناہ ہے۔

مذہب دینکیتہ[1]

اس مذہب کے پیرو آفتاب کے پرستار ہیں انھوں نے آفتاب کا ایک بُت تیار کیا ہے جو گاڑی پر ہے۔ اس گاڑی کے نیچے چار طرف پہیوں کے معاوضہ میں چار گھوڑے ہیں۔ اس بت کے ہاتھ میں آتشی رنگ کا ایک جوہر ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ آفتاب فرشتوں کا بادشاہ ہے۔ اور مستحق پرستش ہے۔ یہ لوگ اس کو سجدہ کرتے ہیں اور خوشبو جلا کر گاتے بجاتے ہوئے اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس بُت کی بہت سی املاک اور آمدنیاں ہیں۔ خدام و نگراں کار بھی ہیں جو اس کی اور اس کے املاک کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس بُت کی دن میں تین دفعہ پرستش کیجاتی ہے جس کے متعلق ان کے پاس اقسام کے اقوال ہیں۔ مایوس العلاج مریض، جذام و برص اور امراض مزمنہ کے بیمار اس بُت کے پاس آکر دنوں تک قیام کرتے ہیں۔ روزے رکھکر آہ و زاری کے ساتھ سجدے کرتے ہیں اور اپنی صحت کی دُعا مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ خواب میں ان کو کوئی کہنے والا یہ کہتا ہے کہ تو اچھا ہو گیا۔ اور تیری مراد پوری ہو گئی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ بُت مریض سے خواب میں گفتگو کرتا ہے جس کی وجہ سے مریض صحت یاب ہوتا ہے اور اس کی حالت اصلی عود کر آتی ہے۔

مذہب چندر بہکتیہ[2]

اس مذہب کے پیرو چاند کی پرستش کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ چاند فرشتوں سے ہے اور تعظیم و عبادت کا

---

[1] اس لفظ میں اختلاف ہے امام شہرستانی نے دینکیتہ ہی لکھا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے بعضوں نے تیکتیہ لکھا ہے پروفیسر رنیاڈ کا خیال ہے کہ یہ لفظ دینی بکتی نہیں بلکہ ادیتی بکتی سے ماخوذ ہے جس کے معنے آفتاب پرست کے ہوتے ہیں۔ عموماً آفتاب پرست سوریا بکھان کہلاتے ہیں (جرمن نوٹس) ہے

[2] امام شہرستانی نے اس لفظ کو جندر بکینیہ لکھا ہے۔ پروفیسر رنیاڈ کا خیال ہے کہ یہ چندر بہکتیہ ہوگا۔ اس لئے کہ چندرا بکتیا کے معنی چاند پرست کے ہیں (جرمن نوٹس)

ستحق ہے ان کا مذہبی طریقہ یہ ہے کہ چاند کا ایک بت بناتے ہیں جو گاڑی پر ہوتا ہے۔ اس گاڑی کو چار سطح کھینچتے ہیں اس بت کے ہاتھ میں ایک جوہر ہوتا ہے جس کو چندرکیت کہتے ہیں ان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اس بت کی پرستش اور اسی کو سجدہ کریں اور ہر مہینہ میں پندرہ روز کے روزے رکھیں۔ جب تک چاند طلوع نہ ہو افطار نہیں کرتے جب طلوع ہو جائے تو دودھ اور کھانے پینے کی چیزیں اس بت کے پاس لاتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور چاند کو دیکھ کر مرادیں مانگتے ہیں جب مہینہ شروع ہو اور چاند دکھائی دے تو مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر چاند دیکھتے ہیں اور خوشبو جلاتے ہیں اور رویت کے وقت چاند کی طرف توجہ کر کے اس کو پکارتے ہیں پھر چھتوں سے اتر کر کھانے پینے اور عیش و سرور میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر چاند کو اچھے مواقع پر ہی دیکھتے ہیں۔ جب مہینہ نصف ہو جائے اور افطار سے فارغ ہوں تو چاند اور اس کے بت کے روبرو گانے بجانے اور رقص و لعب میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

مذہب انشنیہ[1]

اس کے پیرو کھانے پینے سے منع کئے جاتے ہیں۔

مذہب بکرنتینیہ[2]

یعنی لوہا پہننے والے۔ ان کا مذہبی طریقہ یہ ہے کہ یہ سر اور ڈاڑھی منڈوا دیتے ہیں اور ستر کے سوا اپنے تمام جسم کو برہنہ رکھتے ہیں ان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ نہ تو غیر مذہبوں سے گفتگو کریں اور نہ ان کی تعلیم دیں۔ جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہو اس کو خیرات کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ اس میں تواضع پیدا ہو جو شخص ان کا دین قبول کرے وہ لوہا نہیں پہن سکتا تاوقتیکہ وہ اس مرتبہ میں نہ پہنچے۔ جس میں پہنچنے کے بعد وہ لوہا پہننے کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ لوگ کمر سے سینہ تک لوہا پہنتے ہیں اس لئے کہ غلبۂ فکر اور کثرت علم سے پیٹ پھٹ نہ جائے۔

۱؎۔ بعضوں نے اس کو انشتیہ بھی لکھا ہے۔ پروفیسر براک ہوز جرمن کے ایک مشہور رسالے میں لکھتے ہیں کہ دراصل یہ "اشنیہ" ہے جس کے معنی فاقہ رہنے کے ہیں ۱۲

۲؎۔ بعض نے تکرتیہ اور شہرستانی نے بکرنتینیہ ہی لکھا ہے۔ پروفیسر ہاربرکر کا خیال ہے کہ یہ لفظ بکرابنتیا ہے جس کے معنی دگرانیدھا کے پیرو کے ہیں۔

مذہب کنکایاتره[1]

اس مذہب کے پیرو ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اگر کوئی بڑا گناہ کرے۔ جب وہ نہر کنک[2] میں غسل کرے تو پاک ہوجاتا ہے۔

مذہب راجمرتیہ[3]

یہ بادشاہوں کے فرماں بردار ہیں ان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ بادشاہوں کی اعانت کریں ان کا قول ہے کہ خالق عالم نے بادشاہوں کو ہمارا مالک بنایا ہے اگر ہم ان کی اطاعت میں قتل ہوجائیں تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔

ہنود کا ایک اور مذہب ہے[4]

جس کے پیرو سر کے بال بڑھاتے ہیں اوران کو گوندھ کر اپنے چہروں پر لٹکاتے ہیں جس سے سر کے اطراف کے تمام حصے ڈھک جاتے ہیں۔ اور بال سر کے اطراف بالکل برابر رہتے ہیں۔ یہ تمرا

سلہ۔ اس لفظ میں بھی اختلاف ہے بعض نے اس کو کبکاتره اور بعضوں نے کیکا تره لکھا ہے۔ پروفیسر برک ہاوز کا خیال ہے کہ یہ لفظ گنگا یاتره ہے جس کے معنی گنگا کی جاترا کے ہیں ۱۲ (جرمن نوٹس)

سلہ۲۔ اصل کتاب میں نہر الکیف لکھا ہے۔ ہندوستان میں اس نام کا کوئی دریا نہیں البتہ دریائے گنگ مشہور ہے نیز مذہب کے نام کے لحاظ سے بھی بجائے کیف کے کنک ہونا قرین عقل معلوم ہوتا ہے۔

سلہ۳۔ اس لفظ کے متعلق پروفیسر رینالڈ اور برک ہاوز کا خیال ہے کہ بجائے راجمرتیہ کے راجپرتیہ ہونا چاہئیے۔ لیکن راج کے بعد کے حروف کی نسبت وہ کچھ تحقیق نہ کرسکے مگر ان کا بیان ہے کہ اس کے معنے بادشاہ کے پیرو یا فرماں بردار کے ہیں

سلہ۴۔ امام شہرستانی نے اس مذہب کا نام بھادونیہ لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ہنود کا قول ہے کہ بھادون ایک بڑا فرشتہ تھا جو بڑے انسان کی شکل میں آیا تھا۔ اس کے دو بھائی تھے جنہوں نے اس کو قتل کرکے اس کے چمڑے سے زمین اور ہڈیوں سے پہاڑ بنائے۔ بھادون کی صورت ایک چوپایہ پر سوار ہے۔ بال گھنے اور سر کے اطراف لٹکے ہوئے ہیں۔

نہیں پیتے۔ ایک پہاڑ جور عن[1] نامی ہے۔ جس کی یہ لوگ زیارت کرتے ہیں۔ زیارت سے واپس ہوتے ہوئے اثناء راہ میں کسی بستی میں داخل نہیں ہوتے اگر عورت دکھائی دے تو بھاگ جاتے ہیں۔ جب پہاڑ کی زیارت کے لئے یہ جاتے ہیں۔ اس پر بڑا مندر[2] ہے جس میں ایک مورت ہے۔

غزل

جناب اختر شیرانی

کبھی، کاش، رحم کا بھی اثر ملے چشم فتنہ نگاہ میں
کہ کوئی گدا ہے پڑا ہوا ترے درد عشق کی راہ میں

جو نظام دل، نہ بدل سکا، تو مذاق دہر کا کیا گلہ
وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں

گلۂ ستم کی تو ہے مجال، پر آہ، اس کو میں کیا کروں؟
یہ جو ایک بجلی سی بیقرار ہے اُن کی نیچی نگاہ میں

نہیں یاد، عیش و ملال عمر گزشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ، چند وہ ساعتیں، جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں

نہیں عذر، زاہدو! لاکھ مرتبہ جائیں طوف حرم کو ہم
مگر ایک شرط ہے، میکدہ، نہ ملا کرے ہمیں راہ میں

بخدا کہ دونوں جہاں میں، کوئی بھی اس سے بڑھ کے مزہ نہ تھا
اگر ایک تلخیٔ انفعال کی حس نہ ہوتی گناہ میں

---

[1] امام شہرستانی نے اس کو جور عن لکھا ہے۔ ۱۲

[2] اس مندر میں بھادون کی مورت ہے۔ اس مندر کے نگراں کار ہیں جن کے پاس اس کی کنجی رہتی ہے بغیر نگراں کار کی اجازت کے کوئی بھی مندر میں داخل نہیں ہو سکتا مندر کا دروازہ کھولتے ہی یہ لوگ اپنے منہ بند کر لیتے ہیں تاکہ بت تک ان کی سانس نہ پہنچے ۱۲ م (ملل و نحل)

تنقید و تبصرہ

گذشتہ تین ماہ میں ہمارے پاس جس قدر رسالے اور کتابیں تنقید کی غرض سے وصول ہوئی ہیں، ان میں سے صرف چند رسالوں پر اس دفعہ تنقید پیش کی گئی ہے باقی آئندہ رسالے کے لئے محفوظ ہیں۔

صوفی (عید نمبر) تقطیع $\frac{1}{16}$ رایل صفحات ۹۲ مطبوعہ صوفی پرنٹنگ پریس۔ منیجر "صوفی" پنڈی بہاء الدین (پنجاب) سے ایک روپیہ آنے پر طلب کیا جاسکتا ہے۔

صوفی اپنے تصوفانہ اور مذہبی مضامین کی خصوصیت کی وجہ سے عرصہ تک اردو کا ایک خاص رسالہ رہا ہے مسٹر ملک محمد اسلم خاں بی اے (کنٹب) کی ادارت میں اس نے اپنی زندگی کا ایک نیا ارتقائی صفحہ الٹا ہے۔ اب "صوفی" ملک کے عام رسالوں کے دوش بدوش ہونے کے ساتھ ہی ساتھ، اپنی قدیم روایات سے بھی اس قدر دور نہیں جا پڑا ہے کہ اس کو "صوفی" کے علاوہ اور کوئی رسالہ سمجھ سکیں۔

غالباً عید (قربان) نمبر میں، موقع کے اقتضا سے زیادہ تر اسلامی مضامین، خصوصاً "قربانی" پر مختلف پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ "ہلالِ عید" سے لیکر "عید قربان" "ابراہیم و اسمٰعیل" "قربانی" پھر "رسمِ قربانی کی مصلحت" پر نظم و نثر کے قابل مطالعہ مضامین کا اس میں اجتماع ہے۔ "یاد الست" کی پر کیف نظم قدیم و جدید "صوفی" میں اتصال کی کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔

اس خصوصیت سے ہٹ کر (۹۰) صفحات کا ضخیم رسالہ چالیس عام اور "غیر مطبوعہ" مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں مختلف موضوع پر (۱۷) نظمیں، ایک ڈراما (۷) مختصر قصے اور باقی متفرق مضامین ہیں۔ ڈراما روسی مضحکہ نگار، یفریئنوف کا شہ کار ہے۔ قصوں میں چیخوف کا "وبالِ جان" نہایت دلچسپ ہے ملا رموزی کے "مصلحین" کے علاوہ باقی مضامین میں "تاریخ ہسپانیہ کا ایک ورق" "دنیا کا خاتمہ" "تعلیمی کورس" خاص مطالعہ کے قابل ہیں۔

"صوفی" کا خاص "عید نمبر" اردو کے "خاص نمبروں" میں ایک قابل ذکر اضافہ ہے۔ ترتیب مضامین، لائق مدیر کے حسب خواہش نہ ہو سکی جس کی تلافی کا وعدہ ستمبر کے "رسول نمبر" اور "نشر ظرورت"

اُردو نمبر" کی صورت میں کیا جانے والا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ "صوفی" مسٹر موصوف کی ادارت میں بے حد چمکیگا۔ خدا کرے کہ ہر ماہ میں اس کا اسی شان کا خاص نمبر نکلتا رہے۔

عصمت (جوبلی نمبر) تقطیع ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۲۵۲۔ قیمت عہ/ منیجر رسالہ "عصمت" (دہلی) سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

یہ خاص نمبر "عصمت" کی ۲۰ سالہ جوبلی کے موقعہ پر شائع کیا گیا ہے۔ "عصمت" اردو کے معاشرتی ناول نگار جناب راشد الخیری کی نگرانی میں، زبان اور ادب اُردو سے زیادہ معاشرتی، خصوصاً صنف لطیف کی علمی اور ذہنی توسیع کا جو کام انجام دے رہا ہے اس سے علمی دنیا ناواقف نہیں ہے۔ "شریف ہندوستانی بیبیوں کے لئے، اردو میں پاکیزہ خیالات، علمی ادبی مضامین اور مفید معلومات کا ذخیرہ" فراہم کرنے کا جو بیڑا دوسرے اسی قسم کے رسالوں کے ساتھ، اس رسالے نے اٹھایا ہے۔ اس کا ایک اچھا خاکہ خود یہ جوبلی نمبر ہے یتو کے قریب چھوٹے چھوٹے مذہبی، اسان، اخلاقی، تمدنی، تاریخی، ادبی، دلچسپ اور مفید مضامین سے مملو، اور ساٹھ سے زیادہ خوبصورت، سبق آموز تصاویر سے مزیّن ہے۔ "بھارت ماتا" کی عصمت آب دیوی کی شبیہ سے رسالے کا افتتاح ہوتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ "عصمت" خاص نمبروں کی اشاعت کے لئے بہانے ڈھونڈنے میں مصروف نہیں ہے۔ بلکہ اس نے رفتار زمانہ سے ممتاز اور معاصر زمانہ کی چال اختیار کی ہے۔ صنف لطیف کے اسی رسالے کو بیس سالہ زندگی سے متمتع ہونے کا موقع نصیب ہو سکا۔

یوں تو جوبلی نمبر کے تمام مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ لیکن حفظان صحت، پرورش اطفال، خانہ داری اور دستکاری کے مضامین جو اس کا خاص سرمایہ ہونا چاہیئے تھا، موجود ہے اور یہی چیز ہے جس کی فی الحال ہم کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارا مطمح نظر یہ نہیں کہ ہم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ "مہذب" بیبیاں پیدا ہوں بلکہ یہ خواہش ہے کہ بہترین سلیقہ شعار اور "منتظم" بی بیاں وجود میں آئیں۔ پہلی چیز تصوری ہے۔ لیکن دوسری عملی اور ضروری۔

صنف لطیف کی ترقی کے خواہاں اس کی ضرور مدد کریں اور کوشش کریں کہ جوبلی نمبر جو اب چار ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔ کم سے کم چالیس ہزار تو شائع ہو۔ "س"

معلومات

شہد کی چیونٹیاں

میکزیکو اور ممالک متحدہ امریکہ کے جنوب مغربی حصہ میں اور خصوصاً گارڈن آف دی گارڈنز میں جو کہ کولوراڈو کے علاقہ میں ہے، ایک قسم کی چیونٹی پائی جاتی ہے جس کو شہد کی چیونٹی HONEY ANTS. کہتے ہیں۔ ان چیونٹیوں کو امریکہ کے قدیم باشندے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

یوں تو معمولی چیونٹیاں بھی جب کبھی شربت وغیرہ کی سی میٹھی اور پتلی چیز پاتی ہیں تو اپنے پوٹے میں اچھی طرح سے بھر لیتی ہیں اور اپنی آبادی میں پہنچکر بچوں اور دوسرے باشندوں میں تقسیم کر دیتی ہیں مگر یہ خصوصیت شہد کی چیونٹیوں میں خاص طور پر ترقی پا چکی ہے۔

ان میں ایک خاص جماعت شہد کا ذخیرہ کرنے کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔ ان شہد کا ذخیرہ کرنے والی چیونٹیوں کو شہد کے مرتبانوں سے HONE POTS. تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان چیونٹیوں کے پیٹ خاص طور پر اور چیونٹیوں سے بڑے اور سڈول ہوتے ہیں۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ چیونٹیاں پیدائشی طور پر مرتبان کی خصوصیات نہیں رکھتیں بلکہ بچپن میں جبکہ ان کے جسم نرم ہوتے ہیں چند چیدہ چیونٹیوں کو اُن کی ضرورت سے زیادہ شہد کھلا کر اُن میں یہ خصوصیات پیدا کی جاتی ہیں۔ چیونٹیوں کو معدہ کی ضرورت سے زیادہ جو شہد ملتا ہے وہ اپنے پوٹے میں جمع کرنے لگتی ہیں اس طرح رفتہ رفتہ ان کا پوٹا بڑھ کر ان کو مرتبان چیونٹیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مرتبان چیونٹیوں کو اپنے وزن کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہوتا ہے۔ شہد کے مرتبانوں کا کام صرف یہی ہے کہ اپنی آبادی میں رہکر دوسری چیونٹیوں کا باہر سے لایا ہوا شہد اپنے پوٹے میں جمع کریں۔

گارڈن آف دی گارڈنز میں شہد کی چیونٹیاں سیپیوں وغیرہ کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بنا لیتی ہیں۔ جس کے بیچوں بیچ اُن کی آبادی کا رستہ ہوتا ہے۔ اس پر چند چیونٹیاں ہمیشہ پہرہ دیتی رہتی ہیں کہ کوئی اور جانور یا کسی دوسری آبادی کی چیونٹی ان کی آبادی میں نہ آنے پائے۔ آبادی کے اندر چھوٹے چھوٹے غار یا کوٹھریاں ہوتی ہیں۔ جن کے فرش مسطح اور جن کی چھتیں بالکل ناہموار ہوتی ہیں۔ فرش چلنے پھرنے کا کام دیتے ہیں اور چھتوں پر شہد کے زندہ مرتبان لٹکے ہوتے ہیں۔ ان مرتبانوں کو چھتوں کی ناہمواری سے

لٹکے رہنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہر ایک آبادی میں اس قسم کے زندہ مرتبان تقریباً سو ہوتے ہیں۔
باہر سے شہد لانے والی چیونٹیاں صرف رات کو کام کرتی ہیں۔ دن کو باہر نہیں جاتیں۔ شام ہوتے ہی اپنی آبادی سے نکلکر قرب و جوار کے شاہ بلوط (OAK) کے چھوٹے چھوٹے درختوں پر شہد کی جستجو میں چکر لگاتی ہیں۔ ان درختوں کی ڈالیوں پر ایک قسم کے کیڑے کے کوئے ہوتے ہیں جن میں سے رات کے وقت ایک طرح کے میٹھے عرق کے چھوٹے چھوٹے قطرے ٹپکتے ہیں۔ ان قطروں کو چیونٹیاں جلد جلد چوس لیتی ہیں اور واپس آکر مرتبان چیونٹیوں کے پوٹوں کو بھر دیتی ہیں کہ وقتِ ضرورت کام آئے۔

عجائباتِ قدرت

کیکڑا اور سیپ سمندر میں ایک بالکل چھوٹی قسم کا کیکڑا ہوتا ہے جس کی جسامت مٹر کے برابر ہوتی ہے چنانچہ اس کو (PEA CRAB) پی کریب کہتے ہیں۔ اس کیکڑے اور چند بڑی قسم کی سیپیوں[۱] کی خاص دوستی ہے۔ یہ کیکڑا سیپیوں کے خول کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ سیپ جو کچھ کھاتی ہے اس کا بچا کھچا یہ چٹ کر جاتا ہے اس طرح خول میں زیادہ غذا رہ کر سڑنے نہیں پاتی۔
کیکڑے کا جسم نہایت گدگدا اور سڈول ہوتا ہے، خاص کر مادہ کا جو کبھی سیپ کو چھوڑ کر نہیں نکلتی، جب تک کہ دونوں میں سے کوئی ایک مر نہ جائے۔ نر کا جسم بہ نسبت مادہ کے کسی قدر سخت ہوتا ہے کیونکہ اُسے مادہ کی تلاش میں ایک سیپ سے دوسری سیپ کو پھرنا پڑتا ہے۔ بچپن میں ان کیکڑوں کے جسم بہ نسبت بڑوں کے سخت اور نوک دار ہوتے ہیں مگر جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ جسم کے نوکدار حصے جھڑ جاتے ہیں اور ان کے جسم نرم اور سڈول ہونے لگتے ہیں۔ تاکہ یہ کیکڑے اپنی آئندہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں۔
اس کیکڑے اور سیپیوں کی دوستی نسلاً بعد نسلاً چلی آرہی ہے دونوں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

———(+)———

---

[۱] عام طور پر جس چیز کو سیپ کہتے ہیں وہ دراصل اس نام کے ایک جانور کا گھر یا خول ہوتا ہے۔ یہ جانور نرم اور رقالودہ کے ٹکڑے کا سا ہوتا ہے۔ اس مضمون میں سیپ سے مراد اسی جانور سے ہے۔

دکن کی صحافت میں ایک نئے اخبار کا اضافہ

صبح دکن روزانہ

زیر ادارت

مولوی احمد عارف صاحب

بہترین اسٹاف اور معقول سرمایہ کے ساتھ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ م ۲۲ مہر ۱۳۳۷ف سے جاری ہو چکا ہے۔ بڑی سائز کے چار صفحات پر جس کے ہر صفحہ پر چار کالم ہیں بڑے اہتمام سے شائع ہو گیا۔ قیمت سالانہ بلدہ سے عـہ ۹ ششماہی لـہ بیرون بلدہ سے دیہ ۵ ششماہی ہے

المشتہر منیجر صبح دکن حیدرآباد دکن

مطبوعات مکتبہ

علمی و ادبی کتابیں

دکن میں اردو۔ مولفہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل اس کتاب میں جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ اور قطب شاہی اور عادل شاہی اور آصف جاہی دور میں اردو نظم و نثر کی کیفیت اور ہر دور کے شعرا کے جستہ جستہ حالات کے ساتھ اُن کا نمونہ کلام پیش کرکے اردو زبان کا ارتقاء دکھلایا گیا ہے ضخامت ۳۸۰ صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

خیابان اردو مرتبہ جناب احمد عارف صاحب حیدرآبادی یہ ہندوستان کے ماضی و حال کے ممتاز اردو انشاپردازوں اور نامی گرامی شعرا کے چیدہ نظم و نثر کے جواہر ریزوں کا مجموعہ ہے اردو ادب میں بہترین انتخاب ہے۔ سرستان ادب کیلئے گرانبہا تحفہ ہے یہ کتاب مدارس کی تعلیمی ضروریات کو بھی کما حقہٗ پورا کرسکتی ہے ضخامت تقریباً ۲۴۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ ۱۲ر

روح تنقید اس کتاب کو ملک کے فاضل انشاپرداز مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زورؔ ایم اے نے تصنیف کرکے اردو ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اردو دنیا کو علمائے یورپ کے فن تنقید سے روشناس کرایا جائے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے زورؔ صاحب نے اس کتاب میں یورپ میں دورِ حاضرہ کے علاوہ دورِ ماضی اور متوسط اور عصرِ بیداری میں جس قدر نقد و نظر کے اصول جاری و ساری تھے ان سب کو بیان کیا ہے اور پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید کرکے اُن کا استعمال دکھلایا ہے ضخامت (۳۰۵) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ طبع دوم عہ ۱۲ر

تنقیدی مقالات مصنفہ زورؔ صاحب۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جسمیں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبان کے مشہور اہل قلم کی قلم کاریوں پر تنقید کرکے تنقیدی اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور شاردو، میر انیس کی شاعری میر حسن اور سحر البیان، فارسی شعر کا آغاز اور ابو علی بلعمی ہوریس آسمتھ کیفی حیدرآبادی کی سرخیوں کے تحت ہر ایک کے کلام طرز تحریر اور اسلوب بیان پر تنقید کی گئی ہے اور متعلقہ مضمون کے خاتمہ پر اس کی (BIBLIOGRAPHY) یعنی علمیات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے تاکہ مزید تحقیق کرنے والوں کے لئے سہولت ہو ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ مجلد سادہ عہ

اردو کے اسالیب بیان مصنفہ زورؔ صاحب ہر زبان کے ادب میں اسلوب بیان کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ادب میں نظم کے اسالیب بیان کا ابتدا سے لیکر آج تک کا حال اُردو تذکروں سے معلوم ہوسکتا ہے لیکن نثر کے طرز تحریر کے متعلق اُردو کے تذکرے اور تاریخیں ساکت ہیں اس کتاب سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اردو نثر نگاری کی ابتدا کب ہوئی اور مختلف دوروں میں اس کا کیا رنگ رہا اور موجودہ زمانہ میں خاص طرز تحریر کے کون کون انشاپرداز ہیں ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا اور لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زورؔ صاحب غزنوی سلطنت اور غزنین کے باہمی تعلقات، سلطان محمود غزنوی سے پہلے کے فارسی علم ادب کی حالت سلطان محمود کی معارف نوازی [illegible] غزنین کے ارباب علم و فضل کے حالات اور سلطان محمود اور غزنوی دور کے علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ہے ترتیب کتاب کے وقت ادبیات ایران مصنفہ پروفیسر براؤن مصنف کے زیر مطالعہ رہی ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے

کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ اڈیشن قیمت ۱۲؍

طلسم تقدیر مصنفہ زور صاحب۔ یہ ایک نیم تاریخی فسانہ ہے جس میں دکن کی تاریخ اور اس کے باشندوں کی تمدنی حالت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں تقدیر و تدبیر کے اہم مسئلہ کو بڑی خوبی سے سلجھایا گیا ہے ضخامت ۶۵ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۸؍

دنیائے افسانہ اب تک اردو میں ادب لطیف کے متعلق کوئی اصول قلم بند نہیں ہوئے تھے مولوی عبد القادر سروری ایم اے ال ال بی کا اردو دنیا پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کر کے دنیائے اردو ادب کو زیر منت کیا ہے اس کتاب میں افسانہ و ناول نگاری کی تاریخ اور اس کے اصول و مبادیات پر بحث کی گئی ہے افسانہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں اردو افسانوں اور ناولوں کو بھی جانچا ہے اخیر میں مصنف نے اردو افسانہ نگاری کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے اردو افسانہ نگاروں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے ضخامت ۲۱۸ صفحے پاکٹ اڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا سید غلام مصطفےٰ ذہین و علامۃ الدہر مولانا سید مختار احمد۔ ہندوستان کے مشہور عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی، ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا گیا ہے جو ہر مرد و عورت اور طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہے ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی خاصی پاکٹ اڈیشن قیمت عہ

قاموس الاغلاط مصنفہ علامۃ الدہر سید مختار احمد و مولانا ذہین اس کتاب میں پانچ ہزار کے قریب الفاظ کی تحقیق و تدقیق ادبی اغلاط کی تصحیح و تنقیح ہے اور ممتاز ادیبوں اور نامی گرامی شاعروں کے کلام کے حوالوں سے استناد کیا گیا ہے تحقیق ادب میں یہ پہلی کتاب ہے جو اہل ادب کے لئے مفید کار آمد علمی تحفہ ہے زیر طبع

مبادی فلسفہ از مولوی میر ... ایم اے ایل ایل بی عثمانیہ مولف نے ڈاکٹر اے ایس راپوپورٹ پی ایچ ڈی کی کتاب پرائمر آف فلاسفی کو عام فہم سلیس اور بامحاورہ اردو میں خوبی سے منتقل کیا ہے کہ فلسفہ جیسا دقیق مضمون بالکل سہل ہو گیا ہے ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ اڈیشن ۱۴؍

اسوۂ حسنہ مصنفہ احمد عبد الصمد وسی بی اے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ہر مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے پاکٹ اڈیشن ضخامت ۸۰ صفحے قیمت ۸؍

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ام آر اے ایس سلسلہ مشاہیر اسلام و سرپرستان علوم و فنون میں مسلمان حکمرانوں کے علمی کارناموں سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے کتاب کی ابتدا میں ایک محققانہ دیباچہ ہے جس میں سلاطین اسلام کے علمی کارناموں سے متعلق مورخین کی غلطیوں کا انکشاف کیا گیا ہے یہ مصنف کے سالہا سال کے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تدقیق واقعات کا بے بہا علمی سرمایہ ہے ہر تعلیم یافتہ مسلمان زیر مطالعہ رکھے تاکہ اسکو اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کی حقیقت منکشف ہو ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ چکنا سائز ۲۰×۲۶/۱۶ لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور جاگی اس کتاب میں ایک رفیع الشان صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ اور مفصل سوانح حیات ہیں جن کا وجود مبارک آصفجاہ ثالث نواب سکندر جاہ بہادر کے زمانہ میں ظہور پذیر ہوا تھا ابتدائے کتاب میں فن تذکرہ نویسی کی نسبت مولوی مرزا حسینی بیگ شاذلی کا مقدمہ درج ہے ضخامت ۴۸ صفحہ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین سائز پاکٹ اڈیشن قیمت ۵؍

خزینۂ اخلاق از مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز یہ اخلاقی اور ادبی نظم و نثر کا مجموعہ ہے اس میں کی اکثر نظمیں وقتاً فوقتاً اردو رسالوں میں شایع ہو کر مقبول ہوئی ہیں یہ لڑکے اور لڑکیوں کیلئے مفید اور کارآمد کتاب ہے ضخامت ۴۰ صفحے لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۲؍

سیرت خیر البشر ناظم الاخلاق مولانا ذہین صاحب کا طبعزاد منظوم رسالہ ہے جس میں آنحضرت صلعم کے اخلاق حمیدہ کو عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے یہ بچوں کیلئے نہایت مفید رسالہ ہے قیمت ۱؍

نیک بی بی یہ بھی مولانا ذہین کا منظوم رسالہ ہے اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایک نیک خو بی بی اپنے بدخو شوہر کو کس طرح ٹھیک کر سکتی ہے یہ عورتوں کے لئے نہایت مفید رسالہ ہے۔ قیمت ۲؍

مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔ باہتمام رام کشن لیتھوگرافر و منیجر مطبع

۱ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے جو ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

۲ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے۔ حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴ قیمت سالانہ للعہ مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کیلئے عالہ فی پرچہ ۶؍

۵ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے صہ نصف کیلئے ہے اور چوتھائی کے لئے عہ ہے۔ اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ۱/۲ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

۶ ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط منتظم مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

منتظم مجلہ

مجلہ مکتبہ

ر.س. آصفیہ (۶۵) ر.س. انگلشیہ (۰)

جلد (۱) بابتہ ماہ آبان ۱۳۳۷ف م ستمبر ۱۹۲۸ء شمارہ (۶)

فہرست

گولکنڈہ

(از جناب مولوی اعجاز علی صاحب فنا شہرت)

دیکھ او سیاح آہستہ قدم رکھنا یہاں تاجدارانِ دکھن ہیں خفتگانِ زیرِ خاک
تو بھی دو آنسو بہاوے گا اگر فرزانہ ہے

ہیں یہ سب برج و فصائل شانِ رفتہ کی گواہ اور انکے گرد گہری خندقیں غار و مغاک
گنبدِ رنگیں میں اب بھی شوکتِ شاہانہ ہے

مسندِ زرّیں نہ قالیں ہیں نہ خادم با ادب اور ہر ویراں عمارت کا ہی حال اندوہناک
اب یہی قصرِ معلےٰ اُلّو ہی کا شانہ ہے

اب نہ درباں ہیں نہ حاجب ہیں نہ حاضر چوبدار جس کا جی چاہے چلا آئے یہاں بے بیم باک
اب یہاں رکھا ہی کیا ہی ہر طرف ویرانہ ہے

اس بلندی پر یہ پستی کیا خدا کی شان ہے شب کو تھا لطفِ گلستاں صبح سے اُڑتی ہے خاک
آج آئے کل چلے دنیا مسافر خانہ ہے

خلق کو حاصل تھی جن سے نعمت خوانِ جلیل آج ہیں وہ فاتحہ کے واسطے محتاج کاک
اعتبارِ دہر کیا بازیچۂ طفلانہ ہے

تیغ شاہِ کامراں مٹی میں زنگ آلود ہے دولت و جاہ و حشم سے ہو گیا ہے انفکاک
موت سے مغلوب جوشِ ہمتِ مردانہ ہے

بزمِ عشرت جائے عبرت ہے مگر بے فائدہ فکرِ دنیا میں بشر کو کس قدر ہے انہماک
کہہ رہی ہی موت ہنسکر آدمی دیوانہ ہے

شذرات

مولد رسول عربی، مکہ معظمہ کا ایک دور وہ تھا کہ یہ شہر اور سارا عربستان مرکز نظر اور مخدوم جہانیاں بنا ہوا تھا۔ علوم ظاہری سے بڑھ کر علوم باطنی کی سوتیں یہاں سے بہ نکلکر سارے عالم کو سیراب کر رہی تھیں یہ بھی ایک زمانہ ہے کہ علمی اداروں کو قائم کرنے کی اس سرزمین پاک میں پوری سکت نہیں شہر کے بڑے مدرسہ فخریہ کے عمارت مدرسہ کی تعمیر کے واسطے سرمایہ کی فراہمی کے لئے مہتمم نے کئی اپلیں شایع کیں لیکن ابھی تک اس قدر سرمایہ فراہم نہیں ہوا کہ مدرسہ کی عمارت اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو سکے ایک تازہ اپیل ابھی ابھی ہمارے پاس پہنچی ہے عام مسلمان خصوصاً ارباب مقدرت اگر اس مبارک سعی میں ہاتھ بٹائیں تو رفع مشکلات کی توقع ہو سکتی ہے۔

حیدرآباد دکن کی علمی اور پبلک فضا کی سرگرمیوں میں ایک مزید اضافہ "صبح دکن" کی صورت میں نمودار ہوا ہے یہ روزانہ اخبار اپنی ظاہری نظر کشی اور باطنی دلچسپی دونوں لحاظ سے ملک میں ابھی سے مقبول بن رہا ہے اس کے صحت بخش طریق کار پر نظر کرنے سے ملک اور ملت کی خدمت کے صحیح ذوق کا پتہ چلتا ہے ہم اس کی درازی عمر اور پھلنے پھولنے کی دعا کرتے ہوئے اس فریضہ کو یاد دلائے بغیر بھی نہیں رہ سکتے جو ہم پر اس کی مدد کا ہے۔

سلسلہ مطبوعات مکتبۂ ابراہیمیہ میں ایک قابل قدر اضافہ گزشتہ ماہ میں ہوا ہے یہ "ارباب نثر اردو" کی اشاعت ہے جس کا ہم اس سے پہلے اجمالی طور پر ذکر کر چکے ہیں۔ اردو زبان خصوصاً اردو نثر کے ان محسن بزرگوں کا یہ ایک بسیط تحقیقی اور تنقیدی تذکرہ ہے جنھوں نے ڈاکٹر جان بارتھ وک گل کرسٹ کی راہنمائی اور فورٹ ولیم کے کالج میں موجودہ نثر کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ بیس سے زیادہ مصنفین کے حالات نہایت تحقیق سے فراہم کیئے گئے ہیں ان کی تصنیفات کا مطالعہ بھی جس محنت اور کاوش کے ساتھ کیا گیا ہے بے حد قابل تحسین ہے جناب سید محمد صاحب قادری ام اے انجمن کے ایک سرگرم رکن اور رسالے کے پر جوش معاون ہیں آپ کی اس قابل قدر تصنیف پر ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اس دفعہ ہم ملک کے ایک مشہور جاگیردار راے تیجرائے صاحب آنجہانی کا عکس رسالہ کے ساتھ شایع کر رہے ہیں آپ ملک کے ذی اقتدار عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ ملکی، قومی اور علمی خدمات کی انجام دہی میں بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ا

بلدہ مکتبہ

رائے تیج رائے صاحب آنجہانی پہلی دے ۱۲۸۱ف کو حیدرآباد دکن (چار کمان) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزہ میں اور اعلیٰ تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی جہاں ملک کے اعلیٰ عہدہ دار وں کے فرزند تعلیم پاتے ہیں بعد میں آپ نے حیدرآباد سیول سروس کلاس کی تعلیم بھی حاصل کی نواب سر آسمانجاہ بہادر (سابق وزیر اعظم ریاست ابد پائدار حیدرآباد) نے رائے صاحب موصوف کے والد کے انتقال کے بعد سے ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اور سول سروس کلاس کی تکمیل تعلیم کے ساتھ ہی اپنی پائگاہ میں کمینت فوج اور مہتمم خزانۂ متفرقات و توشک خانہ کی خدمت سے سرفراز فرمایا۔ سرکار عالی میں نظم جمعیت کے سررشتہ دار بھی تھے نواب صاحب کے انتقال کے بعد حسب فرمان خسروی ۱۳۲۰ف آپ اس پائگاہ کی اہم خدمت میر مجلسی سے سرفراز ہوئے آپ کا انتقال ۱۳؍امرداد ۱۳۳۴ف کو ہوا۔

سرکاری خدمات کے علاوہ آپ نے ملک اور قوم کی خدمات بھی انجام دیں۔ قومی انجمنوں تعلیمی درسگاہوں وغیرہ کے قیام میں نواب محسن الملک اور نواب مشتاق حسین وقار الملک اور دوسرے مشاہیر قوم کے ساتھ آپ نے بھی حصہ لیا۔ مدرسہ مفید الانام (اعتبار چوک) کے اراکین نے آپ کی قومی خدمات کے مدنظر آپ کو صدر دوامی (لائف پریزیڈنٹ) مقرر کیا تھا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ علمی مشاغل میں بھی صرف کیا کرتے تھے آپ کا مفید علمی کارنامہ "صحیفہ آسمانجاہی" علوم و فنون کے سرپرست نواب سر آسمانجاہ بہادر کی بسیط سوانح عمری کی صورت میں ہمارے پاس مطبوعہ موجود ہے اس کے متعلق نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے اچھی رائیں لکھی ہیں۔

"صحیفہ آسمانجاہی" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں تمام خاندانی واقعات اور اعزازات کی تفصیل ہے۔ حصہ دوم میں ولایت کے سفر کے واقعات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں افسوس ہے یہ کتاب اب کم یاب ہوگئی ہے ہم موصوف کے نواسے رائے گرو داس صاحب (جنھوں نے "جیون چرتر" کے نام سے آپ کی ایک سوانح عمری مرتب کی ہے اور جس کا ایک نسخہ ہمارے پاس بھی بغرض ریویو روانہ کیا ہے) کو اس امر کی طرف خاص طور سے متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اس قیمتی کتاب کو دوبارہ چھپوا کر شائع کریں۔

"جیون چرتر" پر آئندہ رسالے میں تنقید لکھی جائیگی۔ ہم رائے گرو داس صاحب کے مشکور ہیں کہ آپ نے اپنی مہربانی سے رائے صاحب کا بلاک ہمیں شائع کرنے کا موقع عنایت کیا۔

راے تیجراے آنجہانی میر مجلس پائگاہ
آسمانجاہی

اور مصنف ''صحیفہ آسمانجاہی''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتخاب واقعات

از ہنری پائنکیرے

مترجمہ جناب محمد انتصار الدین صاحب بی۔اے

سائنٹیفک مواد کی زیادتی، محدود حلقوں میں خصوصی بننے کی روز افزوں خواہش، اور وقت کی کمی سائنس داں کو سے باز رکھتی ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر اپنے جادۂ مستقیم سے کافی دور جا پڑتا ہے۔ اس کی تلافی محض فلسفۂ سائنس کی ترتیب و ترقی پر منحصر ہے۔ بقول پائنکیرے (POINCARE) اگر سائنس داں کی عمر لامتناہی ہوتی تو صرف "دیکھیں، دیکھو رہیں" کہنا کافی ہو جاتا، مگر اس کے پاس اتنا وقت کہاں؟ تو پھر اس لاپروائی کے دیکھنے سے نہ دیکھنا بہتر ہے، اس لئے اس کو واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

برٹ ریانڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) جولس ہنری پائنکیرے (۱۸۵۴ء۔ ۱۹۱۲) کو اپنے عصر کا سب سے بڑا فلسفی سائنس داں سمجھتا ہے۔ پائنکیرے نیانسی (NANCY) میں پیدا ہوا، ۱۸۸۶ء سے پیرس یونیورسٹی کا پروفیسر مقرر ہوا، اس نے ریاضیات، سماوی علم الحرکت، اور طبیعیاتی ریاضیات میں اضافے کئے۔ اس کو ۱۹۰۱ء میں رائل سوسائٹی لندن سے سلوسٹر (SYLVESTER) کا تمغہ عطا کیا گیا۔

اس نے سائنس، ریاضی اور ان کے فلسفہ پر کئی کتابیں لکھی ہیں، یہ چند تحریریں اس کی جامعیت، وسعتِ نظر اور صفائی بیان کی شاہد ہیں۔

(REVNEDE METAPHYSIQUE ET DE MORALE) کے صرف (۱۳۰) صفحات اس کی چار مخصوص شخصیتوں ــ فلسفی، ریاضی داں، ہیئت داں، طبیعی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ذیل کا مختصر مضمون فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں آجانے کے بعد بھی مصنف کی شان کا کافی ترجمان ہے۔ (انتصار)

ٹالسٹائی اپنی کسی تحریر میں "سائنس بغرض سائنس" کو ایک خیال باطل قرار دیتا ہے۔ واقعات لامتناہی ہیں پھر انسانی دماغ میں ان کے تمام تر علم کی گنجائش کہاں؟ بس اسی لئے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے۔ انتخاب ہو تو کیا وہ محض ہمارے وہمی تجسس کا نتیجہ ہو؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ افادہ کی روشنی میں چلے، ہماری عملی ضروریات کا ممد اور اخلاقی واجبات کا معاون ہو؟ کیا اس ہمارے پر بسنے والے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے اعداد و شمار کی دریافت سے کوئی بہتر مشغلہ ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکتا؟

یہ تو ظاہر ہے کہ اس نے لفظ افادہ کے وہ معنی نہیں لئے جو اہل معاملہ کی اصطلاح میں لئے جاتے ہیں۔ اسے سائنس کے صنعتی استعمال کی کچھ پروا نہیں، متعجبات برق اور کرشمات علم حرکت اخلاقی میدان میں سنگ بجا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اس کے مذہب میں مفید وہ ہے جو آدمی کو انسان بنادے۔

اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ میں اپنی حد تک ان دونوں مطمح نظر سے مطمئن نہیں ہو سکتا، نہ تو مجھ کو پراز آز محدود حکومت دولت کی خواہش ہے، اور نہ اس انتہائی نیک مگر مردہ آزادی کی، جہاں دوسرا گال انتہائی معصومیت سے پیش کیا جا رہا ہو، اور جس دیس کے بسنے والوں کی آنکھیں تجسس کی بصارت سے معرا ہوں، جو بے اعتدالیوں سے بے بہرہ بے مرض موت کا جام بے لذت پیتے ہوں۔ لیکن یہ سب اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہے، میں اس پر یہاں کچھ بحث کرنا نہیں چاہتا۔

بہر کیف اصلی سوال کچھ اور ہے جس پر ہم کو اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارا انتخاب نتیجہ ہو ہمارے وہم کا یا مبنی ہو ہمارے ذاتی افادہ پر تو "سائنس بغرض سائنس" ایک خیال باطل سے بڑھکر نہیں ہوگا، لہذا فرعی طور پر خود سائنس کا وجود خیالی ہوگا۔ کیا واقعی اس کا وجود خیالی ہے؟ .... بلا تعرض یہ کہنا پڑتا ہے کہ انتخاب واقعات نہایت ضروری ہے۔ ہماری کوشش چاہے کیسی ہی پیہم اور وسیع ہوں واقعات ہمیشہ ہم سے بڑھ جاتے ہیں سائنٹسٹ صرف ایک کی تحقیق میں ہو تو اس کے جسم کے ہر مکعب انچ سے ہزاروں اور لاکھوں واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ فطرت کو سائنس میں سمانے کی کوشش کل کو جز میں دبانا ہے۔

سائنٹسٹ کا انتخاب واقعات میں کامل ایقان ہے۔ اور ان واقعات سے مناسب انتخاب ہو سکتا ہے وہ اپنے دعاوی میں درست ہیں ورنہ سائنس کوئی چیز نہ ہوگی۔ مگر سائنس کا حقیقی وجود ہے۔ کوئی چشم بصیرت وا کرے اور مشقت کی کامرانی اور محنت کی کامیابی کو دیکھے جس نے صدہا شہسواران میدان عمل کو مالامال کر دیا، اور جو کبھی بھی جلوہ افروز نہ ہوتی اگر صرف عملی آدمیوں کا ہی وجود ہوتا جن سے پہلے بد مذاق بیوقوف ہستیوں نے حالت افلاس و غربت میں آخری سانس نہ لیا ہو۔

بقول ماش (MACH) ان بیوقوفوں نے اپنے متاخرین کو سوچنے کی تکلیف سے بچا دیا۔

اگر وہ فوری عمل پر اُتر آنے تو کچھ بھی نہ چھوڑنے، پھر نئے احتیاجات کے ساتھ ساتھ سب کو از سرِ نو لوٹانا پڑتا بنی آدم کی ایک کثیر تعداد غور و فکر کی تکلیف برداشت کرنا نہیں چاہتی، اور شاید یہ بہتر بھی ہے، کیونکہ ان کے رہبر جذبات ہوتے ہیں، اور اکثر و بیشتر اچھوتی ذہنیت کے رہنما دلائل و براہین سے بہتر جذبات ہی ہوتے ہیں، کم از کم اُس وقت جبکہ وہ کسی فوری اور حقیقی نتیجہ کے طالب ہوں لیکن جذبات عامیانہ کہلائیں گے اگر غور و تفکر کی راہ مستقیم پر نہ لگا دیے جائیں، بلکہ انسان کا اس قدر بھی ساتھ نہ دے سکیں گے جس قدر کہ مور و مگس کا دیتے ہیں۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ان کی طرف سے خود غور و فکر کریں۔ جو اس کی پروا نہیں کرتے، اور چونکہ ایسے لوگ بعید ہیں اس لئے ہمارا خیال زیادہ سے زیادہ حالات میں کار آمد اور مفید ہونا چاہیئے۔ اسی وجہ سے عام ترین قانون بہتر ہوتا ہے۔

یہ اصول ہمیں انتخاب واقعات کا طریقہ بتاتا ہے۔ دلچسپ ترین واقعات وہ ہیں جو اکثر استعمال کئے جا سکیں ہاں، وہ جن میں تواتر کی لچک ہو۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ اس قسم کے واقعات سے بھری دنیا میں منقوش کئے گئے۔ فرض کرو کہ ہمارے پاس بجائے اسّی کیمیائی عناصر کے اسّی ملین (آٹھ کروڑ) ہوتے، اور اُن میں بجائے کچھ عام اور کچھ کمیاب ہونیکے سب مساوی ہوتے، تب ہر نیا ٹکڑا جو ہمارے ہاتھ لگتا ایک بالکل نامعلوم شئے سے مرکب ہوتا، جو ہمارے معلوم کردہ ٹکڑوں کے خواص اس نئے کے خواص پر کچھ بھی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ ہر نئی شئے کی جناب میں ہماری حیثیت ایک نومولود بچے کی ہوتی، اسی معصوم کی طرح ہمیں بھی اپنے اوہام اور ضروریات کا شکار بننا پڑتا۔ ایسی دنیا میں سائنس نہ ہوتی، شاید خیالات بھی نہ ہوتے، حتیٰ کہ زندگی بھی ناممکن ہوتی، کیونکہ اس جگہ ارتقا بھی خود استقامتی کے جذبات کو ترتیب نہیں دے سکتا۔ بفضل خدا ایسا نہیں ہے، لیکن اس عنایت ایزدی کی قدر، مثل اور صدہا عنایات کے جس کے ہم عادی ہو گئے ہیں، حقیقی معنوں میں نہیں کیجاتی ہے۔ عالمِ حیاتیات، پریشان ہو جاتا اگر صرف افراد ہی ہوتے اور اقسام کا پتہ نہ ہوتا، اور اگر اولاد کو والدین سے مشابہت ذرا اتنا نہ ملتی۔

پھر کون سے واقعات تواتر کی لچک رکھتے ہیں؟

سب سے پہلے سادہ واقعات۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک مخلوط واقعہ میں کئی اتفاقی حالات مل جاتے ہیں، اور اس کا پھر دوبارہ وقوع پذیر ہونا موہوم ہوتا ہے۔ کہیں سادہ واقعات کا وجود بھی ہے؟ اگر ہے تو یہ ہماری گرفتِ فہم میں کیسے آسکتے ہیں! کون کہہ سکتا ہے کہ جن کو ہم بزعم خود سادہ واقعات سمجھ رہے ہیں لامتناہی اختلاط کے حامل نہیں! زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اُن واقعات پر جو ہمیں پہلی نظر میں غیر متشابہ

عناصر سے مرکب نظر آئینگے۔ ایسے واقعات کو ترجیح دینی چاہیے جو صاف طور پر سادہ نظر آرہے ہیں پھر تو یہی دو شکلیں رہجاتی ہیں یا تو یہ سادگی حقیقی ہے یا ان کے عناصر اس قدر مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے تمائز نہیں ہو سکتے پہلی صورت میں اس کا امکان ہے کہ ہم اس سادہ واقعے سے پھر دوبارہ اس کی پوری سادگی میں دو چار ہوں یا اس کو کسی دوسرے مخلوط واقعہ کے جزو ترکیبی کی شان میں دیکھیں۔ دوسری صورت کی سادگی میں تو تواتر کا اور بھی زیادہ امکان ہے۔ زمانہ ترکیب واقعات کا عادی ہے گر تجزی واقعات سے بالکل ناآشنا۔

ایک سرنفلاک گر مترتب اور منتظم عمارت کی تعمیر میں مختلف عناصر حسب فکر ترتیب دیئے جاسکتے ہیں الحاصل مخلوط واقعات کے دوبارہ وقوع پذیر ہونے کا بہت کم امکان ہے۔ اس کے برخلاف سادہ واقعات سے مترتب متجانس آمیزہ بار بار لوٹایا جائے گا۔ لہٰذا واقعات جو بظاہر سادہ نظر آتے ہیں چاہے وہ در پردہ کچھ ہی ہوں نہایت سہولت سے دوبارہ ظہور پذیر ہوں گے۔

یہی وہ چیز ہے جو ایک سائنٹسٹ کو اپنے ضمیر کے احکام پر عمل پیرا ہونے میں حق بجانب قرار دیتی ہے اس کی اس سے بہتر تعبیر اس طرح ہو سکتی ہے کہ متواتر وقوع پذیر ہونے والے واقعات ہمیں سادہ اس لئے نظر آتے ہیں کہ ہم ان سے کافی مانوس ہو چکے ہیں۔

لیکن سادہ واقعہ کہاں ہے؟ سائنٹسٹ نے اس کو دو انتہاؤں میں پایا۔ لاانتہا اعظم میں اور لاانتہا اقل میں۔ ہیئت داں نے اس کو پالیا کیونکہ ستاروں کے فاصلے بےحد بڑے ہیں، اس قدر کہ ان میں سے ہر ایک، ایک نقطہ محض نظر آتا ہے جس سے وصفی فرق معدوم ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ نقطہ ایک ابعاد رکھنے والے جسم سے بےحد سادہ اور منفرد ہے۔ اس کے برخلاف ماہر طبیعیات نے اس شان سادگی کو ایک خیالی تقسیم کے نتیجہ۔ لاانتہا چھوٹے جوہر۔ میں ملاحظہ کیا۔ اسی طرح عالم حیاتیات ایک سادہ خانہ کو پورے جسم سے زیادہ دلچسپ پکار اٹھا، ہاں، وہ اس میں حق بجانب بھی ہے کیونکہ اس کی نظر میں یہ سادہ خانے آپس میں زیادہ تر مشابہ رکھتے ہیں بہ نسبت ان جسموں کے جن کے یہ محض اجزائے ترکیبی ہیں۔ لیکن عمرانی ایک نہایت ہی پریشان کن اور متزلزل مقام پر کھڑا ہے۔ عناصر یعنی بنی آدم جس سے وہ بحث کرتا ہے۔ بےحد غیر مشابہ، بےحد متغیر، بےحد وہمی، مختصراً بےحد مخلوط ہیں۔ اور تاریخ خود کو نہیں دہراتی! پھر وہ دلچسپ واقعہ کو کیسے منتخب کرے؟ واقعہ جو پھر وقوع پذیر ہو۔ بس تو ٹھیک انتخاب واقعات کا طریقہ مطلوب ہو اس لئے ہماری پوری توجہ اس طریقہ کی دریافت پر مبذول ہونی چاہیئے۔ کئی اصول تراشے گئے کیونکہ کسی نے بھی "بلا تردید کسے"، کی شان نہ دکھائی

* SOLIOLOCIST عمرانی

تقریباً ہر ایک عمرانی مقالہ نے ایک نئے اصول کی تحریک کی جس کو خود اس کے مصنف نے احتیاطاً استعمال نہیں کیا، تاکہ عمرانیات ہمیشہ ایک ایسا علم رہے جس کے بعد تو اصول ہوں مگر نتیجے صفر سے کم۔

پس ہمیں منضبط واقعات سے ابتدا کرنی چاہیئے، لیکن جونہی کوئی مستحکم اصول بن جائے جس کی صحت میں شک وشبہ کی بالکل گنجائش نہ ہو، واقعات جو اس سے پورا پورا انطباق رکھتے ہیں اپنی دلچسپی زائل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ ہمیں کوئی نیا سبق نہیں دیسکتے پھر تو استثنا ہی کی کچھ اہمیت باقی رہی۔ اب ہم تشابہ کو نہیں ڈھونڈتے بلکہ تلاش فرق کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ ان فرقوں میں بھی اُس پر نظر جم جاتی ہے جو نمایاں ہو، صرف اس لئے نہیں کہ وہ نمایاں ہے بلکہ اس کی سبق آموز صفت ہم کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ اس کی بہترین توجیہ ایک مثال سے ہو جائیگی۔ فرض کرو کہ ہم چند نقاط لیکر ایک منحنی کو مرتسم کرنا چاہتے ہیں کوئی عملی شخص جو کسی فوری افادہ کا متلاشی ہو محض اُن نقاط پر نظر رکھے گا جن سے وہ کوئی مخصوص مقصد و ابسطہ رکھتا ہو۔ یہ نقاط بہت بے ترتیبی سے پورے منحنی پر بکھرے ہوں گے۔ کہیں زیادہ اور کہیں کم جس کی وجہ سے ان کو ایک مسلسل خط کے ذریعہ نہیں ملایا جاسکے گا اور نہ اُن سے کوئی اور فائدہ بظاہر نظر آئیگا۔ سائنٹسٹ کا رویہ کچھ اور ہوگا، وہ نقطوں کو مشاہدہ کے لئے باضابطہ منقسم کریگا اور جونہی وہ ان میں چند کو سمجھ لیگا ان کو ایک مسلسل خط سے ملا دے گا۔ اسی طرح وہ منحنی کو مکمل کرسکیگا۔ مگر ہاں کس طریقہ سے؟ اگر وہ منحنی کی ایک حد پر نقطہ لگالے تو پھر وہاں نہیں ٹھیریگا بلکہ دوسری حد پر سرک جائیگا۔ ان دونوں حدود کے بعد وسطی نقطہ اس کے لئے دلچسپی پیدا کریگا وقس علی ہذا۔ لہذا جب اصول بنجائے تو ہمیں سب سے پہلے اُن صورتوں کی تلاش کرنی چاہیئے جہاں یہ اصول کچھ کام نہ دیسکے۔ ہیئتی واقعات اور ارضی تحقیقات کی دلچسپی کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔ مکان وزمان کے طولانی سفر طے کرنے پر ہم اپنے معمولی اُصولوں کو بالکل بے بنیاد اور ناکام پاسکتے ہیں، اور یہی وہ ناکامیاں ہیں جو ہمیں وسعت نظر اور بہتر قدرت تفکر عنایت کرتی ہیں جس سے ہم اُن چھوٹے چھوٹے تغیرات کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں جو اس عنصری دنیا کے گوشہ گوشہ میں آئے دن وقوع پذیر ہو رہے ہیں جن میں ہم کو اٹھنے بیٹھنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ ہم اس گوشۂ دنیا سے بخوبی واقف ہوتے ہیں تو محض اُنھیں سفر سے جو ہم دور دراز ممالک میں کرتے ہیں۔ جن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔

لیکن ہمارا مقصد محض تشابہ اور تناقص ہی کو معلوم کرنا نہیں ہے بلکہ ظاہری تناقص کے پوشیدہ پردوں میں تشاکل کی تلاش ہے۔ اُصول بظاہر ایک دوسرے کے متناقص نظر آتے ہیں لیکن تھوڑے سے غور کے بعد ہم عام طور پر اُن میں تشابہ ہی پاتے ہیں۔ گو ظاہری صورت میں فرق ہو حقیقت میں ایک ہیئت رکھتے ہیں جب ہم اُن پر اس نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ان کو سوائے ایک وسعتِ لامتناہی اور شانِ وحدت کے

کچھ اور نہیں پاتے۔ اس طریقہ سے اُن واقعات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے جو کسی چیز کی بناوٹ میں شریک ہو کر اس کو مکمل کریں اور اس کو دوسرے مکمل اجسام کا حقیقی مشابہ بنا دیں۔

میں اس موضوع پر کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ یہ چند الفاظ یہ بتانے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ سائنٹسٹ اپنے مشاہدہ سے واقعات کا انتخاب یونہی سرسری نہیں کرتا۔ وہ بقول ٹالسٹائی، خوبصورت پرندوں کو شمار نہیں کرتا کیونکہ ان کی تعداد میں وہی تغیر ہو رہا ہے وہ اپنے وسیع تجربوں اور نتیجوں کو ایک چھوٹی سی جلد میں دبا دینا چاہتا ہے اسی لئے طبیعات کی ایک چھوٹی کتاب میں صدہا تجرباتِ ماضیہ اور ہزارہا ممکنہ تجربات کے نتائج جو قبل از قبل معلوم ہو گئے ہیں، محفوظ ہوتے ہیں۔

لیکن اب تک ہم نے سوال کے صرف ایک حصے پر غور کیا ہے۔ سائنٹسٹ فطرت کا مطالعہ اس لئے نہیں کرتا کہ اس سے اس کو کچھ فائدہ پہنچیگا۔ وہ اس کا مطالعہ کرتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اس میں ایک خاص انبساط محسوس کرتا ہے اور وہ اس سے مسرور ہوتا ہے صرف اس لئے کہ وہ خوبصورت ہے۔ اگر فطرت حسین نہ ہوتی تو وہ قابلِ مشاہدہ بھی نہ ہوتی، اور زندگی زندگی کہ ناقابل ہوتی۔ بہ حسن فطرت سے میری مراد وہ حسن ظاہری نہیں ہے جو حواس کو متاثر کرتی ہے، یہ تو صرف شکل و صورت کا حسن ہوا میں اس سے نفرت تو ہرگز نہیں کرتا مگر ساتھ ہی اس کا سائنس سے کچھ واسطہ نہیں۔ میری مراد اس حسن حقیقی سے ہے جو اس کے اندرونی نظامِ حصص کا نتیجہ ہے اور جس کو ایک ستھرا ذہن گرفت میں لاسکتا ہے یہی ہے جو اس خیالی حسن کو ایک ڈھانچہ عنایت کرتا ہے جو ہمارے حواس کو متاثر کرتا ہے اور جس ڈھانچے کے بغیر وہ محض ایک لامحدود موہومی حسن ہوتا اس کے برخلاف ذہنی حسن کچھ حقیقت رکھتا ہے، اسی کی تلاش میں سائنٹسٹ دن اور رات آنکھوں میں کاٹ دیتا ہے اُس کو اس کے مقابلے میں بنی آدم کے مستقبل کی کچھ پروا نہیں۔

ایک مصور صرف اُن خط و خال کا انتخاب کرتا ہے جن کی مدد سے وہ تصویر میں حقیقی جان ڈال سکے، اسی طرح ہم کو بھی صرف اس خاص حسن کی تلاش ہے کہ جس کی روشنی میں ہم بہترین واقعات کا انتخاب کر سکیں اور جس سے اس عالم کے نظام کی بہترین توجیہ ہو سکے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جذبات سائنٹسٹ کو تلاشِ صداقت کے صراطِ مستقیم سے ہٹا دیتے ہیں ہم ایک منتظم نظامِ عالم کا خواب دیکھتے ہیں مگر یہ حقیقی دنیا سے کس قدر پست ہے۔ بہترین صناعانِ عالم۔ یونانیوں نے اپنا ایک آسمان ہی علٰحدہ بنا لیا تھا، مگر حقیقی سما کے مقابل اس کی کیا حقیقت تھی؟

سادگی اور وسعت کس قدر پیاری چیزیں ہیں! اسی وجہ سے ہم سادہ اور وسیع واقعہ کو ترجیح دیتے ہیں کبھی ستاروں کے لامتناہی فاصلوں سے بحث کرتے ہیں تو کبھی ہم خوردبین سے انتہائی چھوٹی چیزوں کے

مشاہدہ میں مزہ آتا ہے، اور کبھی ہم اپنے کو ارضی قرون کے انتہائی تجدد وفصل میں پاتے ہیں صرف اس لئے کہ اس میں بھی ایک لامتناہی وسعت نظر آتی ہے۔

بس ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کو حسن کی تلاش اسی انتخاب پر پہنچاتی ہے جس پر کہ افادہ کی ہوس نے گھسیٹا تھا بقول ماش[1] اختصار خیال اور اختصار عمل، جن کا سائنٹسٹ ہمیشہ متمنی اور متلاشی رہتا ہے، مفید ہونے کے ساتھ ساتھ منبع حسن و انبساط ہیں۔ ہمیں صرف ایسی عمارتیں پسند آتی ہیں جن میں معمار نے ذرائع اور نتائج کے تناسب کو برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ ستون باربردار ہوں مگر تکلف کے قطعی مظہر نہ ہوں۔ ارچ تھیم کے ستون اس کی بہترین مثال ہیں۔

اس تنظیم کا اخراج کہاں سے ہو رہا ہے؟ کیا ہم یقین کر لیں کہ حسین اشیاء وہ ہیں جن کو ہمارا ذہن موزونیت سے اپنے میں سما سکتا ہے اور پھر جن کے بجا استعمال پر قدرت رکھتا ہے؟ یا اس تنظیم کو نتیجہ سمجھیں ارتقائے عالم اور فطری انتخاب کا؟ کیا وہ اقوام جنھوں نے اپنے مفاد پر نظر جمائے کارزار عمل میں قدم رکھا۔ اس مسئلہ کو بخوبی سمجھ چکی تھیں۔ سب نے بغیر اندیشۂ مآل کئے اپنے منتہا کی تلاش میں سرگردانی کی، جس کا نتیجہ چند کی بربادی تھی تو صدہا کی کامیابی ہمیں اس پر یقین بھی کرنا پڑتا ہے کیونکہ کبھی یونانیوں نے وحشیوں پر فتح پائی تھی تو اب یورپ، جو یونان کا ذہنیت میں بجا وارث کہلا سکتا ہے، کل دنیا پر مسلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحشی نوبت و نقارے کی گونج اور شوخ رنگوں کے دلدادہ تھے جو ان کے حواس کو متاثر کر سکتے تھے، اس کے برخلاف یونانی محسوس پردوں میں چھپے ہوئے ذہنی حسن کے عاشق تھے۔ یہی وہ حسن ہے جو ذہن کو تیقن اور تقویت عطا کرتا ہے۔

بلاشبہ ٹالسٹائی اس فتح پر چیں بجبیں ہو جائیگا اور اس کو کسی طرح بھی مفید ماننے پر تیار نہ ہوگا۔ لیکن یہی بے لوث جستجوئے صداقت، صداقت کی خاطر۔ آدمی کو انسان بنانے کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے۔ میں اس سے بخوبی واقف ہوں کہ اس میں ناکامیاں بھی ہیں، اور بعض وقت مفکر کو وہ سکون قلب حاصل نہیں ہوتا جس کا وہ مستحق ہے اور بعض سائنٹسٹ بجائے مطمئن ہونے کے غیر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

تو پھر کیا ہمیں سائنس کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے، اور اخلاقیات کے درس شروع کر دینے چاہئیں! کیا کوئی ایک لمحہ کے لئے بھی فرض کر سکتا ہے کہ خود اخلاقیین کا مقام منبر سے اتر جانے کے بعد لعن و طعن کی فضا سے بالاتر ہو جائے گا!

---

[1] (MACH) [2] آرچ تھیم ایتھنز کا ایک مندر ہے جس کے ستون حسین عورتوں کے مجسموں کی شکل میں ہیں جن کی وجہ سے مشہور ہیں

یورپ میں ادبی نشاتِ ثانیہ
اور
اردو کی ترقی

از جناب حمید اللہ صاحب بی اے

تمہید یورپی زبانوں میں ایک لفظ (RENAISSANCE) ہے جس کے لفظی معنے تو "نشاناتِ ثانیہ" یا "پیدائش جدید" ہیں لیکن اصطلاحاً اس سے ایک تحریکِ احیاءِ علوم مراد لی جاتی ہے جو اٹلی سے شروع ہو کر جرمنی، فرانس اور انگلستان وغیرہ پہنچی اور اس کی وجہ سے ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی مسیحی میں ادب، مصوری، تعمیرات، وغیرہ فنون لطیفہ میں انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔ سچ پوچھیے تو یہ "جدید تمدن" کے اثرات ہی کا دوسرا نام ہے۔ وہ کسی خاص ملک اور زمانے سے مخصوص نہیں۔ ہر نیا تمدن جب قدیم تمدن پر غالب آتا ہے تو ہمیشہ نتیجہ یہی ہوتا ہے اور اب بھی یہی ہوا۔

ادبی نشاتِ ثانیہ کے سمجھنے کے لئے تمدنی ترقی کا کم از کم ایک سرسری خاکہ پیش نظر رہنا چاہیے ہماری ضرورت کے مطابق یہاں اس کا اعادہ مناسب نہ ہوگا۔

یورپی تمدن کی ابتداء مصری، یونانی، ہندی، ایرانی، رومی اور عظیم الشان عربی تمدن کی عمارتوں کے انحطاط کے بعد قدرتی طور پر آن ہیں [۱]۔ کھنڈرات پر یورپی تمدن کی عمارتیں کھڑی ہوئیں جس کا آغاز ۱۵ ویں صدی یا اس سے کچھ پہلے سمجھنا چاہیے۔ اس سے پہلے کا زمانہ اصلاحی

---

[۱] میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں ضمیروں کے ساتھ لفظ ہیں جو لاحق ہوتا ہے وہ دو طرح کا ہے اولاً ہیں (یاء معروف سے) جو "ہی" کی جمع ہے اور فاعلی ضمیروں کے بعد ہوتا ہے جیسے انہیں نے تمہیں نے ہمیں نے۔ اس آخر کی ہ محذوف ہو گئی ہے۔ دوسرے ہیں (یاء مجہول سے) بمعنی کو جیسے انھیں دیا، تمہیں دیا، کنھیں دیا، ہمیں دیا۔ اس آخری کی بھی ہ گر گئی ہے۔ جدید اصول رسم الخط کی رعایت کرتے پہلی صورت میں ہیں کو اس کے واحد ہی کی طرح ضمیر جمع سے الگ لکھنا چاہیئے یعنی ان ہیں نے، تم ہیں نے، ہم ہیں نے، اسی طرح یہاں واحد ضمیر سے ان ہی نے، تم ہی نے وغیرہ لکھنا غلط ہوگا اور جیسے کسے مجھے تجھے اسے کی رعایت سے آخری صورت کی ہیں کو جو کو کے معنی میں ہے ضمیر سے ملا کر (بقیہ بر صفحہ [illegible])

الفاظ میں قرونِ متوسطہ یا جاہلیتِ یورپ کہلاتا ہے۔

یورپی تمدن یا دوسرے الفاظ میں جدید تمدن کے اسباب و اثرات کو واضح کرنے کے لئے قرونِ متوسطہ (MIDDLE AGES.) پر مختصر روشنی ڈالنی مفید ہوگی۔

قرونِ متوسطہ

عظیم الشان رجحانات کے زمانے کا نام ہے (اور ذیل کے مواد کا ماخذ پروفیسر سید عبد اللطیف کا لکچر ہے جو تاریخ ادب انگریزی کے سلسلے میں دیا گیا تھا) اس وقت کلیسا کا اقتدار ہمہ گیر تھا؛ نام نہاد روحانی زندگی کے مفاد کی خاطر بے حد انتہا پسندی برتی جاتی تھی؛ علمی تحقیقات میں حوصلہ شکن رکاوٹ ڈالی جاتی تھی؛ مذہبی اور فلسفی امور میں آزادانہ بحث مباحثے اور تفتیش سے باز رکھا جاتا تھا؛ جسم انسانی کے مطالعے اور تشریح کی ممانعت کی جاتی تھی؛ فنی اور ہر قسم کے حسن کاری کی قدر کرنے سے روکا جاتا تھا۔ اس وقت "ہیروئیت" پھیلی ہوئی تھی اور اسے "رومان کا زمانہ" کہتے ہیں مگر اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ دلکش، مسرت بخش اور خوشنما زمانہ بھی تھا؛ ایسا سمجھنا حقیقت کے برخلاف ہوگا۔ رومانیت صرف شاعروں کی پیدا کردہ ہے جس کا عوام کی زندگی میں وجود ہی نہ تھا امرا اور مخصوص و شاذ مستثنیات سے ہمیں بحث نہیں۔ کلیسا کی ایک اور ہی حالت تھی؛ "حسن ایک پھندا بتایا جاتا تھا اور مسرت گناہ" قرونِ متوسطہ میں جو تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور "مسرت، زندگی اور نور" کا جو فقدان تھا اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادب کی حالت کتنی قابلِ رحم اور کیسی زار تھی۔

نشأۃ ثانیہ کے اسباب

پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب چارلس ہشتم نے نیپلز پر چڑھائی کی تو نتیجۃً فرانس، جرمنی اور اسپین کو اٹلی میں دخل دینے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا اور اس وقت جزیرہ نمائے اٹلی سے فائدہ اٹھانے کے لئے یورپ کی بڑی بڑی قوموں میں مقابلہ و مسابقہ ہونے لگا۔ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ جاہل فرانسیسی اور جرمن وغیرہ اطالوی تمدن سے جسے اطالویوں نے تکمیل کو پہنچایا تھا کیوں متاثر ہونے لگے۔

اس موقع پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اٹلی کا تمدن کیونکر مکمل ہوا تھا۔ اس کے جواب میں فی الحال اتنی بات یاد رکھنی کافی ہے کہ عربی تمدن اسپین اور سسلی (صقلیہ) دونوں جگہ صدیوں سایہ فگن رہا۔ اسپین والوں نے اسے اپنے ملک سے امکان بھر خارج کر دیا۔ لیکن اٹلی نے اسے قبول کر کے ترمیم و تبدیلی کی اور اپنے مذاق کے مطابق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۔۔۔) ہی لکھنا چاہیے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ واوِ معروف اور یاءِ معروف پر (ُ / ِ) دیئے جائیں اور مجہول پر (َ)

؎ اس کا بڑا حصہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا عنوان "رینے سانس" اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف کے لکچر سے ماخوذ ہے اور طب اور شہری [illegible] کا بیان گبن کی تاریخ زوالِ روما سے لیا گیا ہے۔

ڈھال لیا ہے۔

اِس جملہ معترضہ کے بعد اسی سلسلۂ اسباب میں یہ بھی بیان کر دینا چاہیئے کہ ارآسمس اور لیوتھر کی مذہبی تجدید و اصلاح سے اِس وقت پاپائیت کی گرفت نوجوان یورپ پر سے ڈھیلی ہی نہیں بلکہ ہٹ چکی تھی اور پروٹسٹنٹ مذہب بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس کے بعد "مذہب اور سیاست" کو عملاً الگ کر دیا گیا۔ حالانکہ قرون متوسط میں تاج و دین کا ساتھ رکھتے تھے اور مذہب ہی کی لوگوں کے اعتقادات و اعمال پر حکومت تھی۔

یورپ میں جاگیرداری مملکت (FEUDAL STATE.) کا کمزور ہونا اور شہری مملکتوں (CITY STATES.) کا قائم ہونا بھی بہت اہم معاملہ ہے۔ چونکہ ہر شہری مملکت خود تشریعی و تنفیذی (LEGISLATIVE & EXECUTIVE) اختیارات رکھتی تھی اور عربوں کی طرح ان کے حاکم بھی علماء کی سرپرستی کرنے اور بڑے بڑے انعام دیکر ان کی مالی مدد کرنے میں سخت مسابقت کرنے لگے تھے اس طرح تہذیب کی آبیاری کے خواہشمندوں کو ہر جگہ قابل لحاظ سہولتیں حاصل ہونے لگیں۔

یہاں چند اور اسباب بیان کئے جائیں گے جو بظاہر ادب سے غیر متعلق ہیں۔ لیکن ان کا اثر ادبیات پر کچھ کم نہیں ہوا۔

۱۰۹۶ء سے جو صلیبی معرکہ آرائیاں صدیوں تک یورپیوں اور مسلمانوں میں ہوتی رہیں وہ بھی یورپی ترقی میں بہت اہم درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ ساتوں محاربوں میں تقریباً ناکامی، لاکھوں نفوس کی ہلاکت، کروڑوں روپیوں کی بربادی اور سب سے بڑھکے ایک غیر قوم (مسلمانوں) سے اختلاط سے یورپ نے بہت سے مفید سبق سیکھے۔ وہ تعصب سے جو برگشتہ ہونے لگے تو مذہب ہی سے بے نیاز ہو گئے۔ انھوں نے کاغذ سازی اور دیگر صنعتیں یورپ میں درآمد کیں وہ مسلمانوں کی فتحمندی اور اپنی ناکامی کے اصلی راز پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ فوجی اصلاح و تنظیم کرنی چاہیئے۔ اس سے بعد میں نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے۔

صلیبی جنگوں کی وجہ سے بنکوں کی ضرورت ہوئی اور بڑی بڑی شہری مملکتوں میں ان کا قیام عمل میں آیا۔ اور یہ بنک بہت جلد معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے۔

۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر ترکی قبضہ ہونے سے یورپی قومیں مشرق و مغرب کے اہم تجارتی راستوں اور منڈیوں سے محروم ہو گئیں۔ اس گرفت سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں جب قطب نما یورپ کے ہاتھ لگا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کولمبس نے امریکا کی وسیع سرزمین کا یورپ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پھیلنے اور بسنے کے لئے نشان و پتہ دیدیا اور واسکوڈیگاما نے کسی نہ کسی طرح ہند کا بحری راستہ براہ راس امید (CAPE OF GOOD HOPE) دریافت کر لیا پھر انھوں نے دور دراز ممالک سے تجارت شروع کی اور جگہ جگہ

اپنی منڈیاں قائم کیں اور بالراست و بلا واسطہ تجارت ہونے سے نفع بھی خوب کمانے لگے اور عربوں کی طرح اس سے سیاسی فائدے اٹھائے اور مختلف ممالک فتح کئے۔ بارود کے حصول ہی سے گویا یورپ کی حکومت عالم کی ابتدا ہوئی لہٰذا اسے بھی انہیں اسباب میں شامل سمجھنا چاہیے۔

لیکن سب سے اہم امر جس کا یورپی مصنف عمداً تجاہل عارفانہ سے کام لیکر تذکرہ ہی نہیں کرتے وہ آٹھ صدی کی اندلسی اسلامی حکومت تھی جس کی جامعات قرطبہ و غرناطہ وغیرہ میں ہزاروں طالب علم ہر خطۂ یورپ سے جمع ہوتے تھے اور اس خوانِ نعمت و چشمۂ فیض سے متمتع ہو کر اپنے تاریک وطنوں کو علم کے قمقموں سے روشن کرتے تھے۔ اسپین کے علاوہ صقلیہ (سسلی) کی اسلامی حکومت سے بھی یورپ نے اٹلی کے توسط سے بہت فائدہ اٹھایا۔ بقول گبن کے عربوں نے طب میں تشریح اجسام، نباتات اور کیمیا کو مخلوط کر کے صحتِ انسانی پر جو احسان کیا وہ تاریخ تمدن میں ہمیشہ ایک یادگار کارنامہ سمجھا جائیگا۔ عربوں کے یورپ میں علوم تجربیہ (EXACT SCIENCES) کے رواج دینے، علم ہیئت و سائنس وغیرہ کو نجومیوں اور ہوسوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر معزز و مفید علوم بنانے، اور حساب، ہندسہ، تاریخ وغیرہ علوم کو ترقی دینے کے علاوہ (جنھیں عربوں کے عظیم تعمیری اضافے کی وجہ سے عربی علوم کہنا بے جا نہیں) عربوں کا یونانی فلسفے کو محفوظ رکھنا یورپ کی نشاتِ ثانیہ میں اس قدر اہم درجہ رکھتا ہے کہ اس کا تذکرہ نہ کرنا احسان فراموشی اور واقعات کی پردہ پوشی کے سوا کیا سمجھا جائے۔ لیبان، سدیو، وغیرہ کے اعتراف کے علاوہ اسلامی فنونِ لطیفہ پر فرانسیسی میں ایک دو جلدی کتاب میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتب خانہ آصفیہ میں فنون لطیفہ کے تحت ہے۔ اس کے دیباچے اور خاتمے میں مصنفوں نے (کیونکہ ہر حصہ الگ الگ مصنف کا لکھا ہوا ہے) اسلامی تعمیرات، مصوری، دیواروں کی رنگائی زر بفت و شجر سازی (TISSUET TAPISSERIE) منقش ظروف کی تیاری اور سنگ تراشی کے اثرات پر جو یورپ پر ہوئے۔ دلچسپ بحث کی ہے۔

سب سے آخر فرانس و انگلستان وغیرہ میں طاقتور حکومتوں کے قیام سے امن و امان کا دور دورہ ہو جاتا ہے جس سے اندرونی سکون و طمانیت کے باعث علمی و ادبی ترقی کے دروازے کھل گئے اور صنعت و تجارت کی بڑی گرم بازاری ہونے لگی۔ اور فارغ البال دماغوں نے اپنی تمام فطری قوتوں کو ایجاد و اختراع اور انکشاف کی جانب مائل کر دیا۔

اثراتِ تحریک[1]

رفتہ رفتہ علمی ذوق بڑھنے لگا، یونانی و لاطینی علمی کتابوں کی ہر طرف تلاش ہونے لگی اور تعلیم کا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ کاغذ جس کو یورپ نے صلیبی جنگوں کے سلسلے میں بنانا سیکھا تھا علوم و فنون کے احیا کا زبردست آلہ بنا پھر بعد میں جب طباعت کی ایجاد ہوئی تو اسے عالمگیر اہمیت

---

[1] یہ حصہ بی بنیادی تاریخ پروفیسر ڈاکٹر سید عبد اللطیف کے لکچر سے مدد لیکر لکھی گئی ہے۔

حاصل ہو گئی۔

جب تحصیل علم کا شوق پھیلا، کتابیں کم خواہشمند زیادہ ہوئے، اور یونانی علوم اور علماء خال خال نظر آئے تو علماء کی خاص قدر اور وقعت ہونے لگی۔ ان کو دور دور سے بڑے بڑے مشاہرے دیکر بلایا جانے لگا خصوصاً ۱۴۵۳ء میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ تو بہت سے یونانی علماء اٹلی ہجرت کر گئے جہاں کی زمین عربی بارشوں کے باعث اب اس جدید زراعت کے قابل ہو چکی تھی جیسا کہ گبن نے لکھا ہے۔ اٹلی کے بعد دوسرے یورپی ممالک میں بھی یونانی زبان اور فلسفے کا احیاء شروع ہوا۔ آثار قدیمہ کی محبت بھی اس موقع پر پیدا ہوئی قلمی نوشتوں کے تلاش و حصول میں ہر شخص منہمک تھا اور یونانی و رومی صنمیات یا دیومالا (MYTHOLOGY) سے خاص دلچسپی لی جا رہی تھی۔ اس وقت ترجمے، تصانیف اور تالیفات، بجائے مردہ لاطینی کے ملکی زبانوں میں ہونے لگے۔ جس سے علوم و فنون عوام کی دسترس میں آگئے۔ لاطینی میں عربی کے جو ترجمے ہوئے تھے وہ صدی ڈیڑھ صدی تک متداول رہے پھر ہر دماغ نے اپنی مادری زبان میں جولانیاں دکھانی شروع کیں۔ اور خود جدید تحقیقات اور اضافے کرنے لگا۔ اس طرح روز بروز ملکی زبانیں علوم و فنون سے مالا مال ہونے لگیں اور ادب کے ہر شعبے میں انتہائی ترقیاں ہوئیں۔

ہر شہر میں ایک عام مجلس مطالعہ علمیہ (اسٹڈی یا اکاڈیمی آف یونیورسٹی) قائم کی گئی اور حالات کے لحاظ سے مختلف صورتوں میں ادب کی تعلیم کے لئے تعلیم گاہیں قائم کی گئیں۔ ایک اکاڈیمی کے حالات بطور مثال پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس میں طالب علم مناسب اقامت خانوں میں رہتے تھے اور ہر روز استاد کا لکچر سننے کے لئے جمع ہوتے تھے وہاں ادبیاتِ عالیہ (CLASSICS) پر بحث کی جاتی تھی۔ ان طلباء نے بہترین ادبی تخلیقات کا بڑا حصہ زبانی یاد کر لیا تھا؛ وہ ترجمے کی مشق کرتے تھے اور نظم و نثر میں اپنے خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں ابتداہی سے تنقید، طرز بیان پر لحاظ، مقابلہ و موازنہ، اور قرن قرن کے فرق کا مطالعہ کرایا جاتا تھا اور ساتھ ہی انہیں جسمانی ورزش کرائی جاتی تھی اور کھیل کود ان کی تعلیم کا ایک جزء قرار دیا گیا تھا۔[له]

انفرادیت بھی نشاتِ ثانیہ کی خاص نشانی ہے۔ ہر شخص اپنی ضمیر کا مالک اور اپنے اعتقادات میں سند ہونے کا دعویٰ کرنے لگا یہی حال بمجموعہ ہائے افراد یعنی اقوام کا بھی ہوا اور ہر قوم اپنا طبلہ آپ بجانے پر مصر ہو گئی جمالیات یا حسن پسندی (AESTHETICISM,OR,LOVE,OF,BEAUTY) اور حظیات یا سرور پسندی (SENSUALISM,OR,LOVE,OF,PLEASURE) کے متعلق بھی نقطۂ خیال میں تبدیلی ہو گئی اور ہر شخص زندگی پر لطف طور سے بسر کرنے اور قرون متوسطہ کے تقوے

له انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا عنوان "رنیسانس"

کہ "دنیا برائی کا گھر ہے" ایک خیال باطل سمجھنے کی جانب مائل ہو گیا اور یقین کرنے لگا کہ "زندگی زندہ دلی اور مسرت اندوزی کا نام ہے" یہاں تک کہ پوپ لیو دہم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے معراج تقدس (پاپائیت) کو پہنچ گیا تو اس نے کہا۔ "جب خدا نے ہمیں یہ چیز دی ہے تو ہمیں اس سے لطف اندوز ہونا چاہیئے"

جب طباعت عام ہو گئی تو ادبیات عالیہ کا جو ذخیرہ اس وقت تک ممنوعا کیا جا چکا تھا چھپنے لگا۔ رفتہ رفتہ تحصیل علم بھی ایک فیشن بنگیا۔ چنانچہ اٹلی میں شریف آدمی کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کم از کم ابتدائی حد تک علوم وفنون سے واقف (JACK, OF. ALL.) ہو، صحیح زبان میں گفتگو کر سکے؛ با محاورہ تقریر و تحریر پر قادر ہو؛ حسن فنی کا شیدا ہو؛ سمجھ کے ساتھ اثریات (ARCHAEOLOGY) سے دلچسپی رکھتا ہو کسی راہب کی بجائے کسی قدیم ہیرو کی تقلید کرنے اور اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتا ہو؛ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے آپ کو جسمانی ورزش میں بھی ماہر ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اور اخلاقی مروت و مراعات کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا جو ہیروئی عہد[1] (THE, AGE, OF, CHEVALRY.) کی گویا یادگار تھا۔

اسلام کی روز افزوں وسعت سے گھبرا کر یونانی اور رومی عیسائیوں نے اپنے اصولی اختلافات کے باوجود فلارنس میں ۱۴۳۸ء میں ایک مشاورہ (کانفرنس) منعقد کیا تھا جس کا مقصد اسلام کی مزاحمت کی تدبیریں سوچنا تھا۔ اگرچہ مشاورے کو اپنے حقیقی مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن یونانیوں کی ملاقات سے اطالوی بہت متاثر ہوئے۔ اور یہ شہ پاکر وہ ان کے علم و فضل کو دیکھ کر یونانی زبان اور فلسفے سے واقف ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ چند بڑے بڑے علماء (مثلاً بسےریون (BASSARION) وغیرہ) کو اٹلی مدعو کیا گیا؛ اس طرح ادبیات عالیہ کے مطالعے کا ایک عام شغف پھیل گیا اور یونانی کے ساتھ ہی ساتھ لاطینی ادبیات عالی کی تصنیفوں کی طرف اس قومی تحریک کے سلسلے میں جواب پیدا ہو رہی تھی۔ بڑی توجہ کی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا ہر طرف ادبیات عالیہ کو بندرانے (TO. APE.) اور ان کی طرز پر لکھنے کا اندھا دھند خیال پھیل گیا۔ چنانچہ بہت سی بحریں اور طرز نظم لکھنے کے لئے پیدا ہو گئے۔ اور ان قدیم مشکل اور تنگ طریقوں کو

---

[1] "CHEVAL" فرنچ میں گھوڑے کو کہتے ہیں اسی وجہ سے عربی میں شولری کا ترجمہ "فروسیت" کیا گیا ہے مگر میرے خیال میں اس کا بہتر ترجمہ ہیروئی عہد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عہد میں گھوڑا خاص شان رکھتا تھا مگر نائٹوں (KNIGHTS.) کا منشا مظلوم کی مدد کرنا ہوتا تھا۔ اور فرائض انسانیت کا ادا کرنا مقصود ہوتا تھا اس لئے یہ مفہوم "فروسی عہد" سے بہت زیادہ "ہیروئی عہد" سے سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ عموماً نائٹوں کو جان جوکھوں میں ڈالے بغیر کامیابی نہیں ہوتی تھی ۱۲۔

(ہمارے یہاں اس کی جگہ "دور شہامت" عام طور سے مستعمل ہوتا ہے۔ "مکتبہ")

ترک کر دیا گیا جو قرونِ متوسطہ میں عالمگیر تھے۔ اگرچہ ایک افسوسناک بات اس سلسلے میں ابتداءً یہ ہوئی کہ علماء نے اپنے علم و فضل کو اپنے ذریعہ اظہار خیال پر اثر انداز کر دیا اور بالکل قدیم وضع میں نقلیں لکھنے کی خواہش میں اکثر وہ اپنی زبان کے خاؤ اور اپنی قوت کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہے اور ان کی پوری کوشش اور مسلمہ قابلیت کے باوجود ان کا عمل اکتا دینے والا ثابت ہوا اور محض لچر پوچ اور ٹھوس کی جگہ ٹھونسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ادب عالی ان کے ابتدائی انکشافات سے اس شدت کے ساتھ ان کے سامنے آیا کہ ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور ان کے قدم ڈگمگا گئے اور ظاہریت کے بند رانے میں اس کی باطنی اور حقیقی روح کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہ گئے۔ تاہم تھوڑے عرصہ میں سکون اور اعتدال پیدا ہونے لگا اور ایک ردِ عمل کے بعد وہ آخر کار خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کرنے لگے اور ان کا ادب خوبیوں سے مالا مال ہونے لگا۔

غرض وہ ایک تغیر و آمیزش، اور تجربے و تیاری کا زمانہ تھا۔ قدیم ادبیاتِ عالیہ کے دوبارہ ملنے سے داغی اور روحانی آزادی کے خواہشمندوں کا اعتماد اپنی ذاتی قوتوں پر پختہ ہو گیا اور مذہب و رسوم کے فرق کے باوجود، تاریخ کی یکسانیت اور فطرتِ انسانی کی غیر متبدل پذیری کی عظیم حقیقتوں پر انہیں آگاہی ہو گئی۔ ادب، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کے شہ کارے ان کے جذبات کو ابھارنے اور ان کی ذہنیت کو سدھارنے کا باعث ہوئے۔ تنقید کی حوصلہ افزائی ہوئی جس کو تاریخ میں داخل کرنے سے وہ قومی روایات کا ایک مجموعہ رہنے کی بجائے ایک عالمگیر اہمیت رکھنے والا فن بن گیا۔ مذہب و سائنس کوئی بھی آزاد تنقیدوں اور بحثوں کے حملے سے بچ نہ سکے اور انفرادیت سب جگہ اپنے گل کھلانے لگی۔ نئے نئے الفاظ نئی نئی اصطلاحیں بڑی کثرت سے گھڑی جانے لگیں حتیٰ کہ ایک سخت تنقید عالم وجود میں نہ آتی تو نااہل لوگ اس مفید اور ضروری چیز سے بُرا فائدہ اٹھاتے جو ادبیات کے حق میں سراسر مضر ہوتا۔ اور یہی تنقیدی مذاق، الفاظ کے تنازع للبقا میں مناسب ترین الفاظ کو بچانے اور بڑھانے کا باعث ہوا۔

اس زمانے میں "HUMANISM" یعنی مروّت یا انسانیت کے یہ معنی لئے جاتے تھے کہ اپنے آپ کی ایک آزاد ہستی کے مناسبِ حال تنظیم کریں نہ کہ پاپائی خرافات میں مقید رہیں۔ اس کے ساتھ ہی آزاد خیالی پیدا ہوئی، تفحص و رازجوئی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ جس نے یورپ کے بہترین دماغوں کو ان تحقیقی جسارتوں پر آمادہ کر دیا جس کا مدرسے کے استادوں کو حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا اور وہ جسارتیں بہت جلد عالمگیر اہمیت کا موجب ہو گئیں۔ ان کے بعد سائنس کے ہر شعبے میں حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ فلسفہ، تشریح اجسام اور دوسرے علوم و فنون کا نہ صرف حصول و تعلم بلکہ ان میں غور و خوض اور تحقیقات عام ہو گئیں۔ اس کے

سوا جامعاتی تعلیم وجود میں آئی۔ جہاں ملک بھر کے لائق و فائق لوگ آئندہ نسلوں کی بہبودی اور ترقی کے کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی کیونکہ قدما کے نمونے ان کے سامنے نہ تھے کہ ان کی ذہنیت وہیں محدود ہو جاتی۔ ادبیات کے مطالعہ کے سلسلے میں بے شبہ انہیں قدما کے فنونِ لطیفہ کا علم ہوا لیکن ان کے عملی کارنامے (WORKS) ان کے سامنے نہ ہونے سے ہر دماغ نے اس میں جولانیاں دکھائیں اور وہ قدما پر بھی فوقیت لے گئے۔

یہ نہ خیال کیا جائے کہ یورپ نشاتِ ثانیہ سے پہلے قرونِ متوسطہ میں بالکل مردہ تھا اور نہ ہی یہ گمان کیا جائے کہ قرونِ متوسطہ سے بالکل ہی بے تعلق ہو کر یورپ نے ایک نیا جنم لیا۔ بلکہ ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نشاتِ ثانیہ قرونِ متوسطہ کی آخری کڑی تھی اور زمانۂ قدیم کے طبع زاد اور اصلی خیالات میں ادبیاتِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کی وجہ سے ترقی ہو کر دنیا کا موجودہ تمدن ظہور پذیر ہوا۔ یا دوسرے الفاظ میں نشاتِ ثانیہ صبحِ کاذب تھی اور اس کے بعد ایک ردِ عمل ہو کر یورپ میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ مگر تاریک ترین ساعت کے بعد جس طرح صبحِ صادق پیدا ہوتی ہے، ردِ عمل میں سکون پیدا ہو کر ایک معتدل مگر یقینی ترقی شروع ہوئی۔ اور افقِ یورپ میں ادبی ترقی کی صبحِ صادق نکل آئی۔ مختصر یہ کہ ع "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کے لازمی امر میں یورپیوں نے تخریب کی بجائے تعمیری طرزِ عمل اختیار کیا اور قدیم عمارتوں پر ہی نئی اضافے کر کے ان کو آسمان تک پہنچا دیا۔
یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یورپ نے ترقی خود ہی کسی مدد کے بغیر کی اور نہ ہی یہ کہنا صحیح ہے کہ انہیں سب کچھ تیار ملا اور خود انھوں نے کوئی بڑا کارنامہ پیش نہیں کیا۔ ہرگز نہیں۔ وہ گزشتہ تمدنوں کی بنائی ہوئی عمارتوں پر قبضہ کر کے ان پر اضافہ کرنے لگے۔ اور ان میں اپنی پسند کے مطابق تعمیر و ترمیم کرنی شروع کی۔ جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کا ردِ عمل ہو کر یورپی تمدن محض دنیاوی تمدن رہ گیا۔ جس میں روحانیت معدوم تھی اور توقع کی جانی چاہیے کہ آخر کار فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ کا معتدل اور متوسط مسلک تمدنِ انسانی کا آخری ارتقا ہوگا۔

(۲)

اوپر گزری ہوئی تفصیل کے دیکھنے کے بعد ناظرین کے دل میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوگا کہ آیا یہی باتیں ان کی مادری زبان (اُردو) کو بھی پیش آئی ہیں یا آ رہی ہیں!
مجھے اقرار ہے کہ اُردو میری مادری زبان ہونے یا مجھے اس سے محبت اور اس کی ترقی سے دلچسپی رہنے کے سوا مجھے اس سوال کے جواب دینے کا کوئی حق نہیں۔
میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ یورپی نشاتِ ثانیہ کے ساتھ وہاں کی ملکی زبانوں میں بھی ترقی شروع

ہو گئی۔ اور چونکہ یورپ نے ایک ملک کی جگہ ایک برِ اعظم بننا پسند کیا اس لئے کوئی ایک یورپی زبان وجود میں نہیں آئی اور فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، اطالوی، روسی، اسپینی وغیرہ وغیرہ زبانوں نے انفرادی کوشش سے علمی زبانوں کی حیثیت حاصل کی۔ اور ہر ملک میں جس بات میں خاص ترقی ہوئی وہاں کے ادب و زبان پر بھی لا محالہ اس کا اثر پڑا۔ اور ملکی ادبیات میں اسی بات کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔

فلسفۂ مساوات انسانی کا یورپ ابھی ایشیا سے درس لے رہا ہے تاہم اس ہونہار شاگرد نے ابھی سے اس کا تاثر یوں ظاہر کیا ہے کہ ایک مجلس الاقوام امنِ عالم اور وحدتِ اقوام کے لئے بنادی ہے اور ایک بین الاقوامی زبان "اسپرانٹو" رائج کی ہے تاکہ اختلافِ السنہ سے اخوتِ انسانی کا مقدس فرض پامال نہ ہوتا رہے گو یہ بھی ابتدائی حالت میں ہیں اور ان سے کچھ اور ہی فائدے اٹھائے جا رہے ہیں تاہم ان کے بلند مطمح (IDEAL) کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کسی بات میں ایک برِ اعظم سے کم نہیں۔ یہاں بھی سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر خطۂ ملک کی ترقی کا اثر وہاں کی زبان کو بھی ترقی دلائے بغیر نہیں رہا۔ مثال کے طور پر بنگالی کا نام لینا کافی ہے۔

چونکہ ہند ایشیا ہی کا ایک حصہ ہے اس لئے اسے وہ درس جو یورپ چار پانچ صدی کا نصاب ختم کرنے کے بعد لے رہا ہے، چالیس پچاس برس ہی کی تعلیم کے بعد پڑھایا جانے لگا ہے۔ اور اب وہ "وحدت ہندیاں" کے نغمے سے مست ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اسے وحدتِ آدمیاں کا سبق دیا جائے گا۔ ہند نہ صرف اب وحدت اور سوراج کا خواہشمند ہے بلکہ اس کی کوششیں ملک میں ایک مشترک زبان کے ظہور پذیر کرنے کے لئے بھی پوری تیزی سے جاری ہیں اور اب ایک خاص زبان (اردو) ایک تہائی آبادی کی زبان ہو چکی ہے۔ گو یہ ہوا کیونکر ہے۔

مجھے اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اردو (یا جو بھی اس کا نام ہو) ایک نو عمر زبان ہے اور اس کا پودا ان تارکِ وطن عربوں نے لگایا۔ جو جزیرہ نمائے دکن کے مشرقی و مغربی ساحل پر آباد ہوئے کوکنی زبان اب بھی اس کی یادگار باقی ہے اور میرے خیال میں برج بھاشا یا ملتانی زبان کی بجائے اردو کی ابتدا اسی کوکنی زبان سے ہوئی ہے۔ اس نظریئے پر انشاء اللہ ہم کبھی آئندہ تفصیل سے نظر ڈالیں گے۔ دکھنی نوآبادکاروں کے بعد اسلامی حکومت اور افغانستان کی راہ سے آنے والی فارسی قوموں نے اس پودے کو سینچا بڑھایا۔ اور بالآخر مغل حکومت کی سہ صد سالہ سایہ فگنی میں وہ تناور درخت ہو گیا مگر انگریزی حکومت نے اسے یک بیک بازار سے اٹھا کر حکومت کے مسند اور دفتر میں لا بٹھایا۔ اب علوم و

سلہ۔ اگر یہ خبر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ایک اہم زیرِ بحث مسئلہ کا خاتمہ ہو جائیگا امید ہے کہ مضمون نگار صاحب جلد از جلد اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ مکتبہ

فنون اس میں پڑھنے لگے گو اس سے بہت پہلے کی تصنیفیں ملتی ہیں مگر ہندوستانیوں کا فارسی کو چھوڑ کر اردو کو مادری اور علمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کرنا یقیناً برطانوی عہد کا واقعہ ہے چاہے اس کی وجہ سیاسی مصالح ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔

بدقسمتی سے یہ صحیح ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں جب انگریزی تعلیم یافتہ بکثرت ہو گئے تو اردو کو سرکاری اور دفتری کاروبار سے علٰحدہ کر دیا گیا اور ہر جگہ حکمرانوں کی زبان حکمرانی کرنے لگی۔ ورنہ کبھی کی یہ قومی زبان بن جاتی اور کلکتے کی تالیف و ترجمہ کی کوشش جاری رہتی تو یورپ کی علمی زبانوں کا مقابلہ کرتی۔ گر جو پودا لگا یا گیا تھا دفتر سے خارج ہونے پر صرف اس کی شاخیں کٹیں۔ تنے کو جڑیں برابر سرسبز کرتی رہیں اور یہ ان استادان علم و ادب کا خانگی اور انفرادی کارنامہ تھا جن کا عمل ہی حال حال تک اردو کا علمی ذخیرہ سمجھا جاتا تھا اور ان میں دہلی۔ لکھنو اور مدراس کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ مدراس اب تک اُردو ادبیات میں بالکل ہی نظر انداز رہتا تھا مگر انصاف تو یہ ہے کہ دکن میں اُردو کو علمی زبان بنانے کی کوشش وہیں سے شروع ہوئی۔ مولانا باقر آگاہ (سنہ ۱۲۲۰ھ) پہلے دکنی سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ اور منتظم طور پر اردو میں علوم و فنون منتقل کرنے شروع کئے۔[۱] یہاں ایک بات خاص طور سے یاد رکھنی چاہیے جس سے بعد میں نہایت اہم اثرات مترتب ہوئے۔ وہ یہ کہ ابتدا میں جب برطانوی ہند کا دفتر اردو میں ہو گیا تو سالار جنگ اعظم نے سلطنتِ حیدرآباد میں بھی دفتر اردو دیا جو اس وقت تک فارسی میں تھا لیکن پھر جب غیر حیدرآباد کے دفتر انگریزی میں کر دیئے گئے تو اس سے حیدرآباد متاثر نہیں ہوا بلکہ دفتر حکومت اردو ہی میں رہا۔

زینہ بہ زینہ ترقی بتانا تو ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے۔ البتہ مختصر طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں عام قومی بیداری کے سلسلے میں ملکی زبانوں پر توجہ ہونے لگی اور جنگِ عظیم کے بعد جب سوراج کیلئے جد و جہد تیز تر ہو گئی تو ایک عام قومی زبان کی ضرورت بیش از بیش محسوس کی جانے لگی اور انتہائی کوشش سے اُردو کو پھیلایا جانے لگا احسان فراموشی ہو گی اگر پنجاب اور خاص کر لاہور کی امداد کا تذکرہ نہایت احسان مندی سے نہ کیا جائے اِس کے سوا دار المصنفین، انجمن ترقی اُردو وغیرہ وغیرہ کا مختلف اہم علوم و فنون پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں شائع کر کے علیگڈھ کی مرحوم سائنٹفک سوسائٹی کے کام کو مکمل کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا کہ اُردو میں علمی زبان بننے کی پوری قابلیت ہے، اس سلسلۂ اسباب کی اہم کڑی ہے۔

ہندوستان میں جب انگریزی تعلیم عام ہونے لگی تو فارغ التحصیل لوگوں کی کچھ عرصہ تک سرکاری ملازمتوں میں

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے " باقر آگاہ " از مولوی مرتضٰی مرحوم۔ اُردو کے بنانے میں مدراس کے حصے پر بہت کچھ مواد جمع ہو چکا ہے انشاء اللہ بہت جلد مکمل ہو جائیگا۔

خاصی کھپت ہوتی رہی لیکن تابکے۔ بہت سے دماغ تحریری کام بھی انگریزی میں کرنے لگے۔ لیکن جلدی ہی انھوں نے دیکھ لیا کہ انگریز اُن کی تقریر و تحریر کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور ادھر چند گنتی کے لوگوں کے سوا کروڑوں ہم وطن اس کے سیدھے اُلٹے کی بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ اس بات سے بھی تعلیم یافتہ لوگوں کے اپنی مادری زبان کی طرف متوجہ ہونے میں خاصہ اثر ہوا۔ جرائد و مجلات الگ مفید کام کرنے لگے۔ گو اس ردِّ عمل کی شدت سے اب عام طور پر مصلحۃً انگریز تسلیم کرنے لگے ہیں کہ "بہت سے ہندوستانی دنیا کے انگریزی نگاروں کی صفِ اوّل میں جگہ رکھتے ہیں" یا "ہندوستانیوں کو غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا عجیب غیر معمولی ملکہ ہے" اور "ہندوستانیوں کو جب یہ کمال حاصل ہے تو اس کو یوں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیئے" وغیرہ۔ غرض ان کو طرح طرح سے لبھایا جا رہا ہے کہ کسی طرح انگریزی ہند میں بھی ویسی ہی ہو جائے جیسی آسٹریلیا کنیڈا وغیرہ میں اور اس کے ذرائع تبلیغ انگریزی اخبارات و رسائل، کالج کے انگریز پروفیسر، دیسی حکام کے انگریز دوست و بالعکس بعض غلامانہ ذہنیت والے ہندوستانی سب ہی ہیں مگر یقین ہے کہ یہ فرسودہ پھندا شیر ہند کو پھانسنے رکھنے والا نہیں۔ جملۂ معترضہ معاف۔

اوپر بیان کی ہوئی باتوں کے علاوہ اردو کی کایا پلیٹ کا سب سے اہم سبب، اس کے انقلاب کا سب سے بڑا باعث اور اس کو ایک علمی زبان بنانے کے سلسلے میں سب سے موثر ذریعہ کچھ اور ہی تھا۔

میں نے اوپر سرسری تذکرہ کیا ہے کہ اردو حیدرآباد میں سرکاری زبان ہونے کے بعد سے اب تک مروج ہے۔ خدا اس ملک کو شر و فتنے سے بچائے، جب وہاں ہر شعبے میں ترقی ہونے لگی تو تعلیمات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ سالار جنگ اعظم ہی کے زمانے سے ایک نظامِ یونیورسٹی کا اسکیم سرکار کے پیش نظر تھا اور بار بار ملک کی جانب سے اردو یونیورسٹی کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ جب دارالعلوم مرحوم کو جامعۂ پنجاب نے اپنے شعبۂ شرقی سے ملحق بنائے رکھنے سے انکار کر دیا تو اس توہین سے ارباب صیغۂ تعلیمات کو ایک مزید تازیانہ لگا۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی فدائیانہ سرگرمیوں سے راستہ صاف ہو گیا۔ اور بالآخر جامعۂ عثمانیہ کے موسس جناب حیدری صاحب (حال ڈاکٹر حیدر نواز جنگ بہادر) نے اپنے کارنامۂ ملازمت میں زرین نہیں جڑاؤ حروف میں یہ واقعہ درج کرا دیا کہ ان ہی کی عرضداشت پر آصف سابع کی تخت نشینی کی یادگار میں ایک جامعہ قائم ہوئی جس میں ابتدا سے انتہا تک ہر علم و فن کا ذریعۂ تعلیم سرکاری اور ملکی زبان یعنی اردو رہے گی۔ اور ہندوستان کی تمام جامعات کے برخلاف انگریزی اس میں ذریعۂ تعلیم کی بجائے ایک ثانوی لازمی زبان قرار دی جائے گی۔

یہ ایک مشکل کام تھا مگر مدبرانہ نہیں ہمدرد دل حکومت نظام بہشت پناہ تھی اور یہ کام جو اردو کی سابقہ

رفتار ترقی سے شاید قرنوں میں بھی پورا نہ ہوتا۔ چند سال میں تکمیل کو پہنچ گیا۔ یعنی ہر علم و فن کی درسی کتابیں ترجمہ یا تالیف کے ذریعے اُردو میں مہیا کر لی گئیں اور اس کام کے لئے لاکھوں کے صرفہ سے ایک قابل اسٹاف ہندوستان کے ہر گوشہ سے اکٹھا کر لیا گیا۔ پہلے کالج کے افتتاح تک اُردو میں درس دینے کے قابل ہر علم و فن کے ماہر اساتذہ رشک قرطبہ و بغداد حیدرآباد میں جمع ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں سیکڑوں طیلسانی میدانِ عمل میں بھیج دیئے گئے۔ انھوں نے جو کچھ کیا یا کر رہے ہیں قریب ہے کہ زمانہ اس سے واقف ہو جائے۔

اس دوران میں ہند بہت سے انقلابات کا منظر رہا۔ اور ہندو مسلم مناقشات سے اُردو کی ترقی میں ہمت شکن اور حوصلہ فرسا رکاوٹیں پیدا ہو گئیں اور اُردو بجائے قومی کے مسلمانی زبان قرار دی جانے لگی اور اس کی رقابت کے لئے ہندی کو لا کھڑا کیا گیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ امر دل خوش کن تھا کہ جامعہ ملیہ جو علی گڈھ میں پیدا ہوئی کچھ عرصہ بعد سیاسی جھگڑوں سے پیچھا چھڑا کر دہلی کو ترکِ وطن کر گئی۔ اس میں بھی ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا گیا اس کے مجسم ایثار اور فنافی العلم بانی ان سہولتوں سے کام لے کر جو برطانوی ہند میں میسر ہیں تعلیم کے قومیانے (NATIONALIZING) کے سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کا خوب ہاتھ بٹانے لگے جیسا کہ قاعدہ ہے اچھے نتائج دیکھتے ہی ہوا کا رُخ بدلنے لگا اور وہی لوگ جو کل تک اُردو کو علوم و فنون سے خالی اور ذریعہ تعلیم بننے کے نا قابل کہتے تھے، اسی غریب اُردو کی تعریف کے پل باندھنے لگے کہ "اس میں شروع ہی سے علمی زبان ہونے کی صلاحیت تھی"۔ "اس میں غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنانے کی بڑی قابلیت ہے" وغیرہ۔ ممتحنوں نے ریمارک کرنا شروع کیا کہ لڑکے مادری زبان میں تعلیم پانے سے معلوم ہوتا ہے کہ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور جو کچھ جواب دیتے ہیں اس میں مبادیات پر حاوی ہونے کا ثبوت ملتا اور جودت طبع کا اظہار ہوتا ہے۔

ادھر یہ ہو رہا تھا۔ اُدھر ملک کے خیر خواہ لیڈروں نے کہنا شروع کیا۔ اُردو ہندی ایک ہی ہیں آپس میں جھگڑا فضول ہے۔ رسم الخط کے سوا اگر کوئی فرق محسوس ہوتا ہے تو صرف یہی کہ ہندی میں سنسکرت اور اُردو میں عربی۔ فارسی الفاظ زیادہ برتے جاتے ہیں۔ اول تو یہ صحیح نہیں کیونکہ صاحب "فرہنگ آصفیہ" کی تحقیقات کے بموجب اُردو میں عربی۔ فارسی۔ الفاظ اور ہندی الفاظ کا تناسب اب بھی ایک اور دس کا ہے تاہم یہ قرار پایا کہ اُردو داں عربی۔ فارسی الفاظ کم کر کے مناسب ہندی الفاظ زیادہ استعمال کریں اور ہندی مضمون نگار عربی۔ فارسی الفاظ سے اچھوت نہ برتیں۔ میرے خیال میں اس کا بہتر ذریعہ

اُردو اور ہندی کے ملاپ کا ذریعہ یہ ہے کہ اُردو رسم الخط کے رسائل میں ہندی مضامین اُردو

رسم الخط میں خاصی تعداد میں شائع کئے جائیں۔ اور ہندی رسم الخط میں اردو تحریرات درج ہوں اور مشکل معنے بطور فٹ نوٹ لکھ دیئے جایا کریں تو رفتہ رفتہ مجلات بین طبقے کے لئے اُردو ہندی دو الگ الگ زبانیں نہیں رہیں گی۔ اور اس طرح اس کے عام اور ہمہ گیر کرنے میں بڑی مدد ملیگی۔ رسم الخط کے متعلق اس وقت تو اتنا ہی کافی ہے کہ طلباء کو دونوں رسم الخط سکھائے جائیں اور دونوں جاری رہنے دیے جائیں جیسے جامعہ علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ میں ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح یورپ میں جلدی ہی لاطینی کے ذریعے تعلیم ہونے کو متروک ٹھہرا دیا گیا اسی طرح ہند میں مردہ نہ سہی غیر ملکی انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے رکھنا ترک کیا جا رہا ہے اور جامعہ عثمانیہ کے کامیاب تجربے کو دیکھ کر جامعہ ملیہ اور جامعۂ اندھرا (اسلامیہ ہائی اسکول) وجود میں آئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ بے اثر نہیں رہیں۔

یورپ میں ادبی ترقی کے سلسلے میں کتابیں ملک کی مروج زبان میں لکھی جانے لگیں، دنیا بھر کے شہ کارے ترجمہ کئے جانے لگے، پھر رفتہ رفتہ طبع زاد تصنیفیں اور تحقیقات کے تذکرے شائع ہونے لگے تاریخ اپنے آپ کو یہاں بھی ٹھیک اسی طرح دہرا رہی ہے۔ ہر قسم کے سلیس و دقیق علوم و فنون ہندوستانیوں کی مادری زبان میں لکھے جا رہے ہیں، نظم و نثر میں قدیم بندشوں کو توڑ کر نئے اسلوب، بحریں اور الفاظ تک رائج ہو رہے ہیں۔ ترجمہ جب تک دنیا میں اختلاف السنہ باقی ہے ضروری رہیگا اسی لئے اگرچہ اب طبعزاد تصانیف اور ذاتی تحقیقات کے تذکرے ہندوستانی زبان میں چھپ رہے ہیں مگر ترجموں کی قدر کم ہونے کو نہیں آتی۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ سنسکرت۔ قلمی نسخوں کی قدر و قیمت بڑھ رہی ہے۔ لغات و معاجم کا روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں علوم و فنون کے چشموں پر ہندی طلباء کا بھی جمگھٹا ہو رہا ہے۔ ہر چیز میں غیر جانب دار اور آزادانہ بحثیں اور تنقیدیں ہو رہی ہیں اور مفید نتائج پیدا کر رہی ہیں اور ملک میں ہر جگہ "زادہ بسطۃ فی العلم والجسم" کا فلسفہ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے کہ علم و جسم کی مضبوطی یا کمزوری ہی وہ کلیدی راز ہے جو قوموں کو سر بلند یا سرنگوں کرتا ہے اور اسی پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے کہ وہی علمبرداری تمدن کا ذریعہ ہے۔ جامعات اور کھیل کود کے میدان نونہالان وطن کو تیار کر رہے ہیں۔ جامعاتی قومی تربیت (یونیورسٹی ٹرسٹ کور) اور کشافہ (اسکاوٹنگ) اسی میں شامل ہیں۔ العصمہ زاد خود۔ تنقید کی گرفت بھی سخت تر ہوتی جا رہی ہے اور جدت پسندوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ انہیں بھٹکنے سے روک رہی ہے۔ ہر جگہ چھوٹی بڑی ان گنت ادبی انجمنیں اور مجلے علمی کام کی انجام دہی میں منہمک ہیں۔ اور بلاشبہ اُن سے مفید نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اُردو صحافت کی

وقعت اور ماثر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اُردو کی تصنیفیں ہر زبان میں ترجمائی جا رہی ہیں جو اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ علوم و فنون کسی خاص قوم کا ورثہ نہیں۔ آواز کے متعلق (جس کے مفہوم میں فن موسیقی، علمِ عروض، علم لہجۂ اقوام سب شامل سمجھے جانے چاہئیں) جامعہ عثمانیہ کے ایک پروفیسر عظیم الشان تحقیقات کر رہے ہیں اس سے علمِ آواز میں جو انقلابات رونما ہونے کی توقع ہے اس کا تذکرہ یہاں کر دینا غصب اور غیر کا حق چھین لینا ہے۔ دماغی بندشیں اٹھ جانے سے میرے حدِ علم میں اُردو جھنڈی بولی (SICNALLING) کی متعدد قسمیں جن میں سے ایک تلغرافی کام میں لائی جا سکتی ہے اور کروشیا میں اُردو (کوفی) حروف ویسے ہی صاف لکھنا جیسے انگریزی میں، وجود میں آ چکے ہیں اور نہ معلوم اکنافِ ہند میں اور کیا کیا چیزیں ایجاد کی گئی ہیں ظاہر ہے کہ یہ سب ایک سیلاب کی تمہید ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کی عام بیداری اور ترقی کا اثر ادبیات پر بھی ہو رہا ہے اور اگلی صدی کا مورخ اس زمانے کی نظم و نثر سے بہت سے تاریخی حقائق کا انکشاف کر سکے گا۔

غرض وہ سب باتیں یہاں بھی پیش آ چکی، آ رہی، یا آنے والی ہیں جو یورپ کے متعلق ہم اوپر بیان کر چکے ہیں سچ ہے کہ تاریخ بار بار اپنے آپ کو دُہراتی ہے مگر لطف یہ ہے کہ اِس کی یکسانیت سے دل برداشتگی نہیں پیدا ہوئی ؎

پیری

ازجناب شبیر حسین صاحب جوش ملیح آبادی

(۱)

سبقِ عبرت کالے ناداں بالوں کی سپیدی سے ۔۔۔ کفن اوڑھا ہے جیسے جی نگارِ زندگانی نے

نظر کر جھرّیوں سے شیب کے سمٹے ہوئے رخ پر ۔۔۔ یہ وہ بستر ہے دم توڑا ہے جس پر نوجوانی نے

اردو شاعری

اور

جدید عروض

از جناب سراج الدین صاحب طالب

(۳)

یہ خیال کہ "انگریزی عروض کے ایسے اصول جو آزادی کی جان ہیں اور اس کی وسعت رکھتے ہیں کہ ہر زبان کے لئے کام دے سکیں لیکن اُن پر اس نئی عروض کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا جائے" اس وجہ سے مناسب حال نظر نہیں آتا کہ ہماری اُردو اور ہندی زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں انگریزی زبان کی نظم کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس زبان میں وزن شعر الفاظ کے اکسنٹڈ اور اَن اکسنٹڈ اجزا کی ترتیب پر قائم ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انگریزی کا ہر لفظ اکسنٹڈ یا اَن اکسنٹڈ اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے ان کو ہم اپنے حرف متحرک یا سبب اور لگھو یا گر کے مطابق قرار نہیں دے سکتے یہ گویا ان کے پاس لفظی تال اور سم ہیں۔ اشعار کی تقطیع یا پر ستار کے ساتھ نہ عروض عربی میں تال اور سم کو دخل ہے اور نہ عروض ہندی میں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارا یا ہندی کا عروض غیر سائنٹی فک ہے بلکہ یہ ہے کہ عربی اور ہندی میں اشعار کا وزن عروضی ان کے وزن موسیقی پر قائم نہیں ہے جب بحث صحت وزن موسیقی سے آپڑتی ہے تو الفاظ شعر کے مقابل تال اور سم کا لانا اور بتانا لازم ہوتا ہے اکثر اشعار ایسے ہوتے ہیں جن کو وزن عروضی میں سیدھے سادھے طور پر پڑھے جائیے تو وہ تال میں برابر نہیں اُترتے تاوقتیکہ بعض مواقع پر اشباع سے اور بعض جگہ تخفیف سے کام نہ لیا جائے۔ اور بعض مقامات پر جہاں اشباع کام نہیں دے سکتا ہے یا ماہر فن گانے والا اشباع کو مناسب تصور نہیں کرتا ہے تو محض تحریر یا ٹکڑای سے وزن موسیقی کی تکمیل کر دیتا ہے انگریزی میں الفاظ کے اجزا اکسنٹڈ اور اَن اکسنٹڈ ہوتے ہیں جن پر میٹر کا دارومدار ہے۔ انہیں پر موسیقی کے الاپ (PITCHES) کے بنائی قائم ہیں اس سے معلوم ہوا کہ

انگریزی شاعری کے اوزان۔ اوزان موسیقی پر قائم ہیں۔ پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُردو کے لئے ایک ایسی زبان کے اصول لیئے جائیں جو زمین وآسمان کا فرق رکھتی ہے جو اصول کہ اس انگریزی زبان کے لئے آزادی کی جان ہیں وہی ہماری اردو زبان کے مٹا دینے کے سامان ہیں۔

مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے اکسنٹڈ اور ان اکسنٹڈ سیلیبلس کی انگریزی علامتیں جو اردو شعر کی تقطیع میں حرف متحرک اور سبب خفیف یا لگھ اور گر کے لئے استعمال کی ہیں۔ وہ اس لئے مناسب حال نہیں معلوم ہوتیں کہ گو اس طرح پر بعض انگریز مصنفین نے عربی عروض کے ترجمے میں ان کو لگھ اور گر کے عوض استعمال کیا ہے لیکن در اصل یہ علامتیں ان کے لئے موضوع نہیں ہوئی ہیں اس واسطے کہ انگریزی شاعری میں لگھ اور گر پر تقطیع شعر نہیں ہوتی بلکہ الفاظ کے اکسنٹڈ اور ان اکسنٹڈ سیلیبلس پر ہوتی ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ لگھ اور گر کو ہندی پنگل سے لیا جائے اور ان کی علامتیں انگریزی پروسوڈی سے لیجائیں جب لگھ اور گر ہندی سے لیا ہی جاتا ہے تو اس کے لئے ہندی ہی کی علامتیں (لگھ = ا و گر = ی) استعمال کیجانی چاہئیں جو در اصل موضوع بھی اسی لئے ہوئی ہیں۔ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ تقطیع کے لئے علامتوں سے بہتر چیز الفاظ (ارکان) ہیں کہ ان کو دُہرا کر ہم قوت سامعہ کے ذریعے وزنِ شعر کی صحت کا احساس کرتے ہیں۔ الفاظ شعر کا تجزیہ کر کے لگھ اور گر کی علامتیں نقش کر دینے سے آنکھیں صحت وزن شعر کا اتنا جلد اطمینان نہیں کر سکتیں جتنا جلد کہ کان۔

مولوی عبد الرحمان خاں صاحب کی یہ جدت کہ "مرکب اجزا، سبب ثقیل و وتد مجموع کو چھوڑ کر ایک جز لگھ کا قایم مقام زیادہ کر دیا ہے۔ اس طرح صرف تین اجزائے اولیہ سے تمام بحور کا تجزیہ ہو جاتا ہے"۔ اس وجہ سے مستحسن نہیں متصور ہو سکتی کہ تقطیع کے وقت اجزا پھیل جائیں گے اور قاعدہ ہے کہ تخریج اصول میں تحلیل کلی اتنی تفصیلی اور بھدی ہو جاتی ہے کہ ان کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر کا لزوم یا ان کے قواعد ذہن نشین نہیں رہ سکتے۔ بہ خلاف اس کے اگر اس تحلیل کو بعض ضوابط کے تحت اُصول مخصوصہ تک محدود کریں تو تقطیع میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوگی۔ یہی ہمارے عروض میں ہوتا بھی ہے جس کو ہم نے قبل ازیں بتا بھی دیا ہے یہاں مثال کے طور پر بحر ہزج مثمن کا وزن سالم لیجیے۔

مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ اس وزن کے اشعار کی صحت کو جانچنے کے لئے جب یہ لازم قرار دیا جاتا ہے کہ اس بحر کی پہلی پانچویں نویں اور تیرھویں ماترا لگھ ہو لہذا باقی گر تو اس سے زیادہ آسانی اس میں ہوگی کہ ان سولہ ماتراؤں کو مرکب کر کے چار ہم وزن ارکان پر تقسیم کر دیں۔

اور جب چار ہم وزن ارکان حاصل ہوجائیں تو ان میں سے صرف ایک کو یاد رکھ لیں اور یہ ذہن نشین کرلیں کہ یہ بحر اس ایک رکن کو چار بار دہرانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ آسانی اس ایک رکن کے یاد رکھنے میں ہے یا یہ ازبر کرنے میں مصرع میں جملہ اتنی ماترائیں ہوں اور ان میں سے فلاں فلاں ماترا لگھو اور فلاں فلاں گر۔

صاحب گلزار عروض کا یہ خیال کہ " ارکان بحر وہ الفاظ ہوں جو کلام کے اجزائے اوّلیہ کہے جاسکیں"۔ صحیح اصول کے تحت نہیں معلوم ہوتا اگر کلام کے اجزائے اوّلیہ ہی ارکان قرار دیئے جائیں تو حکیم صاحب موصوف کے اختیار کردہ الفاظ ارکان " گل۔ صبا۔ حسینی۔ بہار" سے جملہ افاعیل رائجہ حاصل نہیں ہوسکتے چنانچہ ان الفاظ سے نہ رکن مفعولُ حاصل ہوسکتا ہے نہ مفاعیل نہ فعولان نہ مفعولاتُ۔ حالانکہ اجزائے اوّلیہ سے ہر لفظ کا تجزیہ ہوسکنا چاہیئے نہ یہ الفاظ تجزیہ کے لئے اجزائے اوّلیہ قرار دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ان میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ان کے مرکبا کو ارکان کہا جاسکے جن الفاظ سے مکمل تجزیہ ہی ممکن نہ ہو اُن سے تقطیع کا مکمل ہوسکنا سمجھ میں تو نہیں آتا اور اگر تجزیہ ہی کو تقطیع قرار دیا جائے تو اس کے متعلق جو کچھ اشکال ہے ہم نے قبل ازیں بتا دیا ہے۔ یہی حال صاحب عروض جدید کے مخترعہ اجزائے اولیہ کا ہے جو " نہ۔ رل۔ یار" پر مشتمل ہیں۔ گو ان سے ارکان سب بن سکتے ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ یہ ارکان کہلائے جاسکیں یا اُن کو اجزائے اوّلیہ قرار دیا جاسکے اب ہم اس معیار یا صلاحیت کو بیان کرتے ہیں جو ایسے الفاظ کے لئے لازم ہے۔

(۱) الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جو زبان کے روزمرہ میں شامل ہوں۔

(۲) الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جو باہمی طور پر ایک دوسرے سے مشتق یا قریبی تعلق رکھنے والے معلوم ہوں (خواہ فی الاصل مشتق ہوں یا نہ ہوں)۔

(۳) یہ ضرور نہیں ہے کہ اُن میں اجزائے اوّلیہ اس طرح گھل مل گئے ہوں کہ پہچانے نہ جائیں۔

(۴) الفاظ ایسے ہونے چاہئیں کہ ان کی ترکیب و ترتیب سے وزنِ بحر حاصل ہونے پر وہی یکسانیت قائم رہے۔ جو ہمارے اشعار میں یا ہمارے موجودہ علم عروض کے اوزان میں ہے۔

رباعی کے اس وزن کو " مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعَل" اگر حکیم صاحب کے الفاظ میں

بدل ہیں۔ گل گل گل گل صبا صبا گل چنی، یا مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کے الفاظ میں بدل ویں۔ دِل لِ لِ لِ لِ نرِل نرِل لِ نہ نرِل، یا مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کے طریقہ سے ان الفاظ میں بدل ہیں۔ دُ فع فع فع فع فَع فَع مَل فَع مَل فعَل مَل ؟ توان تحلیل اور مضحک ترکیبوں میں وہ صلاحیت نہیں جو ہمارے عروض کے گنتے ہوئے اوزان میں ہے اور جو ضوابط کہلانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے ورنک تقطیع کے حسب ذیل چار اصول قرار دیئے ہیں۔

(۱) تقطیع کے وقت کوئی رکن تین اجزا سے زیادہ کا نہیں لیا جائے گا۔

(۲) تقطیع میں رکن محض ایک یا دو اجزا کا بھی قابل قبول ہوگا۔

(۳) ایک ہی مصرع کی تقطیع میں ایک یا دو یا تین اجزا والے ارکان بے تکلف لیے جائینگے۔

(۴) ان چودہ ارکان کی روشنی میں تقطیع جن جن صورتوں میں ہوسکے وہ سب صورتیں درست ہوں گی"۔

ان میں کا پہلا اصول ہمارے اردو عروض میں بالکلیہ رائج ہے اسی اصول کی پابندی کی وجہ ہے کہ ہمارے عروض میں کوئی رکن تین سے زیادہ اجزا کا نہیں رکھا گیا۔ دوسرا اصول بھی ہمارے عروض میں مستعمل ہے لیکن ایک جزئی رکن یا ارکان سے پوری تقطیع نہیں ہوسکتی اس لئے ایسا ایک جز تقطیع میں نہیں لیا جاتا۔ ایک جزو کے رکن سے اگر تقطیع کیجائے تو اس کی شکل ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی یا تو تقطیع میں ہر رکن ایک ہی جزو کا ایک سبب خفیف یا وتد مجموع (سبب ثقیل اور وتد مفروق کو ہم شامل نہیں کرتے) جیسے فع فع فع فع فع فع فع فع، اگر یہ وزن ہو تو سہولت کے لئے ہمارے پاس ایسے دو اجزا کو ایک جگہ کر کے فعلن فعلن فعلن فعلن، کے وزن پر کہتے ہیں اور اگر وتد مجموع کی تکرار کا کوئی وزن ہو جیسے فعَل فعَل فعَل فعَل فعَل فعَل فعَل فعَل، تو اس میں سے ہر دو وتد کو ایک جگہ کر کے اس کو ہم "مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن" کے وزن پر لیتے ہیں اور اگر صورت ایسی ہو کہ ایک سبب خفیف اور ایک وتد مجموع کی علی الترتیب تکرار سے وزن پیدا ہو جیسے فع فعَل فع فعَل فع فعَل فع فعَل، تو اس کو "فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن" سے تقطیع کرتے ہیں۔ اور اگر وزن اس کے خلاف ہو یعنے پہلے وتد مجموع اور پھر سبب خفیف جیسے فعَل فع فعَل فع فعَل فع فعَل فع، تو اس کے عوض ہم "فعولن فعولن فعولن فعولن" سے اس کی تقطیع کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور جتنی شکلیں ممکن ہیں وہ سب ہمارے پاس مستعمل ہیں۔ ایک جزو سے تقطیع کرنے کو ہمارے پاس

تقطیع نہیں کہتے بلکہ تجزیہ کہتے ہیں اور تجزیہ اور تقطیع میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ خاں صاحب کا تیسرا اصول بھی ہمارے عروض میں مستعمل ہے۔ چنانچہ رباعی کا ایک وزن "مفعولن فاعلن مفاعیلن فع" لیجیے اس میں مفعولن اور مفاعیلن تین اجزائی ارکان ہیں اور فاعلن دو اجزائی اور فع ایک جزئی۔ اس طرح کا امتزاج اور دوسرے بحور اور اوزان میں بھی ہوا کرتا ہے۔ چوتھا اصول البتہ ہمارے عروض کے بالکل خلاف ہے اس اختلاف کی وجہ سے بھی کہتے ہیں کہ ہمارے عروض میں پیچیدگیاں ہیں۔ اس اصول کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے قرار دینے سے گو وزن میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن نام نہاد بحور اور بحر کی صحت وزن کی جانچ میں یکسانیت قائم نہیں رہ سکتی جس سے علم میں نقص پیدا ہو جاتا ہے مثلاً یہ وزن مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلات، لیجیے اس کی تقطیع حسب ذیل طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے۔

(۱) فعلن مفاعلاتُ فعولن مفاعلاتُ

(۲) فعلن مفاعلن فعلاتن مفاعلاتُ

(۳) فعلن مفاعلن فعلن فاعلن فعولُ

(۴) مستفعلن مفاعلتن فاعلن فعولُ

(۵) مستفعلن فعولُ مفاعیلُ فاعلاتُ

(۶) فع فاعلن مفاعلُ مفعولُ فاعلات

(۷) فع فع فعلُ فعلُ فع فع فع فعلُ فعولُ

(۸) فعلن فعلُ فعلُ فعلن فاعلن فعولُ

ان ارکان سے تقطیع کرنے میں یہ امر مسلم ہے کہ نہ وزن میں کوئی فرق آتا ہے نہ ترنم میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اور یہ اب بھی ممکن ہے کہ اس وزن کے متعلق یہ قاعدہ مقرر کر لیا جائے کہ اس وزن کی تقطیع ان طریقوں سے بھی درست متصور ہو گی۔ لیکن اس سے چونکہ قاعدے میں یکسانیت نہیں رہتی اس پر قاعدہ کا اطلاق نہیں ہو سکیگا اور اگر ان میں سے کسی ایک کو مقرر کیا جائے تو پھر اسی اعتراض کی گنجائش نکل آئیگی کہ یہ وزن اور طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے انہیں کمزوریوں کی وجہ سے ہمارے عروضیین نے اس اصول کو اختیار نہیں کیا اور اس طرح اس کمی کو رفع کر دیا کہ ایک وزن کو ایک قاعدے کے تحت منضبط کر دیا اور یہ قرار دیا کہ اس قاعدے سے تقطیع ہٹنے نہ پائے رہا تجزیہ تو وہ بالکل ایک ہی حالت پر قائم رہا کرتا ہے اس کو تقطیع سے کوئی بحث نہیں اگر اس تجزیہ کو تقطیع سے متعلق گردانا جائے تو اس میں وہی اشکال درپیش ہو گی۔ جو مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کے

طریق میں ہے تجزیہ الگ شے ہے۔ اور تقطیع الگ شے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم اپنے عروض پر اگر انصافانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارا عروض کسی اصلاح کا محتاج نہیں کی صرف اس کی ہے کہ آجکل کی سہل انگار طبایع کا لحاظ رکھ کر اور دقیق مباحث سے قطع نظر کر کے اُردو زبان میں اس علم کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں مبتدیوں کو نو آموزوں ناواقفوں کو اور اُن لوگوں کو بھی جو اس فن میں دلچسپی نہ رکھتے ہوں مشکل معلوم نہ ہو اور اسی میں زیادہ کامیابی کی توقع ہے اگر بخلاف اس کے کوئی نیا علم اختراع کیا جائے تو پہلے تو اس کی تدوین میں بیجا دقتیں ہوں گی اور پھر یہ کہ اس کی مقبولیت میں کسر رہیگی اور اس کے بعد بھی کلام موزوں اور ناموزوں کا امتیاز (جو علم عروض کی اصل غرض ہے اور اسی علم عروض سے ممکن ہے) غیر ممکن ہو جائیگا۔ واللہ الموفق۔

پردہ و پردگی

ازمولانا مرزا نظام شاہ صاحب لبیب تیموری

جاں بلب عاشق ہے اور ناز و ادا پردے میں ہے
خون بسمل فاش ہے تیغ جفا پردے میں ہے

نامرادی سے سراپا زخم دامن دار ہوں
گو ہے پھیلی ہوئی اور مدعا پردے میں ہے

گدگداتا رہتا ہے خود حسن دل میں بیٹھ کر
دل ہے عالم آشکارا دلربا پردے میں ہے

آتش پنہاں سے پیدا ہے دُخانِ مضطرب
درد اُٹھتا ہے تو کیا درد آشنا پردے میں ہے

کس میسری نے نہ ہونے دی شکستِ دل کی دھوم
اے ربابِ آرزو اتیری نوا پردے میں ہے

اب کہیں یادِ خدا آئی کہ طوفاں سر پہ ہے
بادباں ناپید ہے اور ناخدا پردے میں ہے

کفر کی نسبت بھی اعلیٰ ہے کہ یہ بھی اُن سے ہے
گمرہی ظاہر میں ہے اور ابتلا پردے میں ہے

شکوۂ بیگانگانِ آشنا صورت عبث
یاں سبھی ناآشنا ہیں آشنا پردے میں ہے

جانے والا جا چکا تم ڈھونڈتے کیا ہو لبیب
راستہ برحق ہے لیکن نقش پا پردے میں ہے

مطرب سے خطاب

از جناب مولوی سید اللہ بخش صاحب توحید بی اے (عثمانیہ)

(پ)

اپنی صدا سے حسرتِ خفتہ مری جگائے جا — نغمۂ آتشیں سے آگ دل میں مرے لگائے جا
زمزمہ ہائے ساز سے مست مجھے بنائے جا — دہر کے رنج و فکر کو دل سے مرے مٹائے جا

تازہ بتازہ مطرب شیریں نوا سنائے جا

چھیڑ دے ایک زمزمہ لے کے ستار دلربا — خون کے ساتھ ہو رواں جس کی صدائے جانفزا
جس کے ہوں سُر طرب فزا جس کی ہو تال غم ربا — دہر کے ذرہ ذرہ میں محشرِ نغمہ ہو وہ بپا

تازہ بتازہ مطرب شیریں نوا سنائے جا

قصۂ عشق چھیڑ دے پردۂ سوز و ساز میں — بھر دے اثر کی چاشنی نغمۂ دلگداز میں
لے کے ستار چھیڑ تو دستِ فسوں طراز میں — کر دے حقیقت آشکار آئینۂ مجاز میں

تازہ بتازہ مطربِ شیریں نوا سنائے جا

موجِ ہوائے نغمہ سے غنچۂ دل ہو میرا وا — مطلعِ دل سے صاف ہو کلفت و رنج کی گھٹا
دُھن نہ رہے کوئی مجھے دُھن کوئی ایسی اب سُنا — یاد رہے نہ کچھ مجھے ایسا کوئی ترانہ گا

تازہ بتازہ مطرب خیریں نوا سنائے جا

کشمکشِ حیات نے جس کو مرے مٹا دیا — صورتِ موم تھا جو دل سنگ اسے بنا دیا
شعلۂ عشق مشتعل تھا جو اس نے بجھا دیا — ولولے جوش زن جو تھے دل کے انہیں دبا دیا

تازہ بتازہ مطربِ شیریں نوا سنائے جا

پھر ہو رواں اسی طرح چشمۂ دل رکا ہوا — ویسا ہی آئے پھر اُبھر داغ جگر مٹا ہوا
پھر ہو ہرا وہ سینے کا زخم جو ہے دبا ہوا — پھر بھڑک اٹھے شعلۂ عشق جو ہے بجھا ہوا

ربط ہو روح کو مری پھر وہی سوز و ساز سے
مجھ کو جلا دے مطربا نغمۂ جاں نواز سے

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی سابق اڈیٹر اکبر الہ آباد

(۱)

آگرہ سے ۳۰-۴۰ میل اُتر جانب ایک گاؤں لکھن پور میں لالہ بدری پرشاد مہاجنی کرتے تھے اچھے خاصے دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ ڈاڑھی منڈھاتے تھے۔ مگر دوسرے تیسرے مہینے گاڑھے کا کرتا۔ گاڑھے کی دھوتی اور گاڑھے کی دوپلی ٹوپی ان کی پوشش تھی۔ مہاجنی پیشے کے لوگوں میں جو جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اپنی ڈیوڑھی میں ایک پھٹی پرانی گدی پر بیٹھے سود بڑھانے کی ترکیبیں سوچا کرتے تھے غرضکہ ان کو اس دنیا میں روپیہ پیسہ جمع کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے پرکاش نرائن کو بھی مہاجنی ہی کا کام سکھانا چاہا تھا لیکن اس نے اسے پسند نہ کیا اور اپنی کوشش اور محنت سے انٹرنس پاس کرلیا اس کے بعد بھی اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہا لیکن اس کے باپ نے اجازت نہ دی بلکہ پرکاش نرائن کو اور زیادہ پابند کرنے کے لئے اس کی شادی کردی۔ خوش قسمتی سے پرکاش نرائن کو بیوی بہت حسین سلیقہ مند اور پڑھی لکھی ملی۔ شگفتہ چہرہ۔ سرخ سرخ ہونٹ۔ صاف اور روشن آنکھیں۔ بڑی ہنس مکھ سب لوگ اسے گھر کی "لکشمی" سمجھتے۔ اس دنیا میں ہمیشہ رنج و غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس شادی کے چار پانچ مہینے کے اندر ہی پرکاش نرائن کے ماتا پتا سرگباش ہوگئے۔ پرکاش نرائن نا تجربہ کار تھا۔ باپ کی جو کچھ کمائی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگئی۔ انہوں نے حصول ملازمت کے لئے بہت کوششیں کیں۔ روزگار ملنے تک اخراجات کم کرنے کے بھی کئی ترکیبیں سوچیں لیکن سب بے سود۔ نہ آمدنی بڑھانے کی صورت پیدا ہوئی نہ اخراجات گھٹانے کی۔ عزیزو اقارب ایسے سنگدل نکلے کہ مدد کرنا تو دور رہا جو کچھ پرکاش نرائن کے گھر میں اثاثہ تھا وہ ایسا دبایا کہ کسی کو پتہ تک نہ لگنے دیا ایسے نازک وقت میں لکشمی نے عورت ذات ہو کر بڑی ہمت اور استقلال سے کام لیا لیکن مفلسی اور بیکاری اس عالم آفات میں ایسے آزار ہیں جن سے شریف آدمی کو ہر وقت پناہ مانگنی چاہیئے۔ رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آگیا جب پرکاش نرائن کے گھر میں پھوٹی کوڑی بھی خرچ کرنے کو نہ رہ گئی

(۲)

چیت کا مہینہ تھا۔ کھلیانوں میں اناج کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ساری دنیا خوشحال تھی۔ کسانوں کی چاندی تھی۔ سناروں کے مزاج نہ ملتے تھے ان کے دروازوں پر ہر وقت گاہکوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ درزی کو سر اُٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ بھاٹ اور بھکاری بھی خوش و خرم نظر آتے تھے لیکن پرکاش نرائن کے گھر میں غریبی اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔

ایک دن شام کی ڈھلتی ہوئی چھاؤں میں لکشمی آنگن میں بیٹھی ہوئی اپنی ایک پھٹی پرانی ساری میں پیوند لگا رہی تھی ٹھیک اسی وقت پرکاش نرائن گھر میں داخل ہوئے ان کے ساتھ ایک نوجوان شخص بھی تھا۔ غیر مرد کو دیکھکر لکشمی نے لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ اور جلدی سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ پرکاش نرائن برآمدے میں بیٹھ کر اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد نو وارد چلا گیا۔ تو پرکاش نرائن نے لکشمی کو پکارا۔ "اجی سنتی ہو" لکشمی نے کمرے سے نکل کر کہا "کیا حکم ہے"۔

"میں کل سویرے آگرہ جاؤں گا"

"کیوں" ؟

"کیوں ؟ ــــ لکشمی میں اس کا کیا جواب دوں۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ہمارے گھر کا کیا حال ہے اب چپ چاپ یہاں بیٹھنے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ آگرہ بڑا شہر ہے وہاں تلاش کرنے سے مجھے کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائے گی۔ اس وقت میرے ساتھ جو ایک بابو جی آئے تھے۔ یہ ہمارے گاؤں کے مکھیا کے لڑکے ہیں۔ ان کا نام بھجناتھ ہے یہ بیچارے بڑے اچھے آدمی ہیں انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آگرہ میں نوکری دلائیں گے وہاں کے رئیسوں سے ان کا ٹبا میل ہے۔

لکشمی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "جب تم آگرہ چلے جاؤ گے تو میں اس گھر میں تنہا کیسے رہوں گی۔

"اس کی تم کچھ پرواہ نہ کرو ایشور مالک ہے میری عدم موجودگی میں بابو بھجناتھ تمہاری خبر لیتے رہیں گے نوکری ملے یا نہ ملے میں ہر ہفتہ تم سے آکر مل جایا کروں گا۔ ہاں میں یہ تو تم سے بتانا بھول ہی گیا۔ کہ بابو بھجناتھ سے میں نے دس روپیہ قرض مانگے تھے انھوں نے دینے کا وعدہ کر لیا ہے وہ روپئے لینے گئے ہیں بس اب آتے ہی ہوں گے۔ شام ہو رہی ہے تم ذرا چراغ جلا دو اور ایک چارپائی آنگن میں ڈال دو۔ ہم لوگ آنگن ہی میں بیٹھیں گے"

کچھ دنوں پانی نہ ملنے سے جس طرح دھان کی پتیاں خشک ہو کر زرد پڑ جاتی ہیں مگر پانی پاتے ہی

ان میں سنہرے کارنگ لہرانے لگتا ہے اسی طرح لکشمی کی بھری جوانی پر مفلسی کا سایہ پڑ جانے سے سونا کانچ کی شکل اختیار کرتا جاتا تھا اس کا خوبصورت چہرہ جو رنج و فکر سے پیلا پڑ گیا تھا آج مدت کے بعد اپنے پتی کو خوش دیکھکر کنول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے جلدی سے چراغ جلایا اور چارپائی آنگن میں بچھادی۔ پرکاش نراین نے مسکرا کر کہا" لکشمی تمہاری ایسی محبت کی دیوی کو پاکر مجھے تکلیف میں بھی راحت ہے"۔

لکشمی کچھ جواب ہی دینے والی تھی کہ بابو بیجناتھ آگئے اور وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ پرکاش نراین نے کہا" آئیے بابو جی میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"۔

چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بابو بیجناتھ نے جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکالا اور پرکاش نراین کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

پرکاش نراین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا" بھگوان آپ کو بنائے رکھیں"۔

بابو بیجناتھ نے تھوڑی دیر بیٹھ کر کہا" اچھا اب میں جاتا ہوں کل تم آگرہ جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا میں اپنے بھائی کے نام تم کو ایک سفارشی خط دوں گا۔ میرے بھائی آگرہ میں وکالت کرتے ہیں وہ تمہاری بہت مدد کریں گے"۔

اتنا کہکر بابو بیجناتھ چلنے کو تیار ہوئے لیکن ابھی انھوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا کہ پرکاش نراین یکبارگی چلا اٹھا" سانپ! سانپ! بابو جی بچنا۔ لکشمی دوڑ۔ جلدی چراغ لا"۔ بابو بیجناتھ ٹھٹک کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ گو انھوں نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا پھر بھی وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

لکشمی ہاتھ میں چراغ لیئے ہوئے آگئی۔ گھبراہٹ میں اس وقت اس کو پردہ وردہ کا کچھ خیال نہ تھا اس کے چہرے سے گھونگٹ ہٹ گیا تھا اور جس طرح پورنماشی کا چاند بادلوں سے نکل کر تمام دنیا کو منور کر دیتا ہے اسی طرح لکشمی کا چندر مکھ گھونگھٹ کو ہٹا کر اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا رہا تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی اس کے سامنے ماند پڑ گئی خود سر گر بیتاب سیاہ ریشم جیسے نرم بالوں کی لٹیں سینے پر کالی ناگنوں کی طرح لہرانے لگیں۔ بابو بیجناتھ یہ حسن کا عالم دیکھ کر بیخود ہو گئے۔ شعلے لپکتے ہیں۔ مگر یوں نہیں بجلیاں چمکتی ہیں مگر اس طرح نہیں جس طرح لکشمی کے بے نقاب چہرے نے اپنی چمک سے بابو بیجناتھ کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ اس تمام عرصہ میں پرکاش نراین ہاتھ میں ڈنڈا لیئے ہوئے سانپ ہی کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ نہ ملا آخر کار تھک کر اس نے بیجناتھ سے کہا۔ ' بابو جی! بڑی خیریت

ہوئی آپ بچ گئے!

بیجناتھ نے کہا۔ "ہاں" لیکن ان کا دل کہہ رہا تھا کہ میں اس سانپ سے بھی زیادہ خطرناک۔ اس سے زیادہ خوبصورت ناگن کا میں شکار ہو گیا ہوں"۔

بابو بیجناتھ کو ان کے گھر پر پہنچا کر جب پرکاش نرائن واپس ہوا تو لکشمی نے اُداس ہو کر کہا۔ "یہ شگون تو اچھا نہیں ہوا ہے"۔

"کیسا شگون"

"ناگ دیوتا کا گھر میں آنا خالی از علت نہیں"۔

تم کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو یہ سب ڈھکوسلے ہیں میں ان کو نہیں مانتا۔

(۳)

صبح ہوتے ہی جب پرندے چہچہانے لگے اور ساری دنیا بیدار ہو گئی تو پرکاش نرائن بھی رام نام جپتا ہوا اٹھا۔ جلدی جلدی اشنان کیا اور کپڑے پہنے اس عرصہ میں لکشمی گھر میں جو کچھ دال دلیا موجود تھا اس کا ناشتہ بنا کر لائی۔ کھا پی کر پرکاش نرائن لکشمی سے رخصت ہوا اور بیجناتھ کے پاس پہنچا۔ بیجناتھ سے سفارشی خط لیکر پرکاش نارائن نے کہا۔ "اچھا بابوجی! اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ لیکن گھر بار سب آپ پر چھوڑے جاتا ہوں اس کا خیال رکھیئے گا"۔ بیجناتھ نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم اس سے بے فکر رہنا"۔

پرکاش نرائن کو جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو لکھن پور سے آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا اس کے جانے کے ایک گھنٹہ کے بعد بیجناتھ نے نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں سُرمہ اور بالوں میں تیل لگایا جب وہ اچھی طرح سے بن سنور چکا تو ٹہلتا ہوا پرکاش نرائن کے گھر پر پہنچا۔ اس وقت لکشمی آنگن میں بیٹھی ہوئی برتن مانج رہی تھی بیجناتھ کو دیکھ کر اس نے راکھ والے ہاتھ کی ایک چٹکی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ بیجناتھ کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "بھابی! تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو میں تو پرکاش نرائن بھیا سے چھوٹا ہوں"

لکشمی اسی طرح سر جھکائے برتن مانجتی رہی اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد بیجناتھ نے جیب سے ایک دس روپیے کا نوٹ نکالا اور لکشمی کی طرف پھینک کر کہا۔ "یہ لو دس روپیے اور جو کچھ تم کو خرچ کے لئے ضرورت ہو گی میں برابر دیتا رہوں گا۔ تم مجھے غیر نہ سمجھنا"۔ بیجناتھ کو لکشمی اپنا محسن اور سرپرست سمجھتی تھی اس نے سوچا کہ اگر اب

وہ کچھ جواب نہ دیگی تو بھیناتھ کی دلشکنی ہوگی اس نے دبی آواز سے کہا۔ "ا!جی مجھے تو خرچ کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ وہ مجھے آج دے گئے ہیں۔ جن سے میں مہینہ بھر کا خرچ بخوبی چلا سکتی ہوں۔"

بھیناتھ نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں یہ روپیے تم کو قرض نہیں دے رہا ہوں۔ پرکاش نرائن بھیا میرے دوست ہیں۔ وقت پڑنے پر مجھے حق ہے کہ بس ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ہر طرح سے مدد کروں۔"

دنیا کی آلائش سے پاک۔ بھولی بھالی لکشمی نے مجبوراً وہ نوٹ لے لیا۔ ایک مرتبہ احسان لیکر انسان کو ہمیشہ احسان مند رہنا پڑتا ہے۔ لکشمی نے یہ سوچکر کہ نوٹ واپس کرنے سے کہیں اس کا شوہر نہ خفا ہو بھیناتھ کا کہنا مان لیا۔

بھیناتھ نے کہا۔ "بھابی! پیاس لگی ہے ذرا پانی تو پلا دو۔"

لکشمی نے گلاس دھو کر پانی بھرا اور بھیناتھ کو دیا۔ بھیناتھ نے جب لکشمی کے ہاتھ سے گلاس لیا تو اس نے قصداً اس کی انگلی دبادی۔ لیکن نیک دل۔ پاک طینت لکشمی نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اس نے سوچا کہ اتفاقاً غلطی سے ایسا ہوا ہے۔

اس دن کے بعد سے بھیناتھ روزانہ کسی نہ کسی وقت لکشمی سے آکر بات چیت کرجاتا۔ لکشمی بھی اب کچھ بے تکلف ہوگئی تھی لیکن بے پردہ نہ ہوئی تھی۔ ایک دن بھیناتھ نے لکشمی سے محبت آمیز باتیں کیں۔ اس دن لکشمی شرم سے پانی پانی ہوگئی اور اس کے دل میں بھیناتھ کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی اب وہ دن کے وقت زیادہ تر کسی پڑوسی کے یہاں رہتی اور رات کو اپنے گھر میں دروازہ میں قفل لگاکر سو جاتی۔ بھیناتھ حسب معمول آتا لیکن جس طرح بند دروازے کے سامنے کوئی فقیر بھیک مانگے اور کچھ نہ پاکر واپس چلا جائے ٹھیک اسی طرح لکشمی سے ملاقات نہ ہونے پر بھیناتھ شکستہ دل ہوکر اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ رنج و غم اور ناکامی نے بھیناتھ کو پاگل بنادیا اور وہ لکشمی سے اس کا بدلہ لینے کے لیے تیار ہوگیا۔

(۴)

پرکاش نرائن کہہ گیا تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر واپس آجائے گا لیکن بیس دن گذر گئے نہ تو کوئی خط ہی آیا اور نہ اس کی کوئی خبر ہی ملی۔ بیچاری لکشمی انتظار کرتے کرتے تھک گئی اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات آتے اور وہ آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاکر کرشن بھگوان سے

اپنی پتی کے لئے پرارتھنا کرنے لگتی۔

ایک دن کا ذکر ہے صبح کا سہانا وقت تھا۔ لکشمی ایک ہاتھ پلنگ پر ٹیکے ہوئے کچھ بیٹھی اور کچھ لیٹی ہوئی پرکاش نرائن کی یاد میں مگن تھی۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بجناتھ کو موقع مل گیا اور وہ دبے پاؤں اندر آگیا۔ لیکن لکشمی نہ دیکھ سکی کیونکہ اس کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اس وقت لکشمی ایک عجیب محویت کے عالم میں تھی سر کھلا ہوا تھا کیونکہ دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی اور نیم آستین اپنا فرض ٹھیک طور سے نہیں ادا کر رہی تھی بال اپنی مقررہ حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور کوئی سزا دینے والا نہ دیکھکر انھوں نے نصف آفتاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ بجناتھ کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب بناؤ اسی کو تڑپانے کے لئے کیئے گئے ہیں۔ ہزار کوشش کرنے پر بھی اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا اس کے دل میں خیال آیا کہ آگے بڑھکر لکشمی کی بلائیں لے لے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنا قدم آگے بڑھایا لیکن اب لکشمی نے دیکھ لیا خوف اور شرم سے اس کا چہرہ غروب ہونے والے آفتاب کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ کہے سنے گھر سے باہر نکل جانا چاہا لیکن بجناتھ نے راستہ روک کر کہا۔ "ٹھہرو کہاں جاتی ہو ذرا میری ایک بات تو سن لو"۔

نہیں نہیں! میں ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے جانے دیجئے۔ میری عزت پر رحم کیجئے۔ شریف ہو کر شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ اگر کوئی آپ کو میرے گھر میں دیکھ لیگا تو بڑی بدنامی ہوگی"۔

"مجھے بدنامی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں تو تمہاری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ تم اس ٹوٹے پھوٹے مکان کو چھوڑ دو چلو میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو عالیشان مکان میں رکھوں گا۔ تمہارے خوبصورت بدن پر یہ پھٹے پرانے چیتھڑے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ میں ان سے اچھے قیمتی پوشاک بنوا دوں گا۔ بیش قیمت گہنوں سے لاد دوں گا۔ پیاری لکشمی"۔

پتی ورتا لکشمی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اپنی عزت کو خطرے میں دیکھکر چلا اٹھی "چپ! چپ! پاپی چپ رہ! تو میرے گھر سے نکل جا۔ تو مجھے لالچ کے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ سبز باغ ان بیواؤں کو دکھا جو دولت کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہیں۔ جن کا الشور دولت ہے۔ تیری مکر و فریب کی باتیں انھیں عصمت فروشوں کو اپنے قبضے میں لا سکتی ہیں۔ لیکن میری آنکھوں میں تو تو دنیا بھر سے ناپاک ہے۔ میرا یہ پھونس کا جھونپڑا میرے لئے راج محل سے بھی بڑھ کر ہے"۔

اگر کوئی بات حقیقت کا پہلو لیئے ہوتی ہے تو وہ مخاطب کے دل پر نشتر کی طرح لگتی ہے لکشمی کا ایک ایک فقرہ بیجناتھ کے دل پر چھری اور تلوار کا کام کر گیا۔ غصہ میں آکر بیجناتھ نے جیب سے ایک بڑا اشکاری چاقو نکالا اور کہا "اگر تو میرا کہنا نہ مانے گی تو میں تیرا خون کر دونگا"

لکشمی نے حقارت سے ہنسکر جواب دیا "چنڈال! میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میرے نزدیک موت ایک خواب ہے۔ ایسا پاک اور آرام وہ خواب جہاں تجھ ایسے ناپاک دنیا کے کتوں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تو نے مجھے مجبور کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہی تیری شرافت کی روشن مثال ہے سچ بتا کیا کمزور۔ بیکس اور غریب عورتوں کے ساتھ بہادر ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ بے شرم! اسے اچھی طرح سے سمجھ لے کہ ایک پاک دامن عورت جان پر کھیل جانا بہت زیادہ پسند کریگی۔ بہ نسبت اس زندگی کے جو موتی سی عصمت کو بیچ کر خریدی جائے" یہی کہتی ہوئی لکشمی نے باہر نکل جانے کی کوشش کی۔ مگر بیجناتھ نے اپنا دست ہوس بڑھایا اور لکشمی چیخ کر پیچھے ہٹی۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ جس کو بیجناتھ بند کرنا بھول گیا تھا۔ کھلا اور پرکاش نرائن بغل میں ایک گٹھری دبائے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی لکشمی چلا اٹھی "جیون ادھار! ــ ہردیشور! مجھے اس پاپی سے بچاؤ" چور کا دل ہی کتنا بڑا ہوتا ہے بیجناتھ ڈر کے مارے کانپنے لگا اور پرکاش نرائن کے قدموں پر یہ کہتا ہوا گر پڑا! "پرکاش! مجھے معاف کردو۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہوگیا میں اپنی نگاہوں میں خود ذلیل ہوں۔ لکشمی ایسی پاک دیوی کو ورغلانا چاہا۔ ہائے میں ایشور کو کیا منہ دکھلاؤں گا" یہ کہکر بیجناتھ زار زار رونے لگا۔ روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ بادل برس چکنے پر جس طرح مطلع صاف ہوجاتا ہے اور سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکنے لگتا ہے اسی طرح جی بھر کر رو لینے کے بعد بیجناتھ کے گناہ کا بہت سا حصہ دھل گیا۔

پرکاش نرائن نے صرف اتنا کہا "اچھا بابو جی! میں نے معاف کیا لیکن اب کبھی ہم لوگوں کو اپنا منہ نہ دکھائیے گا۔ میں آپ کا روپیہ کل آپ کے مکان پر بھیج دوں گا۔ مجھے نوکری مل گئی ہے میں لکشمی کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا" بیجناتھ ندامت سے سر جھکائے پرکاش نرائن کی شرافت کی دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوا جلدی سے باہر نکل گیا۔

بیجناتھ کے جانے کے بعد پرکاش نرائن نے آگے بڑھکر پتی ورتا لکشمی کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا۔ فرط محبت سے لکشمی اپنے ہردیشور کے گود میں گر پڑی اس وقت اس کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ سُرگ میں لیٹی ہوئی ہے۔ اور اس کے تلوے سُرگ کی اپسرائیں سہلا رہی ہیں۔

(از مسٹر ایس۔ بی انتشار حیدر آبادی)

انسان نے جس وقت سے کہ تہذیب و تمدن کے میدان میں قدم رکھا ہے، اسی وقت سے ایک چھوٹا سا گروہ ہر جگہ نظر آتا ہے جو ضمیر اور اس کے عمل کا منکر ہے۔ اس گروہ کے پاس اعمال کے نیک و بد ہونے کا محک اعمال کی حیثیت افادی ہے۔ بالفاظ دیگر جو اعمال کہ خوشگوار نتائج و حصول لذت کا باعث ہیں وہی اس قابل ہیں کہ جن کو نیک کہا جائے۔ جن افعال کے نتائج رنج و غم اور تکلیف کی شکل میں ظاہر ہوں وہ برائی یا بدی ہیں۔ برخلاف اس کے جو گروہ ضمیر کے وجود کو تسلیم کرتا اور اس کے عمل پر یقین رکھتا ہے اس کے نزدیک اعمال کے حسن و قبح کا معیار ضمیر کی تائید اور تصدیق ہے۔ اول الذکر کو ہماری اصطلاح میں افادیت اور آخر الذکر کو ضمیریت کہتے ہیں۔

راقم الحروف کا مقصد اس وقت ان دونوں جماعتوں کی تاریخ بیان کرنا یا ان دونوں مسالک پر کوئی تنقیدی نظر ڈالنا نہیں ہے۔ بلکہ آجکل عام طور سے ضمیر کے انکار کے لئے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں اُن پر سرسری نظر ڈالنا ہے۔

ضمیریت پر جو اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں اُن کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے

(۱) ایک وحشی کا ضمیر قتل و غارت، انسانی قربانی، اور سیاہ کاری کو کار ثواب سمجھتا ہے اور انھیں افعال کو ایک مہذب انسان کا ضمیر انتہائی ذمائم میں داخل کیوں کرتا ہے؟

(۲) اگر ضمیر موجود ہے تو ایک مسلمان، ہندو اور مسیحی کے ضمیر کے فتوے کیوں مختلف ہوتے ہیں؟

(۳) چونکہ ضمیر کی گواہی میں سخت تنوع ہے لہذا فی الحقیقت ضمیر کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔

ان اعتراضات کو بالترتیب سرسید کے الفاظ میں اُن کے مشہور مضمون کانشنس سے نقل کرتے ہیں۔

(۱) "جس بات کو ایک انسان نیک سمجھے اُسی کو تمام انسان نیک سمجھیں اور جس بات کو ایک انسان بد جانے وہ سب انسانوں کے نزدیک بد ہو۔ مگر کانشنس انسانوں کو مختلف بلکہ متضاد، بلکہ نقیض باتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور وہ دونوں سچی یا اچھی نہیں ہو سکتیں"۔

(۲) عیسائی کا مسلمان ہونے پر، ہندو، مسلمان، عیسائی کا برہمو ہونے پر، برہمو کا دہریہ ہونے پر کانشنس بالکل بدل جاتا ہے"۔

(۳) "بس فی نفسہٖ وہ (ضمیر) کوئی چیز نہیں بلکہ تربیت سے یا خیالات سے جو کیفیت اِن کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اُس کا یہ نام ہے۔

سرسید کے الفاظ نقل کرنے سے ہمیں اُن کی تردید مقصود نہیں ہے بلکہ اس خیال سے کہ کوئی بات بغیر پایہ ثبوت کو پہنچنے کے نہ رہ جائے، اس لئے ہم نے تینوں بیانات نقل کر دیے ہیں۔

ضمیر کیا ہے؟ اور اس کے مظاہر کیا ہوا کرتے ہیں؟ ضمیر انسان میں ایک فطری حس ہے جس کا دائرہ عمل صرف اس قدر ہے کہ وہ مستحسن، قبیح، نیک اور بد افعال میں امتیاز اور فرق بتلا دیتا ہے۔ جو افعال کہ مستحسن ہیں ان کے نتائج کے متعلق بغیر کسی قسم کا تصور ذہن میں کیے، ان کو عملی جامہ پہنانے کی ترغیب دے اور غیر مستحسن سے اجتناب کرنے کی تاکید کیا کرے، چونکہ لفظ ضمیر اتنی معنوی وسعت کا متحمل ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے اب اس کو جس اخلاق کہا جاتا ہے ضمیر کے مظاہر کے متعلق ایک ماہر الٰہیات کا بیان ہے کہ ضمیر اپنے آپ کو تین صورتوں میں ظاہر کرتا ہے۔

(۱) اخلاقی قانون پر گواہی دیتا ہے۔

(۲) یہ ہمارے فرائض کی میزان ہے۔

(۳) اس کے ذریعہ ہمیں ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔

ضمیر اپنے مظاہر میں ترقی بھی کرتا ہے اور انحطاط پذیر بھی ہوتا ہے اور متفرق مدارج کے ساتھ ظاہر بھی ہوتا رہتا ہے۔ خاص حالتیں، خاص قسم کی تعلیم، خاص طرح کے تعلقات، خاص نوع کے معتقدات، گرد و پیش کے حالات، ماحول کے تاثرات بھی ضمیر کو متاثر کرتے ہیں۔

یہاں پر چند امور کا ذکر کر دینا ضروری ہے جن کو نظر انداز کر دینے سے ضمیریت کے سمجھنے میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ضمیریت کو دنیا کے الہامی مذاہب، معتقدات، اور اُن کے احکام اوامر و نواہی سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص کسی مخصوص عقیدہ اور مذہب کو ہی راہِ راست اور حق قرار دیتے ہوئے، بحیثیت ضمیری تقریر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی ساری ہی تقریر اپنے اُس مخصوص عقیدے کی

ترجمانی اور تشریح و تفسیر ہوگی، جس کو وہ گمان خود، حق اور صدق سمجھے ہوئے ہے۔ ہر مذہبی (اس لفظ سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو الہامی باتوں ہی کو سچ سمجھتے ہیں) کا ضمیر کے وجود کو تسلیم کرنا ممکن ہے لیکن ضمیری سرے ہی سے تمام مخصوص معتقدات، اور محدود تعلیمات کی زنجیروں سے اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد رکھتا ہے۔ اُس کا ہر فعل اپنی ہی ضمیر کی روشنی میں صادق یا باطل ہوتا ہے۔ اس لئے ضمیریت کے معترض اور مجیب اِن دونوں کو یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

ضمیری، ضمیریت کے آغاز اور انجام کے متعلق کوئی حد قائم کرنے کی بجائے وہ یہ کہنا زیادہ قرین قیاس تصور کریگا کہ ضمیریت کا تعلق ابدیت سے ہے اس کی ابتدا سے کوئی سروکار ہے نہ اس کی انتہا کے متعلق غور کرنے کی ضرورت، تاہم قدیم سے قدیم تحریرات یا تعلیمات پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ضمیریت کا سراغ ضرور لگ جائیگا۔ ڈاکٹر سیموئل اسمائلز کہتے ہیں "ابتدائے شائستگی سے ضمیر کی ہمہ گیری تسلیم کی گئی ہے"۔ ایک یونانی مصنف سنہ ۳۰۰ق م میں نہایت ایقان کے ساتھ لکھتا ہے "خود ہمارے سینوں میں ایک دیوتا ہے یعنے ہمارا ضمیر"۔ فلنٹ جس کی عمر کا بیشتر حصہ انھیں عقدوں کے حل کرنے میں گزرا ہے۔ دعوے کے ساتھ کہتا ہے "کوئی شخص آج تک اس بات کے ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوا کہ ضمیر محض، خیالوں اور رسموں کا مجموعہ ہے"۔ ضمیریت کی اس قدر تفصیل کے بعد اب اصل اعتراضات کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

پہلا اعتراض ظاہری نظر میں یہ اعتراض نہایت اہم معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر ہم ضمیریت کی روشنی میں اس کو دیکھیں تو کوئی خاص بات نظر نہ آئے گی ضمیر کے متعلق لکھا گیا کہ اس کا دائرۂ عمل صرف اس قدر ہے کہ وہ نیک اور بد افعال میں تمیز کرے، اور نیکی کی ترغیب دے، اب اگر ایک وحشی اپنے ضمیر کی اتباع میں چند مخصوص افعال کو عین مستحسن قرار دیتا ہے، جن کو معترض بالکل غیر مستحسن سمجھتا ہے تو غور طلب امور یہ ہیں کہ معترض کون ہے اور ان افعال کو دائرۂ محاسن سے کیوں خارج کرتا ہے؟ اگر معترض بحیثیت ایک مذہبی کے پیش ہے تو اس کا اعتراض محض بے سود ہے، چونکہ اس نے اِن افعال کو صرف اس لئے ذمائم اخلاق میں شامل کیا، اور انکا اپنا مخصوص اور محدود مذہب اس کو مجبور کرتا ہے، اس کا اختلاف درحقیقت ضمیر کی گواہی نہیں ہے۔ اس کا اعتراض اُس کے مذہب کا اعتراض ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں جو اختلاف ہوگا وہ ضمیروں کا نہیں۔ بلکہ ایک مذہبی عقیدہ ایک ضمیری آواز سے ہوگا اب اس اعتراض کی گتھی خود سلجھ جاتی ہے کہ ایسی شکل میں معترض کا یہ اعتراض کہ ایک وحشی اور مہذب انسان کے ضمیروں کا

کیوں اختلاف سے محض بے بنیاد ہے لیکن معترض بغیر کسی مخصوص مشرب کو اپنے لئے مشعل ہدایت بنائے اعتراض پیش کرتا ہے تو اس اعتراض کی حیثیت صرف ایک ضمیری کے شبہ کی ہے، جو مسلک ضمیریت پر پوری طور سے حاوی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے، ایسے معترض کو ضمیر کے دائرۂ عمل کے متعلق اختلاف نہیں ہے بلکہ اُس کے مختلف مراحل اور مدارج کے متعلق ایک شک پیدا ہو گیا ہے۔ تو ایسے معترض کے لئے یہ جواب ہے کہ ضمیر بھی سائنس کے ایک محیط عالم اور ناقابل انکار قانونِ ارتقاء کی تحت اپنے منازل طے کر رہا ہے اور ہر ضمیری کا یہ یقین ہے کہ وہ لا انتہا ترقی کرتا چلا جائے گا معترض کا ضمیر چونکہ بہت ساری ارتقائی منازل طے کر چکا ہے وہ فطرت کی دوسری طاقتوں کے ساتھ کشمکش کرتے اور برسرِ پیکار ہوتے ہوئے ایک وحشی انسان کے ماحول کے مقابل کوسوں آگے نکل گیا ہے، اس سبب سے اِن دو ضمیروں میں جن میں سے ایک کو ہنوز اپنی ارتقائی سینکڑوں منازل اور مدارج طے کرنے ہیں۔ اس نام نہاد اختلاف پر سرگرداں ہونا معقولیت سے بعید ہے۔

دوسرا اعتراض غور سے دیکھا جائے تو یہ اعتراض ضمیریت پر ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ بلکہ خود مذہب پر ہوتا ہے، ایک مسلمان، ہندو اور مسیحی کی آواز اُس کی اپنی مذہبی آواز ہے۔ اِن میں سے ہر ایک اعمال کو اپنے مخصوص اور مقررہ معیاروں سے پرکھتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ لہذا اس کا فیصلہ ضمیر کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ اس کے مذہب کا فیصلہ ہے۔ معترض اِن فیصلوں کو ضمیر کے فیصلہ سے معنون کرے تو یہ اس کا تجاہلِ عارفانہ یا جہل مطلق ہے۔ اختلاف مذاہب کے اعتراض سے تو خود مذاہب کی حقانیت معرض خطرہ میں آجاتی ہے۔ لیکن ایک ضمیری ان معاملات پر غور و فکر کرنا تضیع اوقات سمجھتا ہے۔

تیسرا اعتراض ضمیریت پر اگر سب سے کمزور کوئی اعتراض ہے تو وہ یہی ہے۔ کیونکہ اگر اسی طرز استدلال سے معترض کے مسلمات کی جانچ پڑتال کی جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تسلیم نہیں ٹھہرتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ اعتراض افادیین کی طرف سے پیش ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلک افادیت کی بنیاد اعمال کی حیثیت افادی یا حصول لذت پر ہے تو پھر خود لذت اور مسرت کی تعریف اور ان کا معیار کیا ہے؟ لذت اور مسرت اضافی حیثیات میں ہمیشہ تغیر پذیر ہوا کرتے ہیں جن کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ پھر ایسی غیر مستقل شے کے متعلق باوجود کثرت اختلاف کسی قسم کی پائیداری کا حسن ظن رکھنا کونسی معقولیت ہے! اگر کوئی معترض بحیثیت ایک وکیل [illegible] یہ اعتراض پیش کرے تو اُس کے لیے بھی ایسا ہی جواب تجویز کیا جاسکتا ہے جبکہ

دنیا میں سینکڑوں مذاہب کی موجودگی اور اُن کے درمیان بُعد المشرقین کا اختلاف ہونے سے مذہب حق کا عدم لازم نہیں ہے تو اسی استدلال سے ضمیریت پر اعتراض کرنا کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ تو الزامی جوابات ہیں لیکن فی الحقیقت یہ اعتراض ضمیریت اور اس کے دائرۂ عمل کی ناواقفیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مختلف ضمیروں میں اختلاف کے سبب کی تشریح جواب نمبر (۱) میں کی گئی جس کا اعادہ خالی از منفعت نہ ہوگا۔ ضمیر بھی مثل دیگر اشیاء کے قانون ارتقا کی تحت اپنے منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ جو ضمیر ارتقائی منازل میں مماثلت رکھتے ہیں تو ان کے فیصلے بھی متفقہ ہوں گے۔ اگر ایک دوسرے سے ان منازل میں آگے پیچھے رہیں گے تو ان کے فیصلوں میں اختلاف ناگزیر ہے۔

ضمیر انسانی علمی ترقی اور ذہنی نشوونما کے تابع ہے جس طرح سے علمی اور ذہنی ترقی بڑھتی جائیگی۔ اسی طرح ضمیر کی آواز زیادہ واضح اور اُس کی تجلی زیادہ ضوفشانی کرتی جائے گی لیکن ضمیر کے فیصلوں کے اختلاف سے ضمیر کا عدم ہرگز لازم نہیں آتا۔ جس طرح کوئی کم سُنے یا کم دیکھے تو قوت سمع و بصر کا عدم ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ضمیر کی آواز اگر کہیں صاف کہیں دھیمی سنائی دے تو اس سے ضمیر کی غیر موجودگی کا فیصلہ صادر کرنا عقل سلیم کا خون کرنا ہے۔

ضمیر کا صرف اس قدر فرض ہے کہ ہمیں ادائے فرائض کی طرف توجہ دلائے۔ اور باخلاق زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے رہے اب وہ فرائض کیا ہیں؟ اور وہ اخلاق کیا ہوتا ہے؟ یہ انسانی عقل اور فہم اور حکمت و وجدان کے ذمہ ہے اور یہی ضمیریت کا مسلک ہے۔ لیکی (مصنف تاریخ اخلاق یورپ) کہتا ہے "معیار اخلاق ہمیشہ بدلتا رہا لیکن نیکی کی جانب رجحان طبعی ہمیشہ یکساں و بدستور رہیگا۔" دراصل اسی نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضمیریت کا سمجھنا ہے۔

اگر کوئی شخص جس کا ضمیر علمی، ذہنی، ترقی اور ماحول کے اثرات کے باعث وہ تمام مدارج جو وحشت اور جہالت کے لازمات میں سے ہیں طے کر چکا ہو اور وہ یہ کہے کہ میرا ضمیر چوری کرنا چاہتا یا کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے تو ایک ضمیری ایسی باتوں کو صداقت سے عاری سمجھے گا۔ آیا یہ شخص درحقیقت وہی کہہ رہا جو اس کے ضمیر کی رو سے راست ہے تو اُس کی شناخت کا بہترین معیار یہ ہوگا کہ اگر یہی سلوک اُس کے ساتھ روا رکھا جائے اور وہ ان افعال کو مستحسن قرار دے تو سمجھو کہ وہ یا تو اپنے قول میں راست ہے یا اُس کے عقلی قویٰ میں کچھ فتور آگیا ہے لیکن اگر وہ اپنے لیے یہ افعال پسند نہیں کرتا ہے تو یقیناً وہ [illegible]

ضمیر کے خلاف ہیں۔

ضمیر کی زیادہ سے زیادہ صاف آواز دیکھنا ہو تو جس طرح ایک آنکھ کی صفات دریافت کرنے کے لئے ایک اندھے اتر چھے یا ایک ایسی آنکھ کا جس میں کوئی نقص ہو، امتحان کیا جائے تو اصول کے لحاظ سے یہ طریق تحقیق بجائے خود غلط ہونے کے نہایت مضحکہ انگیز بھی ہوگا۔ آنکھ کی اصلی خصوصیت اور حقیقی حالت دریافت کرنے کے لئے ایک ایسی آنکھ کی تلاش کرنی چاہیئے جو زیادہ سے زیادہ صحیح اور سلامت ہے۔ تب کہیں صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی امید ہے ایسے ہی ضمیر کی آواز کے لئے اگر ایک ایسے شخص کی مثال لیں جو مقابلۃً اس ارتقائی منازل میں ہم سے کوسوں دور ہے تو ضمیر کی آواز ضرور مسخ شدہ سنائی دیگی۔ اس لئے ضمیر کو صحیح شکل میں دیکھنے کے لئے ہر ایک کا فرض ہے کہ ایسے ضمیر تک رسائی حاصل کیجائے۔ جو ہمارے نزدیک زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہے تب کہیں ضمیری آواز کا پتہ ہم صحیح طریق عمل سے چلا سکیں گے۔

رباعیات قتیل

(از جناب قتیل حیدر آبادی)

رباعی

تو آیا نظر جلوہ رب دیکھ لیا　　جو کچھ مجھے دیکھنا تھا سب دیکھ لیا
بن کر ہمہ عین اپنے آنکھوں سے آج　　میں نے تجھے یا شاہ عرب دیکھ لیا

۲

اے رہبر کل فداک امی و ابی　　اے ختم رسل فداک امی و ابی
پہنچایا قتیل کو خدا تک تو نے　　یا شاہ رسل فداک امی و ابی

غیر منقوطہ

اس طرح ہو مورد مراحم وعطا　　لکھ مدح رسول دو سرا مدح سرا
مسرور ہو دل اگر ہو سرگرم درود　　لو آؤ کہو اہل و لا صل علےٰ

عرب کا ایک مسخرہ شاعر

از جناب مسعود الزمان خاں صاحب ندوی

سرزمین عرب کا یہ مشہور مسخرہ اور ہجو گو شاعر "ابو دلامہ" جو بجائے اصلی نام زند کے اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہوا اور کنیت بھی کس درجہ مہمل ہے۔

مکۂ معظمہ میں آبادی کے قریب ایک پہاڑ تھا جس کے دامن میں قریش عہد جاہلیت میں اپنی لڑکیوں کو لے جاکر زندہ گاڑ آتے تھے وہ پہاڑ "ابو دلامہ" کے نام سے مشہور تھا۔ خدا جانے زند کو اس میں کیا خوبی نظر آئی کہ وہ اس نام کو اپنی کنیت بنالیا۔ اور اس قدر مشہور ہوا کہ ساری دنیا قیامت تک ابو دلامہ ہی کہہ کر یاد کرتی رہے گی۔ شاعر ہر جگہ کے آزاد و بے باک، رند مشرب، ہوا کرتے ہیں ایرانی شعرا کی رند مشربیاں اور امرد پرستی کے افسانے پرانی بات ہوچکی۔ مگر عرب کے شاعروں کی نسبت ہماری یہ رائے قائم نہ ہوئی حالانکہ رند مشربی ایرانی شعرا سے ان میں کہیں زائد تھی۔ "ابو دلامہ" کی تاریخ ہر قسم کی خرافات کا مجموعہ ہے۔ حرام کاریوں کا مرتکب۔ فرائض دین کا تارک اور علانیہ رند مشرب تھا۔ ہر وقت شراب پیتا اور بدکاریوں میں مبتلا رہتا۔ گو ان دنوں حدود شرعی جاری تھیں ہر طرف عباسی پرچم لہرا رہا تھا۔ ہر شخص ابو دلامہ کے فسق و فجور سے بخوبی واقف تھا مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی اُس سے تعرض کرے۔ اس کے کلام اور مسخرہ پن میں ایسا لطف تھا کہ ہر شخص اس سے درگذر کرتا تھا۔

اس کی سب سے پہلی نظم جس پر اُس کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا گیا تھا وہ ایک قصیدہ تھا جو دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور کی مدح میں اُس نے لکھا تھا جس میں ابو مسلم خراسانی کے قتل پر بھی نظر تھی اور اس کو سزاوار قتل ثابت کرتے ہوئے منصور جیسے بخیل و خسیس خلیفہ کی اس طرح فیاضی کی تعریف کی گئی تھی کہ جس کو سُن کر منصور کے دل میں فیاضی کا غیر معمولی جوش پیدا ہوا اور بولا۔ "مانگو کیا مانگتے ہو؟" ابو دلامہ نے دس ہزار درہم کی فرمائش کی۔ بلا تامل یہ گراں قدر رقم انعام میں دیدی گئی منصور اس کے کلام کی بہت قدر کرتا تھا مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ منصور نے جس قدر انعام و اکرام ابو دلامہ کو دیا کسی دوسرے شاعر کو نہیں دیا۔ منصور سے پہلے سفاح نے بھی بقدر ابو دلامہ کو دیا کہ شاید

دنیا کا کوئی شاعر کسی دربار سے نہ لے سکا ہوگا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ کسی نظم پر خوش ہو کر سفاح نے ابودلامہ سے کہا " اس کے صلے میں تم کیا چاہتے ہو" بولا " ایک شکاری کتا دلوا دیجیے جس سے شکار کیا جا سکے"۔ کتا دلوا دیا۔ بولا ایک گھوڑا بھی تو چاہیئے جس پر سوار ہو کر شکار کو جاؤں گا۔ گھوڑا بھی دلوا دیا گیا۔ کہا ایک غلام بھی تو ہو جس کے ہاتھ میں کتے کی ڈوری ہوگی۔ غلام بھی بارگاہِ خلافت سے عطا ہوا پھر بولا کہ ایک لونڈی بھی تو عطا ہو جو شکار کو صاف کر کے پکائے اور کھلائے۔ لونڈی بھی مل گئی پھر کہنے لگا امیرالمومنین! میں اور یہ سب حضور کے غلام ہیں۔ آخر ان کے رہنے کے لئے کوئی گھر بھی تو چاہیئے خلیفہ نے ایک گھر بھی دلوا دیا۔ پھر بولا اگر یا امیرالمومنین یہ سب کھائیں گے کیا اور بسر کیسے کریں گے؟ سفاح نے کہا یہ بھی منظور۔ جاگیر کے طور پر ہم نے تم کو ایک سو ایکڑ زمین مزروعہ اور ایک سو ایکڑ بنجر زمین دی۔ ابودلامہ نے پوچھا یا امیر" بنجر کیسی زمین ہوتی ہے"۔ خلیفہ نے کہا کہ جس میں نہ کچھ اُگتا نہ کچھ پیدا ہوتا ہے۔ بولا تو پھر یا امیرالمومنین ریگستان بنی اسد میں سے پانچ لاکھ ایکڑ زمین میں حضور کو دے ڈالتا ہوں۔ اس پر خلیفہ سفاح نے بیساختہ ہنس کر کہا۔" اچھا دو سو ایکڑ زمین مزروعہ دی جائے"۔ ایسا ہی واقعہ اس کے بعد ایک بار ابوجعفر منصور کے ساتھ پیش آیا۔ ابودلامہ نے اُس کے سامنے ایک نظم میں اپنی مفلسی و تنگدستی کچھ ایسے انداز میں بیان کی کہ جس کو سنتے ہی منصور نے حکم دیا کہ" ابودلامہ کو ۶ سو ایکڑ مزروعہ اور ۶ سو ایکڑ زمین بنجر دیدی جائے"۔ یہ سنتے ہی بولا کہ امیرالمومنین اگر ایسا ہی ہے تو نجف و حیرہ کے درمیان کی چار ہزار ایکڑ زمین میں حضور کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور ارشاد عالی ہو تو اس سے بھی زیادہ دے ڈالوں۔ منصور اس پر بے اختیار ہنسا اور کہا۔" اچھا ہمارے شاعر کو ساری زمین مزروعہ ہی دیدی جائے"۔

جب ابوالعباس سفاح کا انتقال ہو گیا اور لوگ اس کے جانشین بھائی ابوجعفر منصور کے پاس تعزیت کی غرض سے آئے تو ابودلامہ بھی پہنچا۔ اور مرحوم کی تعزیت میں ایسا پُر درد و پُر سوز مرثیہ اہل مجلس کو سنایا کہ ہر شخص رونے لگا اس مرثیہ میں ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ" اے سفاح۔ تیرے بعد ہر شخص کے آگے دستِ سوال دراز کیا اور ان میں سب سے اچھا جسے پایا وہ بخیل تھا۔ موجودہ خلیفہ منصور چونکہ بخیل مشہور تھا۔ یہ سن کر خلیفہ منصور کو غصہ آگیا اور بولا کہ اے ابودلامہ اگر پھر کبھی تیری زبان سے یہ قصیدہ سنا تو زبان کٹوا دوں گا۔ ابودلامہ نے فوراً بے ساختہ جواب دیا امیرالمومنین ابوالعباس میری قدر کرتے تھے انھیں نے ریگستان عرب سے نکال کے مجھے یہاں بلوا کر بدویت سے اس درجہ کو پہنچا دیا جس طرح کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف کے بھائیوں کو اُن کے پاس مصر میں پہنچایا تھا۔ لہٰذا

[illegible] یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ابودلامہ کو اولاً منصور سے نہیں بلکہ پہلا انعام عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح سے ملا۔

اب حضور بھی وہی فرما دیں جو جناب یوسف نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا کہ "لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم و ھو ارحم الراحمین"۔ اس برجستہ جواب نے خلیفہ منصور کے ماتھے کی شکنوں کو فوراً دور کردیا اور بولا کہ میں نے تمہارا قصور معاف کردیا۔ اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ بولا اے امیر المومنین خلیفہ مرحوم نے میرے لئے دس ہزار درہم اور پچاس ہزار تھان دینے کا حکم دیا تھا مگر ابھی یہ عطا مجھے ملنے نہیں پائی تھی کہ مرحوم مقام محمود کی جانب تشریف لے گئے۔ منصور نے کہا کوئی گواہ۔ ابودلامہ نے کہا اے بادشاہ اسلام! یہ تمام شرفا کا مجمع میرا گواہ ہے۔ گو اس کی اس جسارت پر دربار خلافت کا خزانچی ابوالیوب دل میں سخت پیچ و تاب کھانے لگا مگر کیا مجال تھی کہ ابودلامہ کی تائید سے انکار کرتا دوسرے ہی روز اس کی شرارتوں کا ہدف بننا پڑتا۔ دو شخصوں نے بڑھ کر گواہی دیدی۔ خلیفہ کے حکم کے بعد یہ رقم ابودلامہ کو مل گئی۔ مگر منصور سمجھ گیا کہ یہ کثیر دولت ابودلامہ نے اپنی چالبازی سے اڑائی ہے لہذا فوراً یہ حکم دیدیا کہ ابودلامہ مشہور باغی عبد اللہ[1] بن علی کے مقابلہ پر روانہ کیا جائے۔ ابودلامہ کا اس حکم سے دل دہل گیا۔ بولا امیر المومنین میں اس درجہ منحوس و سبز قدم واقع ہوا ہوں کہ جس جگہ یا جس کام میں میرا ہاتھ ہے نحوست غالب آجائیگی مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ امیر المومنین اپنی فرخندہ فالی اور اقبال مندی کو ایسے نازک موقع پر آزمائیں کسے خبر ہے کہ حضور کی اقبالمندی غالب آئیگی یا غلام کی سبز قدمی۔ جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں میرا تجربہ زیادہ زمانے کا ہے اور مجھے اپنی نحوست کا قوی و پختہ یقین ہے۔ منصور نے کہا فضول مت بکو۔ تمھیں جانا پڑے گا ابودلامہ نے کہا۔ اب حضور سچ ہی بلواتے ہیں تو سنیئے میں اُنیس لشکروں کے ساتھ میدان جنگ میں جا چکا ہوں۔ اُن اُنیس لشکروں کو شکست ہوئی۔ اور ان شکستوں کا باعث ہمیشہ میں ہوا۔ اب یہ سننے کے بعد امیر المومنین کو اختیار ہے کہ ان اُنیس لشکروں کے بعد بیسواں لشکر اس فوج کو بنادیں جو اس مہم پر جاتی ہے۔ یہ سنکر منصور کو ہنسی آگئی۔ دیر تک ہنسنے کے بعد کہا خیر جاؤ ہم نے تم کو معاف کیا۔

سفاح کے مرنے کے بعد ایک دن ابودلامہ منصور کے سامنے کھڑا تھا منصور کو ابودلامہ کے وہ الفاظ یاد آگئے جو روسائے سفاح کے مرثیہ میں کہے تھے دیر تک ذکر کرتا رہا۔ ابوجعفر منصور نے اہل دربار کو حکم دیا تھا کہ سیاہ کپڑے پہنیں۔ لمبی بلند ٹوپیاں سر پر رہیں۔ جن کے اندر دو تیلیاں

---

[1] عبد اللہ بن علی حضرت امام حسن علیہ السلام کی نسل سے تھے اور اُن دنوں تمام بنی فاطمہ میں سر برآوردہ تھے جنھوں نے عباسیوں کے مقابل امامت و خلافت کا دعوےٰ کیا تھا۔۱۲

دنیا کا کوئی شاعر کسی دربار سے نہ لے سکا ہوگا[1]۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ کسی نظم پر خوش ہوکر سفاح نے
ابودلامہ سے کہا "اس کے صلے میں تم کیا چاہتے ہو"۔ بولا "ایک شکاری کتا دلوا دیجئے جس سے شکار
کیا جاسکے"۔ کتا دلوادیا۔ بولا ایک گھوڑا بھی تو چاہیئے جس پر سوار ہوکر شکار کو جاؤں گا۔ گھوڑا بھی دلوادیا
گیا۔ کہا ایک غلام بھی تو ہو جس کے ہاتھ میں کتے کی ڈوری ہوگی۔ غلام بھی بارگاہ خلافت سے عطا ہوا
پھر بولا کہ ایک لونڈی بھی تو عطا ہو جو شکار کو صاف کرکے پکائے اور کھلائے۔ لونڈی بھی مل گئی۔ پھر کہنے
لگا امیر المومنین! یہ اور یہ سب حضور کے غلام ہیں۔ آخر ان کے رہنے کے لئے کوئی گھر بھی تو چاہیئے
خلیفہ نے ایک گھر بھی دلوادیا۔ پھر بولا مگر یا امیر المومنین یہ سب کھائیں گے کیا اور بسر کیسے کریں گے؟
سفاح نے کہا یہ بھی منظور۔ جاگیر کے طور پر ہم نے تم کو ایک سو ایکڑ زمین مزروعہ اور ایک سو ایکڑ
بنجر زمین دی۔ ابودلامہ نے پوچھا یا امیر "بنجر کیسی زمین ہوتی ہے"۔ خلیفہ نے کہا کہ جس میں نہ کچھ
اُگتا نہ کچھ پیدا ہوتا ہے۔ بولا تو پھر یا امیر المومنین ریگستان بنی اسد میں سے پانچ لاکھ ایکڑ زمین میں
حضور کو دے ڈالتا ہوں۔ اس پر خلیفہ سفاح نے بیساختہ ہنس کر کہا "اچھا دو سو ایکڑ زمین مزروعہ
دی جائے"۔ ایسا ہی واقعہ اس کے بعد ایک بار ابوجعفر منصور کے ساتھ پیش آیا۔ ابودلامہ نے اُس کے
سامنے ایک نظم میں اپنی مفلسی و تنگدستی کچھ ایسے انداز میں بیان کی کہ جس کو سنتے ہی منصور نے حکم
دیا کہ "ابودلامہ کو ۶ سو ایکڑ مزروعہ اور ۶ سو ایکڑ زمین بنجر دیدی جائے"۔ یہ سنتے ہی بولا کہ امیر المومنین
اگر ایسا ہی ہے تو نجف و حیرہ کے درمیان کی چار ہزار ایکڑ زمین میں حضور کی خدمت میں پیش کرتا ہوں
اور ارشاد عالی ہو تو اس سے بھی زیادہ دے ڈالوں۔ منصور اس پر بے اختیار ہنسا اور کہا "اچھا ہمارے
شاعر کو ساری زمین مزروعہ ہی دیدی جائے"۔

جب ابوالعباس سفاح کا انتقال ہوگیا اور لوگ اس کے جانشین بھائی ابوجعفر منصور کے پاس
تعزیت کی غرض سے آئے تو ابودلامہ بھی پہنچا۔ اور مرحوم کی تعزیت میں ایسا پُر درد و پُر سوز مرثیہ
اہل مجلس کو سنایا کہ ہر شخص رونے لگا اس مرثیہ میں ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ "اے سفاح۔ تیرے بعد
ہر شخص کے آگے دستِ سوال دراز کیا اور ان میں سب سے اچھا جسے پایا وہ بخیل تھا۔ موجودہ خلیفہ منصور
چونکہ بخیل مشہور تھا۔ یہ سن کر خلیفہ منصور کو غصہ آگیا اور بولا کہ اے ابودلامہ اگر پھر کبھی تری زبان
سے یہ قصیدہ سُنا تو زبان کٹوا دوں گا۔ ابودلامہ نے فوراً بے ساختہ جواب دیا امیر المومنین ابوالعباس
میری قدر کرتے تھے انھیں نے ریگستان عرب سے نکال کے مجھے یہاں بلوا کر بدویت سے اس درجہ
کو پہنچا دیا جس طرح کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف کے بھائیوں کو اُن کے پاس مصر میں پہنچایا تھا۔ لہذا

[1] بعض مورخین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ابودلامہ کو اول اول منصور سے نہیں بلکہ پہلا انعام عباسی خلیفہ العباس سفاح سے ملا۔

اب حضور بھی وہی فرمادیں جو جناب یوسف نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا کہ لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔ اس برجستہ جواب نے خلیفہ منصور کے ماتھے کی شکنوں کو فوراً دور کردیا اور بولا کہ میں نے تمہارا قصور معاف کردیا۔ اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ بولا اے امیرالمومنین خلیفہ مرحوم نے میرے لئے دس ہزار درہم اور پچاس ہزار تھان دینے کا حکم دیا تھا مگر ابھی یہ عطا مجھے ملنے نہیں پائی تھی کہ مرحوم مقام محمود کی جانب تشریف لے گئے۔ منصور نے کہا کوئی گواہ۔ ابودلامہ نے کہا اے بادشاہ اسلام! یہ تمام شرفا کا مجمع میرا گواہ ہے۔ گو اس کی اس عبارت پر دربار خلافت کا خزانچی ابوالیوب دل میں سخت پیچ وتاب کھانے لگا مگر کیا مجال تھی کہ ابودلامہ کی تائید سے انکار کرتا دوسرے ہی روز اس کی شرارتوں کا ہدف بننا پڑتا۔ دو شخصوں نے بڑھ کر گواہی دیدی۔ خلیفہ کے حکم کے بعد یہ رقم ابودلامہ کو مل گئی۔ مگر منصور سمجھ گیا کہ یہ کثیر دولت ابودلامہ نے اپنی چالبازی سے اڑائی ہے لہذا فوراً یہ حکم دیدیا کہ ابودلامہ مشہور باغی عبداللہ بن علی[1] کے مقابلہ پر روانہ کیا جائے۔ ابودلامہ کا اس حکم سے دل دہل گیا۔ بولا امیرالمومنین میں اس درجہ منحوس و سبز قدم واقع ہوا ہوں کہ جس جگہ یا جس کام میں میرا ہاتھ ہے نحوست غالب آجائیگی مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ امیرالمومنین اپنی فرخندہ فالی اور اقبال مندی کو ایسے نازک موقع پر آزمائیں کسے خبر ہے کہ حضور کی اقبالمندی غالب آئیگی یا غلام کی سبز قدمی۔ جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں میرا تجربہ زیادہ زمانے کا ہے اور مجھے اپنی نحوست کا قوی و پختہ یقین ہے۔ منصور نے کہا فضول مت بکو۔ تمھیں جانا پڑے گا ابودلامہ نے کہا۔ اب حضور سچ ہی بلواتے ہیں تو سنیے میں اُنیس لشکروں کے ساتھ میدان جنگ میں جاچکا ہوں۔ اُن اُنیس لشکروں کو شکست ہوئی۔ اور ان شکستوں کا باعث ہمیشہ میں ہوا۔ اب یہ سننے کے بعد امیرالمومنین کو اختیار ہے کہ ان اُنیس لشکروں کے بعد بیسواں لشکر اس فوج کو بنادیں جو اس مہم پر جاتی ہے۔ یہ سنکر منصور کو ہنسی آگئی۔ دیر تک ہنسنے کے بعد کہا۔ خیر جاؤ ہم نے تم کو معاف کیا۔

سفاح کے مرنے کے بعد ایک دن ابودلامہ منصور کے سامنے کھڑا تھا۔ منصور کو ابودلامہ کے وہ الفاظ یاد آگئے جو اس نے سفاح کے مرثیہ میں کہے تھے دیر تک ذکر کرتا رہا۔ ابوجعفر منصور نے اہل دربار کو حکم دیا تھا کہ سیاہ کپڑے پہنیں۔ لمبی بلند ٹوپیاں سر پر رہیں۔ جن کے اندر وہ ٹیلیاں

---

[1] عبداللہ بن علی حضرت امام حسن علیہ السلام کی نسل سے تھے اور اُن دنوں تمام بنی فاطمہ میں برگزیدہ تھے جنہوں نے عباسیوں کے مقابل امامت و خلافت کا دعویٰ کیا تھا ۱۲

لگی ہوئیں اور ان کے قبے کو قائم رکھتیں تلواروں کو پٹکوں میں آویزاں کریں۔ اور پیٹھ پہ یہ آیت لکھوائیں "فسیکفیکھم اللہ و ھو السمیع العلیم"۔ اس وضع میں ابودلامہ حاضر دربار ہوا تو صورت دیکھتے ہی پوچھا" کہو ابودلامہ کیا حال ہے"؟ جواب دیا حضور بہت بُرا حال ہے۔ دریافت کیا کیوں خیریت تو ہے۔ عرض کی حضور چہرہ گھونگھٹ میں ہے تلوار چوتڑوں پر۔ کلام اللہ پیٹھ پیچھے ہے اور کپڑے کالے ہیں۔ یہ سُن کے منصور اس وقت تو سُن کر چپ ہو رہا۔ مگر اس کے بعد تنہائی میں کہا کہ خبردار اگر یہ فقرہ کسی اور کے سامنے زبان سے نکلا ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ابودلامہ نے فی البدیہہ یہ شعر موزوں کرکے سُنائے جن کا مضمون یہ تھا "ہمیں اپنے امام سے بڑھتی کی امید تھی تو وہ ترقی یوں پوری ہوئی کہ ٹوپیاں بڑی بڑی ہوگئیں۔ یہ ٹوپیاں کاہے کو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے سروں پر سے فروش یہودیوں کے خم کپڑے ہیں لپیٹ کر اوندھا دیے گئے ہیں"۔

ایک دن ابوعطا سندھی ابودلامہ سے ملنے آیا۔ دونوں جب کھاپی کر آرام سے بیٹھے تو ابودلامہ کی چھوٹی بچی آئی۔ جس کو ابودلامہ نے اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا۔ لڑکی نے اوپر بیٹھتے ہی پیشاب کر دیا۔ ابودلامہ نے غصہ ہو کر اس کو زمین پر آتار دیا اور اس کی ہجو میں دو شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا کہ "کمبخت تو نے مجھ پر پیشاب کیا شیطان تجھ پر پیشاب کرے۔ تجھے نہ مسیح کی ماں نے جنا ہے اور نہ لقمان حکیم تیرا پرورش کرنے والا ہے"۔ ابوعطا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا تم بھی اس وزن اور قافیہ میں کہہ سکتے ہو، اس نے کہا یقیناً فوراً دو شعر حسبِ ذیل مفہوم کے پڑھ دیئے۔" ابودلامہ تم سچ کہتے ہو اُسے نہ کسی پاک بیوی نے جنا نہ کوئی شریف آدمی اس کا باپ ہے اس کو تو ایک بدکار ماں نے جنا اور بدکار باپ نے کندھے سے لگایا۔ سنتے ہی ابودلامہ نے کہا کمبخت میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو نے اس طرح میری ہجو کی۔ ابودلامہ نے اس پورے واقعہ کو خلیفہ منصور کے دربار میں بیان کیا۔ اشعار سُن کر منصور بے ساختہ ہنس پڑا۔ بولا" بتاؤ تمہاری لڑکی کا یہ عیب مٹانے میں میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟" سُنتے ہی جیب سے ایک بڑی لانبی تھیلی نکالی بولا اس کو درہم سے پُر کرا دیجئے۔ خلیفہ منصور کے حکم سے وہ تھیلی بھروا دی گئی۔

ایک وقت ابودلامہ کا گزر کسی بردہ فروش کی دکان پر ہوا بے تکلف اندر چلا گیا۔ وہاں ہر سِن و سال اور خوبصورتی و حسن و جمال میں فرد حسینوں کا مجمع نظر آیا۔ یہاں کی سیر سے فراغت کے بعد خلیفہ منصور کی حضور میں پہنچا اور منظوم آواز میں چند تازہ اشعار سنائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "اگر تو عیش بے غم ہو خوش رہنا چاہتا ہے تو بردہ فروشی اختیار کر۔ روز نئی نازنین اور جادو نگاہ مہ لقائیں ملیں جو ہر شب

نئی دلہن بن جاتی ہیں اور ہر روز نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس کے مقابل شادی اور ایک عورت کے پابند ہو جانے کی سختی سے مخالفت و مذمت کی تھی۔ منصور اس جدید فلسفہ عشق و محبت کو سُنکر بہت دیر تک ہنسا۔

یہ ہیں مختصر حالات عرب کے مشہور مسخرہ و ہجو گو شاعر کے جس کے نام پر دنیا کی تاریخ میں گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔

محبت انصاریہ

از جناب مولانا سید شاہ ابراہیم عفو

محشرستان کا جلوہ تھا اُحد کا منظر
بیٹھے بیٹھے کسی ظالم نے اڑا دی یہ خبر

ہو گئے بادشہ کون و مکاں آج شہید
کیا دنیا سے شہنشاہ دو عالم نے سفر

یہ خبر سنتے ہی سب ہو گئے بیہوش و حواس
ایک سناٹا تھا بس شہر کے اندر باہر

کوئی سر پیٹتا تھا کوئی تھا بے تاب و تواں
بُت بنا تھا کوئی اور برق سا کوئی مضطر

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ پریشاں خاطر
کسی انصاریہ نے پوچھا ہے کیسی یہ خبر؟

بولا کوئی ترے بھائی نے شہادت پائی
پھر کسی نے کہا مارا گیا تیرا شوہر

سُنکے یہ اُس نے کہا مجھ کو نہیں اس سے غرض
میرے سرکار کی لا دے کوئی تحقیق خبر

بڑھ کے انصاریہ نے دیکھا نبی کو تو کہا
تم سلامت رہو صدقے ہوں دو عالم تم پر

تم سلامت رہو امت کے بچانے والے
تم سلامت رہو اے سرورِ عالی گوہر

تم سلامت رہو اے وجہ حیات جاوید
آپ کی ذات ہے لولاک لما کا مظہر

گئی سرور مدینہ کو وہ انصاریہ
نہ ہوا قتل عزیزاں کا کوئی اُس پہ اثر

ایسی فرحت نہ ہوئی عمر بھر اس کو اے عفو
دو جہاں کی ملی دولت جو ملے پیغمبر

سخن ہائے گفتنی

ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

(۱)

مخمورِ شرابِ کامرانی ہوں میں
مسحورِ طلسمِ زندگانی ہوں میں
معلوم نہیں مگر یہ مجھکو اے رازؔ
اک واقعہ یا کوئی کہانی ہوں میں

(۲)

اک مظہرِ شانِ خوش جمالی ہوں میں
اک پرتوِ مہرِ لایزالی ہوں میں
دنیا میں کہاں ہے کوئی ہمسر میرا
بے مثل ہوں اور بے مثالی ہوں میں

(۳)

بیگانۂ شاہدِ مجازی ہوں میں
ناواقفِ شیوۂ ایازی ہوں میں
دنیا کا جمال منعکس ہو کیونکر
آئینۂ حسنِ بے نیازی ہوں میں

(۴)

تمہیدِ کتابِ زندگانی ہوں میں
تمت بالخیر دہرِ فانی ہوں میں
آغاز ہے دلپذیر، دلکش انجام
افسانۂ رازؔ کُن فکانی ہوں میں

عربی اور یورپی ارقام کی اصل ہندی ہے

مترجمہ جناب محمد مظہر اللہ صدیقی

چند روز پیشتر اخبارات میں انقرہ (انگورہ) کا ایک تار شایع ہوا تھا، جس میں لکھا تھا کہ ترکوں نے بجائے عربی ارقام (ہندسوں) کے یورپی ارقام اختیار کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اس تغیر سے بھی اس کو اس منزل تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے جس پر وہ گزشتہ چند سالوں سے گامزن ہے، یعنی ایشیا سے ترک تعلق اور یورپ سے وابستگی۔

اس خبر نے ہمیں وہ مضمون یاد دلادیا جس کو جامعہ میشیگان (امریکہ) کے پروفیسر ٹرنر صاحب نے آج سے ۱۵ سال قبل شایع کیا تھا، اور اسی کو رسالہ المقتطف نے اپنے فروری ۱۹۱۳ء کے نمبر میں نقل کیا تھا۔ فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں ان عجیب و غریب حقایق پر روشنی ڈالی ہے جس سے علم حساب میں انسان کی پرواز ذہنی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ موجودہ ارقام کی ایجاد کا سہرا اہل ہند ہی کے سر ہے۔ حیرت ہے کہ فلکیات، طبیعیات، اور کیمیا وغیرہ علوم تو رائج ہوچکے تھے کہ جن کا دارومدار ارقام پر ہے لیکن دنیا اس وقت تک ان ارقام کی حقیقت سے ناآشنا تھی۔

قدیم قوموں نے گنتی کا صحیح طریقہ دریافت کرنے میں بہت کچھ جدوجہد کی لیکن اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ مصر کے قدیم باشندے ایک سے نو تک کے لئے کھڑے خطوط لکھا کرتے تھے اس کے بعد دس کے لئے لاطینی حرف (Ω) سے ملتی جلتی شکل بناتے تھے اور جب انیس لکھنا ہوتا تو اسی ہندسہ کی بائیں جانب نو کھڑے خطوط کھینچ دیتے تھے اور جب نوّے ظاہر کرنا ہوتا تو صرف (Ω) کو نو مرتبہ لکھ دیا کرتے تھے اور سو کے لئے علامت استفہام (?) کی شکل کا حرف بنا دیتے تھے۔

قدمائے مصر کے طریقہ سے معلوم ہوچکا ہوگا کہ قدیم قوموں میں حساب کی ابتداء کیونکر ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقہ کی ابتداء ہاتھ کی انگلیوں سے ہوئی چنانچہ اس زمانے میں بھی گونگے جب کوئی عدد ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر ظاہر کرتے ہیں۔ اس خیال کی اس طرح بھی تائید ہوتی ہے کہ رومانی بھی اہل مصر کی طرح اعداد کے لئے کھڑے خطوط استعمال کرتے تھے لیکن وہ "۵" کے ہندسہ کے لئے صرف V کا استعمال کرتے تھے، اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ ہندسہ انسان کے

کھلے ہوئے پنجہ کی شکل رکھتا ہے۔

حروف تہجی کی ایجاد ہندسہ کی ایجاد سے قبل ہوئی (۲۰) لئے بعض قدیم قومیں ہندسوں کا کام حروف سے بھی لیا کرتی تھیں۔ لیکن اہل ہند کے لئے قابل ترجیح بات یہ ہے کہ انھوں نے صفر ایجاد کیا اور یہ ایک ایسا عجیب ہندسہ ہے کہ بچہ بھی اس کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں اعداد اور ان کے کسرات بآسانی لکھکر ظاہر کرسکتا ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ یونان، مصر، یا روما کے بڑے بڑے ریاض بھی ایسے ہندسہ کے استعمال سے بے خبر تھے، یہ اہل ہند ہی کا طفیل ہے کہ بڑے سے بڑے اعداد بھی نوتک ہندسوں کے ذریعہ صفر لگا کر ظاہر کئے جاسکتے ہیں۔

عربی اعداد	ہیروغلیف	مرانک	فنیقی	تدمری	سوری	ہندی
۱	I	۲.۲.۲.۱	I	I	۱	१
۲	II	۲.۲	II	II	۲	२
۳	III	۲۲.۲	III	III	۲۱	३
٤	IIII	[illegible]	\III	IIII	۲۲	४
۵	IIIII	۲.3	IIIII	>3	>	५
۶	IIIIII	[illegible]	IIIIII	15	1>	६
۷	IIIIIII	[illegible]	\IIIIII	115	۲>	७
۸	IIIIIIII	[illegible]	IIIIIIII	1115	۱>	८
۹	IIIIIIIII	[illegible]	IIIIIIIII	11115	۲۲>	९
۱۰	∩	λ.λ	→	→	7	१०
۱۱	I∩	۱λ	I→	I→	7	११
۱۹	IIIIIIIII∩	۹λ	IIIIIIIII→	11115→	۲۲→	१९
۲۰	∩∩	[illegible]	0.3.2.⇒	3	0	२०
۲۱	I∩∩	[illegible]	⇒	13	10	२१
۳۰	∩∩∩	[illegible]	→N	→3	70	३०
٤۰	∩∩∩∩	[illegible]	NN	33	00	४०
[illegible]	∩∩∩∩∩	۹	→NN	→33	700	५०

عربی اعداد	ہیروغلیفی	مرانک	فینیقی	تدمری	سودی	ہندی
۶۰	∩∩∩∩∩∩	ك	NNN	333	000	६०
۷۰	∩∩∩∩∩∩∩	3	⟶NNN	⟶333	7000	७०
۸۰	∩∩∩∩∩∩∩∩	ﻂ	NNNN	3333	0000	८०
۹۰	∩∩∩∩∩∩∩∩∩	ﻄ	⟶NNNN	⟶3333	70000	९०
۱۰۰	?	و	(۱۰۱۰۱۰۱۰)	⟶1	ح۱	१००
۲۰۰	??	و	(۲؟) ۱۰۱۱	⟶11	ح۲	२००
۳۰۰	???	و	. .	⟶111	ح۳	३००

اہلِ عرب اِن ارقام کو "ہندی ارقام" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے ان کو ہندوستان ہی سے لیا تھا لیکن اہلِ یورپ ان کو "عربی ارقام" سے تعبیر کرتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے ان کو اندلس کے عربوں سے لیا تھا۔

پہلے پہل "ہندی ارقام" کے استعمال کا ذکر سنہ ۶۶۲ء میں راہب سریانی نے کیا اور سہولت حساب و شمار کی وجہ سے اس نے ان کو بہت پسند کیا اور جب عربوں نے اہلِ ہند سے تعلقات پیدا کئے تو انھوں نے اس سے واقفیت حاصل کی اور ان ہی کے ذریعہ تمام دنیا میں اس کی اشاعت ہوئی۔ یہ تو ایک مسلّمہ امر ہے کہ پاپائے روم سالسٹر ثانی نے اندلس ہی میں تعلیم پائی تھی۔ جہاں یہ اپنی تخت نشینی سے قبل عرصۂ دراز تک عربوں میں رہ کر تحصیل علم میں مشغول رہا اور اس کے ذریعہ نویں صدی عیسوی میں یورپ میں ہندی ارقام کی اشاعت ہوئی۔ سنہ ۱۲۰۲ء میں ایک اطالوی ریاضی ویبونشی نامی نے ایک حساب کی کتاب لکھی جس میں اس نے ہندی ارقام کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کی اشاعت ہوتی رہی بالآخر ان ہندسوں نے ان تمام رومانی ارقام کی جگہ لے لی۔ جو اب سوائے گھڑیوں کی تختیوں اور انگریزی کتابوں کے دیباچوں کے صفحات کے اور کہیں نظر نہیں آتے۔

نہایت عجیب بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ یورپی ہندسے دراصل قدیم عربی ہندسے ہیں، چنانچہ مغرب اقصیٰ میں اب بھی یورپی ہندسوں کی شکل کے ہندسے مستعمل ہیں، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ عربی ہندسے جدید ہیں اور یورپی ہندسے قدیم اور یہ ان ہندسوں سے ملتے جلتے ہیں جو اندلس میں عربوں کے زمانہ میں رائج تھے، ہمارے اس بیان کی تائید ان قدیم عربی اشکال

بھی ہوتی ہے۔ جو ان ہندسوں کے متعلق لکھے گئے تھے۔

الف وحاء ثو جح بعدہ — عین وبعد العین عو تو سم

هاء وبعد الهاء شکل ظاهر — یبد و کمخطاف اذا هو یرقم

صفران ثامنها وقد ضما معا — والواو تا سعها بذلك تختم[1]

ہم ان اشعار کی رو سے ہندسے لکھیں تو یہ یورپی ہندسوں سے ملتے جلتے ہوں گے جن کی اشکال حسب ذیل ہیں۔

9 8 9 6 ۶ 5 3 2 1

٠ ٩ ٨ ٧ ٦ ٥ ٤ ٣ ٢ ١

0 9 8 7 6 5 4 3 2 1

ان اشعار میں ایسے صفروں کا ذکر آیا ہے جو آجکل یورپ میں مروج ہیں یعنی دائرہ کی شکل کے نہ کہ نقطہ کی طرح، بایں ہمہ ترک اس کوشش میں ہیں کہ وہ بجائے جدید عربی ہندسوں کے قدیم عربی ہندسوں کو اختیار کریں جن کو اب تک مغرب اقصیٰ کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔

اگر ان ارقام کی ایجاد کا فخر اہل ہند کو حاصل ہے تو دنیا بھر میں ان کی اشاعت کا سہرا عربوں کے سر ہے اور یہ ان کے بس کی بات تھی۔ اس لئے کہ ان پر وہ دن بھی گذر چکے ہیں جبکہ مشرق میں چین و ہندوستان پر ان کے علم لہراتے تھے تو مغرب میں بحر اوقیانوس کے کناروں تک ان کی حکمرانی تھی۔ اور اس لحاظ سے یہ مشرق و مغرب میں تہذیب و تمدن پھیلانے کا وسیلہ اور ذریعہ بنے۔

---

[1] (ترجمہ) آ اور ح پھر ج اس کے بعد ع اور عین کے بعد (؟) ھو لکھا جاتا ہے۔ ھا اور ھا کے بعد ہک کی شکل کا ہندسہ ہوتا ہے، آٹھ اور نو ملے ہوئے صفروں کی طرح اور نو کے لئے و کی طرح کا ہندسہ لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد عدد ختم ہو جاتے ہیں۔

بادِ دکن

شیر محمد خاں ایمان

(۶)

حضرت ایمان کی مثنویوں میں سے برق تاب، خسرو شیریں، قیس و لیلی مطالعے میں آچکی ہیں، برق تاب مناظر قدرت کے مطالعہ فطرت کا نتیجہ ہے۔ خسرو شیریں اور قیس و لیلی، بزمیات و رزمیات کی کیفیات ہیں اور یہ دار دنہیں مادر ہیں۔

اب ذرا آپ بھی سنئے جس کا اشتیاق نامہ سے آغاز ہوتا ہے، بے تاب نامہ میں ٹھیراؤ اور فراق نامہ پر خاتمہ

اشتیاق نامہ

خار کی نوک میں سے گل پھولا
دل سے غم کو جہان نے بھولا (عمر یافتنی)

اے نسیم بہار نوروزی
تجھ سے آتی ہے بوئے دل سوزی

زور آئی بسنت کی رُت اب
ایک عالم ہے محو عیش و طرب

تجھ سوا اس جہاں میں اب کوئی نہیں
کوئی ہمراز عاشقوں کا نہیں

دیکھتا ہوں جسے بقدر حال
یار سے اپنے خوش ہے لالم لال

کون تجھ بن ہے نامہ بر اپنا
یا ہوا خواہ و داد گر اپنا

پر ہے ایمان کو یہ حیرانی
مجھ سے کیوں دور ہے مرا جانی؟

جا کے اُس گلعذار سے کہیو
مونس و غم گسار سے کہیو

کس سبب آسماں ہے بر سر کیں
میں بھی یا رب جہاں میں ہوں کہ نہیں؟

اے گل نو بہار باغ وفا
دُرِ یکتائے بحر صدق و صفا

کیا ہوا گر بہار آئی ہے
بلبلوں کی پکار آئی ہے

سرو سرسبز بوستان مراد
بھولتی نہیں مجھے تمہاری یاد

کب خوش آتا ہے سبزہ باغ مجھے
دے ہے لالہ جگر پہ داغ مجھے

پھر کے آیا جہاں میں موسم گل
ہر چہچہاتے ہیں باغ میں بلبل

جب نسیم بہار چلتی ہے
تیر سی دل سے ہو نکلتی ہے

کوئلیں کوکتی ہیں چار طرف
مور پھولا ہے اب ہزار طرف

دیکھ شبنم کو صبحدم گل پر
اشک آتے ہیں آنکھ میں تل کر

روز بن بن کے ناچتے ہیں مور
اور دادروں کا جابجا ہے شور

دل میں سلتا ہے بار بار مجھے
ہر رگ گل ہے نہار خار مجھے

عندلیباں ہیں باغ باغ جدا
نکہت گل ہے مست نام خدا

دیکھ کلیوں کے لال منہ ہر سو
گھونٹتا ہوں میں لیا آپ لہو[۵]

جھنڈ پھرتے ہیں بلبلوں کے ہزار
گلشنوں میں چمن چمن ہے بہار

کب ہیں گلشن میں باغ باغ پھرا
لالہ و گل سے داغ داغ پھرا

سرو لہرا رہے کنارے جو
قمریوں کی ہے جابجا کو کو

دیکھ تالاب میں کنول ہی ہو
جی مرا ڈوب ڈوب جاتا ہے

غنچے بیٹھے ہیں عیش کو تکتے
گل بھی پھولوں سما نہیں سکتے

ربط پروانہ شمع دیکھ بہم
جی میں ہوتا ہوں پہ جل کے بھسم

ہر کہیں سبز ہیں کنول تالاب
اور بھنورے ہیں سو کنول میں غرقاب

دیکھ چاندنی کو روتا ہوں
جوں کتاں چاک چاک کرتا ہوں

رات ہے چاند سے چکور وچا
اور پروانہ شمع پر ہے نثار

مور پر جب صدائے کوئل ہو
رشتہ رشتہ و دم مرا دل ہو

ہنس موتی چگیں سرور سے
ابر نیساں کی یوں جھڑی رہے

راگ سنتا ہوں جب کہیں ہنڈول
میں محل میں ہوں دل ہے ڈانوا ڈول[۶]

لال ٹیسو سے ہوں تمام ہرے
پاؤں دھرتے خزاں کو جانے ہیں[۷]

---

۵ گھونٹ سے گھونٹنا (یعنی پینا) بنایا ہے اور اس سے گھونٹتا، یہ حضرت ایمان کا اختراع ذاتی معلوم ہوتا ہے۔

۶ ڈول اور کوئل کا قافیہ؟

۷ نقل ہے؟

گوش نہ ہوا گر بہار کی تان   دُرِ ہوش و خیال ہو غلطاں

راگ بن گرچہ قوت جان نہیں   دل مرا تو بھی شادماں نہیں

کوئلوں کی ہو ہوں جب کو کیں   دل سے اٹھتی ہیں غم بدم ہوکیں

یا الٰہی ملا شتابی تو   اس گلِ نو بہار سے مجھ کو

جس کی زلف رسا کا بند ہوں   یاد سے اس لبوں کی زندہ ہوں

جس کی ابرو ہلال عید مجھے   مت رکھ اس مہر سے بعید مجھے

اس بِن اب یہ رت سہانی ہے   کون کافر کو آہ بھاتی ہے

بن میں جب تک نہ ہو وہ سرو گل   خار اور زہر ہے مجھے گل و مُل

اب بہر کیف یہ شتابی ہو   میں ہوں ساقی ہو اور گلابی ہو

میرے بر میں وہ سیم بر سوتا   دل کو آرام کچھ تبھی ہوتا

دیکھنے گا بہار کا پھر رنگ   ہو وہ گلرو اگر بغل میں تنگ

دل مرا باغ باغ ہو جاوے   روح بھی خوش دماغ ہو جاوے

ہو ہم آغوش دل کے از ہیں   بادۂ عیش پی کے مست رہیں

سختی انتظار سے چھوٹیں   ہجر کے اس خمار سے چھوٹیں

اب کہیں جلد ہو بدل یا رب   وصل کے دن سے ہجر کی ہر شب

دوستوں کو سلام پہنچانا

خیریت کا پیام پہنچانا

بے تاب نامہ

سرو گلزار آشنائی   جانِ شیریں دل ربائی

رہیو مجلس میں تیری جوں گل   لب زیر نشاط ساغرِ مُل

تیرا ہی خیال لیکے دن رات   خوش آتی نہیں کسی کی بھی بات

آنکھوں میں پھرے ہے تیری صورت   دل میں ہے بھری تری محبت

ہر صبح یہ دھیان ہے گا   کس جا پہ وہ مہرباں ہے گا

حسرت ہی میں دن تباہ ہووے   آنکھوں میں جہاں سیاہ ہووے

جب لطف کشادہ بیں نہ ہووے   آفت ہو عذاب ہو غضب ہو

وحشت کی کہوں کہ بیقراری   آنکھوں کی کہوں کہ اشکباری

چلتے ہے وہ جبکہ بے اثر ہو   ہر نالہ جگر پہ نیشتر ہو

بھاتا ہی نہیں پلنگ مجھ کو   کھا جائے ہے جوں پلنگ مجھ کو

ہے داغ سے دل کے گرم بستر   در کا نہیں ہے نرم بستر

جوں شمع تمام شب ہے رونا   جلنا ہی یہاں کدھر ہے سونا

گا ہے جو پلک جھپک گئی ہے   تجھ پر ہی نظر اٹک گئی ہے

کیوں کر نہ عزیز ہو وہ سپنا   جس میں کہ ملے حبیب اپنا

اس وقت نصیب کیوں نہ جاگے   دلدار گلے سے جبکہ لاگے

اس آن کے وصل پر سو قرباں   اک جان تو کیا ہے بلکہ سو جاں

پھر آنکھ جو کھل گئی ہے ناگاہ   آیا نہ نظر وہ یار دلخواہ

تا صبح قرار پھر نہ آیا   وہ رشک بہار پھر نہ آیا

طوفاں کیا ہے چشمِ تر نے   دل غم سے لگا ہے آہ بھرنے

قسمت سے اگر نصیب جاگے   تب آنکھ اسی طرح سے لاگے

پھر ٹک نہ لگے پلک پلک سے   تر جیب ہو اشک کی ڈھلک سے

ہو جان پہ اس قدر تباہی   جیسے کہ چراغ صبح گاہی

تن بہہ کے ہوا ہے شل رہا   آنکھیں ہیں بھری حباب آسا

دیدار کی بس کہ تشنہ لب ہیں   مہماں یہ کوئی دم کی اب ہیں

لازم ہے خبر شتاب لینا   مرتے کو جلا ثواب لینا

جاں بخشی اگر کرو تو بہتر   بے طرح فراق میں ہوں مضطر

اک شمہ کہاں لکھاؤں دل کا   ناسور ہوا ہے گھاؤ دل کا

ہم ہیں اور یاد مہربانی   کہیو قاصد یہی زبانی

سوئے ایمان سہم لگا ہے

پیہم گرنیت لگا ... گا ہے

فراق نامہ

سراپا کرم گستر و مہرباں   الٰہی سلامت رکھے جاوداں

ـــــــ یعنی سہانی معلوم ہوتی ہے ۱۲

تمنا یہاں تک ہی دیدار کی ❊ کہ طاقت نہ تحریر و گفتار کی
سدا دن اسی طرح جاوے گزر ❊ چھپے جبکہ خورشید نکلے قمر
اگر ایک شمہ کو کیجے رقم ❊ تو پیدا کرے چشم نرگس قلم
کرے آہ کو مشتعل جوں چراغ ❊ دکھاوے ستاروں کو سینے کے داغ
مثال آئینہ کے یہاں آنکھ تک ❊ قسم ہے ملی نہیں پلک سے پلک
نظر جب کرے ہے ستاروں پہ وہ ❊ تو لوٹے سحر تک انگاروں پہ وہ
ہر اک صبح اٹھتے ہی اندوہناک ❊ کروں ہوں گریباں کا تا ناف چاک
کرے کوئی اس سے بھلا کیا بیاں ❊ نکل جاوے جوں بوئے گل تن سے جاں
چلے جب چمن میں نسیم سحر ❊ تو کہتا ہوں اس سے دم سرد بھر
غرض طرز غم میں گرفتار ہے ❊ کہ جینے سے بھی اپنے بیزار ہے
صبا عرض کیجو تو بعد از سلام ❊ کہ ایمان کا ہی یہی اب پیام
ہوس دیکھنے کی ہے ان آنکھ تک ❊ تب آنکھوں میں جی آ گیا ہو ملک
اگر باغ میں دیکھے شمشاد کو ❊ کرے یاد اُس سرو آزاد کو
شتابی خبر لے برائے خدا ❊ نہیں تو کوئی دم میں ہوگا ہوا
تصور میں تب اسکے قربان ہو ❊ گلے مل کے قمری سے نالاں ہو
زیادہ کہاں تک لکھوں ماجرا ❊ قلم پھٹ کے اب رہ گیا ہے یہاں
کبھو جا پڑے ہے جو گل پر نظر ❊ تو کہتا ہے بلبل سے ہو چشم تر
الٰہی تو یہ باغ آباد رکھ ❊ دل دوستاں کو سدا شاد رکھ
کو مت چمن کی خدا دے تجھے ❊ مرا ہر باغ وہ ہے گر مجھے
رہیں دشمناں یہاں کے اب سیاہ ❊ ہمیشہ پھریں وہ ذلیل و تباہ
سدا آپ ہی آہ دل تنگ ہے ❊ اُسے غنچہ کا دیکھنا ننگ ہے
مرا آپ سے جو کہ پوچھے پیام
چمن میں وہ ہے اس قدر اشکبار ❊ کہ رہتے ہیں معمور سب جوئبار
بعد اشتیاق اسکو کہیے سلام

(تیرہ غلطیوں سے بچو)

۱۔ عیب و ثواب کا ایک خود ساختہ معیار قائم کر کے لوگوں کو اس کے مطابق جانچنا — غلطی ہے
۲۔ اپنی مسرت سے لوگوں کی خوشی کا اندازہ کرنا .... غلطی ہے
۳۔ دوسروں سے ہم خیالی کی امید رکھنا .... غلطی ہے
۴۔ جوانی سے تجربہ کاری اور مآل اندیشی کی توقع رکھنا .... غلطی ہے
۵۔ مختلف طبیعتوں میں یکسانی پیدا کرنے کی کوشش کرنا .... غلطی ہے
۶۔ بے نتیجہ اور فضول خواہشات سے مغلوب ہونا .... غلطی ہے
۷۔ اپنے اعمال کو بے عیب و بے نقص دیکھنے کی کوشش کرنا .... غلطی ہے
۸۔ اپنے آپ کو اور دوسروں کو لاعلاج امر کی کشمکش میں ڈالنا — غلطی ہے
۹۔ ممکن امداد سے احتراز کرنا — غلطی ہے
۱۰۔ انسانی کمزوریوں کو ملحوظ رکھے بغیر دوسروں کے متعلق فیصلہ کرنا — غلطی ہے
۱۱۔ ہر اس کام کو جس پہ ہم خود قادر نہ ہوں ناممکن سمجھنا — غلطی ہے
۱۲۔ صرف انہیں باتوں کو جو ہمارے محدود دماغ میں سما سکیں قابل یقین تصور کرنا — غلطی ہے
۱۳۔ ہر بات کو سمجھنے کے قابل بننے کی خواہش کرنا .... غلطی ہے

عیشہ

باقیاتِ فانی

از جناب ابو الفہیم مولوی محمد احمد صاحب فانی مرحوم المخاطب بہ نواب احمد نواز جنگ بہادر
سابق معتمد کمیٹی صرف خاص مبارک

ہو چکا کام اے مسیحا ہو چکا! — اب ترا بیمار اچھا ہو چکا!

رنج و غم الفت میں کیا کیا ہو چکا — اور کچھ ہوگا ابھی یا ہو چکا؟

کیا کروں زاہد خدا کی بندگی — میں تو اک بندے کا بندہ ہو چکا

باندھتے ہیں ہم ابھی رخت سفر — قافلہ جا کر زمانا ہو چکا

اب کہاں وہ آنکھ اور وہ تاک جھانک — وہ گئے دن وہ زمانا ہو چکا

پھر گئی ہیں پتلیاں جلد آئیے — ورنہ آخر یہ تماشا ہو چکا

اب نہ آئیں گے کسی کے دام میں — گو ہزاروں بار ایسا ہو چکا

اُن کے آگے چھیڑ کر ذکر وصال — ایسے خوش ہیں ہم کہ گویا ہو چکا!

پھر کہاں کا ہجر کس کا انتظار؟ — جب ہم اسکے وہ ہمارا ہو چکا

تم نہیں ہرجائی اچھا ہم سہی — آؤ مل بھی جاؤ جھگڑا ہو چکا

دیکھئے آتا ہے ہم تک یا نہیں — خط وہاں سے تو روانہ ہو چکا

اب محبت سے حذر کیا فائدہ — تھا مقدر میں جو ہونا۔ ہو چکا

غیر کو اب تک نہ آیا کچھ شعور — بے حیا اتنے سے اتنا۔ ہو چکا

دیکھی بسمل کے تڑپنے کی نہ سیر — آئے جب تم یہ تماشا ہو چکا

پوچھتے ہو آج کیا فانی کی خیر
ذرہ صحرا۔ قطرہ دریا ہو چکا

تنقید و تبصرہ

گزشتہ تین ماہ میں ہمارے پاس جس قدر رسالے اور کتابیں تنقید کی غرض سے وصول ہوئی ہیں ان میں سے صرف چند رسالوں پر اس دفعہ تنقید پیش کی گئی ہے باقی آئندہ رسالہ کے لئے محفوظ ہیں

سفینہ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۹۲ مطبوعہ شاہی پریس مدراس قیمت سالانہ ہے فی پرچہ ایک روپیہ

یہ گورنمنٹ محمڈن کالج اردو سوسائٹی (مدراس) کا سہ ماہی رسالہ ہے جو کلیہ مذکور کے چار متعلمین اور ایک پروفیسر (مولانا محمد عبدالحق ایم اے) کے زیر ادارت گزشتہ مہینے ہی سے شایع ہونے لگا ہے عام طور سے کسی رسالے کے پہلے نمبر کے متعلق کوئی فیصلہ کن رائے نہیں دی جا سکتی۔ لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے زیر نظر رسالے کے پہلے نمبر سے بھی قطع نظر کرنا مشکل ہے۔

یہ رسالہ ہندوستان کے ایسے خطے سے شائع ہو رہا ہے جہاں مقامی علمی خصوصًا اردو کی فضا ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی ہے اس میں شک نہیں کہ قدیم اردو کے بیش بہا ذخیرہ میں مدراس کا حصہ دکن کے کسی دوسرے صوبہ سے کم نہیں ہے چنانچہ . . . . مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری شافعی قادری، . . . . وغیرہ نے اردوئے قدیم کے مصنفین کی مجلس میں مدراس کی نمایندگی جس پر جوش طریقہ سے کی ہے اس کو عالم اردو کبھی نہیں بھول سکتا اس کے باوجود یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ "اردو فضا" مدراس میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ بڑی مسرت زا کامیابی ہے اعلیحضرت سلطان العلوم کی علم پروری کی کہ آپ کا بویا ہوا تخم اب تناور درخت بنکر اپنے ہمسایوں پر بھی اپنی گھنی سایہ دار شاخیں پھیلا رہا ہے اور اپنے ثمرات سے ایک عالم کی خاطر کر رہا ہے۔ سفینہ کے موجودہ نمبر پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدراس خصوصًا محمڈن کالج میں اردو فضا ضرور پیدا ہو رہی ہے چنانچہ یہ رسالہ مدراس کے اگلے تمام صحافی کارناموں کے مقابلہ میں ایک امتیاز رکھتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم مدراس کا ایک مقام اپنے ماحول سے بے خبر نہیں ہے۔ توقع ہے کہ اردو سوسائٹی کے کارنامے علمی دنیا پر ثابت کر دکھائیں گے کہ ان کے اردوئے قدیم کے اسلاف میں اور ان میں اس قدر بعد نہیں ہے جتنا کہ سرسری نظر میں معلوم ہوتا ہے رسالے کا علمی پایہ خاصہ بلند اور ایک علمی ادارے کے ارگن کی شان کے منافی نہیں ہے۔ اس کا افتتاح اردو کے مشہور ادیب مولوی عبدالحق بی اے معتمد انجمن ترقی اردو (دکن) کے علم سے ہوتا ہے۔ اتفاق اسی رسالے کے لئے مولوی صاحب نے ا

عادت کے خلاف ایک دلچسپ تلقینی اور ناصحانہ مضمون بھی لکھا ہے جس کا عنوان "کالجوں کے رسالے" ہے
پروفیسر عبدالحق ایم اے کا افتتاحیہ خاص طور سے قابل مطالعہ ہے جس میں رسالے کے اجرا کے دو
اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں ایک تو کالج کے متعلمین میں صحیح اردو لکھنے کی عادت پیدا کرنا
دوسرے مفید علمی مضامین سے صوبہ کے اردو داں اصحاب کو واقف کار بنانا ہے۔ پروفیسر صاحب نے
اس مایوسی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو مدراس کے عام رسالوں کے آخر میں پیش آتی ہے لیکن
محفلیں بنتی ہیں بے شبہ اجڑنے کے لئے" کے مصداق کوئی انجمن ہو یا ادارہ، اگر مقاصد اعلیٰ
لیکر بساط ہستی پر ابھرے لیکن کسی باد مخالف کے جھونکے کی وجہ سے وہ عمر طبعی کے پہلے ہی ملا
جائے تو بھی دنیا ایسی ناانصاف نہیں ہوسکتی کہ اس کی قدر اور وقعت کے فیصلہ کے وقت اس کے
فطری حدود کی طرف سے چشم پوشی کرلے۔ ہر "تجربے" کے دو ہی پہلو ہو سکتے ہیں۔

"مجلہ مکتبہ" کے "بادہ دکن" سے متکیف ہونے والے حضرات، اس خبر سے ضرور محظوظ ہونگے
کہ "سفینہ" میں بھی "اوراق پارینہ" کا ایک مقام اردوئے قدیم کو عطا کیا گیا ہے اس دفعہ علی عادل شاہ
کے ایک معاصر شاعر مرزا کا ایک مرثیہ ان کے کچھ حالات کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔

مدراس کی مشہور اسلامی درس گاہ، مدرسۂ اعظم (گورنمنٹ محمڈن کالج) کی تاریخ "عرب اور
ہند کے تعلقات" تاریخی مضامین میں اہمیت رکھتے ہیں "کیمیا" کا مضمون پر از معلومات ہے۔
بہ حیثیت مجموعی رسالے کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور مفید مشغلہ ہوگا۔ خصوصاً ایسی حالت
میں جبکہ اردو دنیا مدراس کی علمی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ذرائع نہیں رکھتی
رسالے عام طور سے دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں ایک ماہوار اور دوسرے سہ ماہی پہلے دلچسپی
کے سرمایہ دار ہونے چاہئیں اور دوسرے علمی "سفینہ" کو نظموں کی زیادتی یا گرانقدر مضامین
کی کمی سے بیکار نہ بنانا ہی بہتر ہے۔

آخر میں ہم کارکنان مجلہ کا انکی آغاز سعی پر پرجوش استقبال کرتے ہوے اس کو
دکن کی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اس کے ایک حصہ کو دوسرے سے واقف
ہونے کا اچھا موقع میسر آجائے گا۔ دکن میں ترقی اردو کے لئے یہ ایک تازہ بشارت ہے۔

معلومات

عالمگیر ریڈیو گھڑیال | برلن میں ارتھمر کارن جو مشہور جرمن آلہ ٹیلی وژن (جو ٹیلیفون میں بولنے والے کی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے) کا موجد ہے اس نے حال ہی میں ایک زبردست گھڑیال ایجاد کی ہے جس رصدگاہ پر وہ نصب کی جائے گی وہاں سے اس کی ٹک ٹک بذریعہ ریڈیو تمام دنیا میں پہنچے گی تاکہ تمام دنیا کی گھڑیوں میں ایک ہی وقت رکھا جا سکے۔ سمجھا جاتا ہے کہ تمام دنیا کی دو گھڑیوں میں اگر فرق ہوگا بھی تو ایک سکنڈ کے ایک لاکھویں حصے سے زیادہ نہ ہوگا

شہاب ثاقب سے ایک بچی کی موت | جاپان سے حال ہی میں ایک خبر وصول ہوی ہے کہ شہاب ثاقب ایک بچی پر گرا جس سے اس کی ہلاکت واقع ہوی ٹوکیو کے قریب (شکاتو) میں ایک سہ سالہ بچی کھیل رہی تھی دفعتہً ایک چھوٹا سا کنکر آسمان سے گرا اور بچی کی گردن پاش پاش کر دیا۔ باوجود صدہا پتھروں کے جو روزانہ آسمان سے گرتے رہتے ہیں ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوتا کہ ان سے کسی انسان کی جان ضایع ہو اب تک صرف ایک مثال پائی گئی ہے جبکہ ۱۸۲۲ء میں ہندوستان میں ایک آسمانی پتھر سے ایک شخص کی موت واقع ہوی ہے۔ جاپانی بچی کی دوسری مثال ہے بچی کے لباس میں وہ چھوٹا سا پتھر گرم ملا جس کا امتحان ٹوکیو یونیورسٹی میں کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس شعلہ کو آسمان سے زمین تک آنے میں اتنی سردی پہنچی کہ وہ منجمد ہو کر سیاہ رنگ کا پتھر بن گیا۔ یہ چوتھائی انچ لمبا اور چند گرین وزنی ہے اس سے چھوٹا کوئی آسمانی پتھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

ہوائی ٹیلیفون | فرانس میں ایک ایسا آلہ ایجاد ہوا ہے جس کے ذریعہ تار کے بغیر ٹیلیفون ہوتا ہے اور بحری پیام بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ اس آلہ پر تجربہ کیا گیا۔ ایک ہوائی جہاز (۵،۳۰) میل ہوا میں اڑا اور اس اثنا میں وہ چھ مختلف اسٹیشنوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔

(م - ع)

حضرت اقدس و اعلیٰ کا ورودِ دہلی

علمائے ملت کی نذر عقیدت

ماہ اکتوبر میں خاک دہلی کو برسوں کے بعد شرف حاصل ہونیوالا ہے کہ رؤسائے ہند کے سردار اور مسلمانانِ ہند کے سرتاج اعلیحضرت سلطان العلوم میر عثمان علیخان بہادر فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ اس کو رشک آسمان بنائینگے اس موقع پر جمعیتہ علمائے ہند کے اخبار الجمعیتہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنا خاص نمبر **سلطان العلوم نمبر** کے نام سے نکالے اس پرچہ میں ملک کے بہترین انشاء پردازوں اور شاعروں کے قلم سے حیدرآباد اور اس کے عالی قدر فرماں روا کے متعلق اعلیٰ درجہ کے مضامین شایع ہوں گے۔ دولت آصفیہ کی تاریخ، سلطنت دکن کے اجتماعی حالات۔ دور عثمانی کی علمی و اقتصادی اور انتظامی ترقیات اور اعلیٰ حضرت کی تمام خصوصیات کو نمایاں کرکے دکھایا جائے گا۔

یہ نمبر حیدرآباد اور خصوصاً حضرت اقدس و اعلیٰ کے عہد کے متعلق بہترین معلومات پر مشتمل ہوگا اور یقیناً ایسی بیش قیمت معلومات کہیں یکجا نہ مل سکیں گی اس میں دکن کے اہم مقامات کی تصاویر انکے تشریحی حالات سمیت شامل ہوں گی اور پرچہ کی ضخامت ۱۰۰ صفحات سے زاید ہوگی جو حضرات اسے خریدنا چاہیں وہ یا تو مقامی ایجنٹ سے طلب کریں یا ۸/ کے ٹکٹ بھیجکر اپنے نام درج رجسٹر کرالیں مشتہرین و ایجنٹوں کو جلد سے جلد خط و کتابت کرنی چاہئے کیونکہ صرف ریاست حیدرآباد میں تین ہزار پرچے شایع کیے جائینگے

منیجر الجمعیتہ دہلی

اعلیحضرت شاہ افغانستان کا دلچسپ سفرنامہ

یہ سفرنامہ اس قدر دلچسپ اور جاذب نظر ہے کہ ختم کیے بغیر تشفی نہیں ہوتی اسمیں ہندوستان مصر عرب اٹلی فرانس جرمنی انگلستان روس اور بعض شرقی ممالک کی سیاحت کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس سفرنامہ کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گویا شاہ امان اللہ خاں کے ہمرکاب ہیں اور جو واقعات پیش آ رہے ہیں آپکی آنکھوں کے سامنے پیش آ رہے ہیں یہ سفرنامہ قیمتی معلومات کا ذخیرہ یورپ کے اندرونی حالات کا آئینہ اور ہر ملک کے تمدن و معاشرت کی تصویر ہے اسمیں ۳۰ جا بجا عکسی تصاویر بھی درج کی گئی ہیں آخر میں شاہ امان اللہ خاں اور ملکہ ثریا کے دلچسپ حالات زندگی اور برطانیہ و افغانستان کی معرکہ آرائی کے واقعات بھی لکھے گئے ہیں کتاب کی طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ دیدہ زیب ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحے قیمت عہ مختصر فہرست مضامین عزم سفر یورپ کی غرض کابل سے روانگی کا اظہار ہندوستان میں ورود مسعود۔ کراچی میں خیر مقدم اور اعلیحضرت کی پرجوش تقریر۔ بمبئی میں شاندار استقبال بمبئی میں اعلیحضرت کی دو تقریریں جمعہ کا خطبہ مسٹر گاندھی سے ملاقات۔ ہندو مسلم تعلقات پر تنقید کابلی ہندو ہندوؤں کے حالات۔ حالات مصر قاہرہ میں شاندار استقبال مصر میں اعلیحضرت کا طرز عمل۔ زبردست تقریریں مسجد محمد علی بادشاہ کا واقعہ۔ جامعہ ازہر کے علماء سے مباحثہ۔ اٹلی میں خیر مقدم۔ روما الکبریٰ کے حالات۔ فرانس میں ورود مسعود۔ پیرس کے دلفریب مناظر۔ سیاحت جرمنی۔ برلن کے واقعات۔ اسٹیشن پر ایک عجیب واقعہ۔ اعلیحضرت نے ایک فرانسیسی پر حملہ کیا۔ غازی شرق لندن میں۔ خیر مقدم کا دلکش منظر۔ قصر شاہی میں زبردست تقریر برطانوی فوج کا جائزہ۔ فضائے لندن میں پرواز۔ لندن میں مزدوروں کی طرف سے انکشاف حقیقت۔ پولینڈ اور وارسا کا سفر۔ روس میں داخلہ۔ لینن کے مزار پر پھولوں کا ہار۔ ماسکو میں انقلاب انگیز تقریر۔ ترکی میں شاندار استقبال۔ ایران کا سفر کابل پر ورود کابل کو روانگی۔ حصہ اول قسم اول مجلد عہ قسم دوم مجلد عہ حصہ دوم قسم اول مجلد عہ قسم دوم غیر مجلد عہ

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

نیرنگ کا میر نمبر غالب پرستی کے عروج نے ہندوستان کو کسی دوسرے شاعر کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا حالانکہ اردو کا بہترین شاعر اس وقت میر تقی ہے جسکی استادی اور خوش گوئی کو بر ابر اساتذہ فن تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ غالب کہتے ہیں "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" مگر کیا یہ افسوس نہیں کہ میر کے دیوان کا کوئی بہتر اور صحیح ایڈیشن اس وقت تک ہندوستان میں شائع نہ ہو سکا۔ نول کشور پریس کا احسان ہے کہ اسکی بدولت دیوان خواہ کسی حالت میں ہو دستیاب تو ہو جاتا ہے مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے ایک انتخاب شائع کیا مگر وہ بھی بلحاظ اختلاف طبائع مسلم نہیں لکھنؤ میں مجھے لسان الہند حضرت عزیز سے مل کر مسرت ہوئی کہ انکو یہ خیال ہے کہ اگر میر کے دیوان کے مختلف صحیح نسخے دستیاب ہو جائیں تو کلیات کو مکمل طور پر مرتب فرمائیں جس کا سلسلہ موصوف نے شروع بھی کر دیا ہے اس وقت اکثر نصاب تعلیم میں میر کا کلام داخل ہے میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میر نمبر نہایت اہتمام سے شائع کروں اور مختلف یونیورسٹیوں میں کوشش کی جائے کہ میر نمبر کسی نصاب میں داخل کر دیا جائے میری سعی کو کامیاب بنانا مشاہیر ارباب ادب کا کام ہے میں اپنی امکانی کوشش میں دریغ نہیں کرونگا امید ہے کہ ملک کے انشا پرداز خیر اندیشان میر خاص توجہ سے کام لیں گے اور حسب ذیل عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر مضمون فرمائی فرما کر میر نمبر کو کامیاب بنانے میں میری امداد فرمائینگے مشاہیر اہل علم کی ایک لبرل کمیٹی مضامین کا انتخاب کریگی سب سے بہتر مضمون پر ایک اشرفی پیش کی جائے گی تمام مضامین ماہ ۔۔۔ ۱۹۲۸ء تک دفتر نیرنگ میں آنے چاہئیں۔ عنوانات (۱) میر کے حالات زندگی (۲) میر کے حصہ حیات شاعری (۳) انتخاب کلام میر (۴) تبصرہ (۵) میر کا موازنہ انکے معاصرین سے (۶) میر اور سودا کے قصائد (۷) میر کی مثنویاں (۸) میر کا فارسی کلام (۹) تمام مضامین کاغذ کے ایک رخ پر خوشخط مع مفصل پتہ کے تحریر ہوں۔

میر نمبر کا خاص نمبر ۱۸۰ صفحات میں نہایت آب و تاب کے ساتھ متعدد تصاویر و مشاہیر اہل قلم کی عکسی تحریروں سے
یہ نمبر جنوری ۱۹۲۹ء کا رسالہ نیرنگ کے چھٹے سال کا پہلا نمبر ہے قیمت فی جلد ۔۔۔

محمد ... امان اللہ خاں ... نیرنگ